الاؤ
ایم الیاس
PP
PAKISTANIPOINT.COM
پاکستانی پوائنٹ
Aik Rabta Apnon Sey

الاؤ

ایم الیاس

پاکستانی ورچوئل لائبریری
www.pakistanivirtuallibrary.com

اسٹاکسٹ :-
مکتبہ القریش سرکلر روڈ
اردو بازار، لاہور۔ ۲

جملہ حقوق محفوظ ہیں

ناشر ——— محمد علی قریشی

باراوّل ——— 2002ء

مطبع ——— نیر اسد پریس لاہور

سرورق ——— ذاکر

قیمت ——— [redacted]/-

وقار حسین ایئرپورٹ کی عمارت سے نکل کر ٹیکسی لینے کیلئے بڑھا تو اس کے ذہن میں گزشتہ واقعات ایک ایک کر کے ابھرنے لگے۔ اس نے اس شخص کی طرف دھیان نہیں دیا جو اس کے عقب میں اس سے کچھ فاصلے پر تعاقب میں چلا آرہا تھا۔ وہ خواب میں بھی یہ بات سوچ نہیں سکتا تھا کہ کوئی اس کے تعاقب میں بھی ہو سکتا ہے۔ وہ بیس برس بعد وطن لوٹا تھا۔ اس نے کسی دوست کو اپنی آمد کی اطلاع نہیں دی تھی۔ اسے معلوم ہی نہیں تھا کہ اس کے دوست کہاں ہیں، کس حالت میں ہیں۔ ان میں کون زندہ ہے کون مر گیا ہے۔ بیس برس میں بہت کچھ بدل جاتا ہے۔ اس نے اپنے کسی دوست کو اس لئے بھی اطلاع نہیں دی تھی کہ اس کی آمد کی کہیں دشمن کو خبر نہ ہو جائے۔

پھر کسی نے اس کا نام لے کر پکارا تو وہ چونک پڑا اور اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ مگر اس نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ وہ پکارنے والے کو یہ تاثر دینا چاہتا تھا کہ اسے غلط فہمی ہوئی ہے۔ اس کا نام وقار حسین نہیں ہے مگر دوسرے ہی لمحے کسی نے اس کا بازو پکڑ کر اسے روکنے کی کوشش کی۔ وہ رکنے پر مجبور ہو گیا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا اس کی نظروں کے سامنے ایک بوڑھا مگر صحت مند شخص کھڑا تھا۔ اس نے عمدہ اور قیمتی لباس پہن رکھا تھا۔ اس کا چہرہ دمک رہا تھا۔ اس کے چہرے پر جو گھنی داڑھی تھی وہ بالکل سفید تھی۔ اس میں ایک بھی کالا بال نہیں تھا۔ یہی حال اس کے سر کے بالوں کا تھا۔ وہ باوجود کوشش کے اس شخص کو پہچان نہیں سکا تھا۔

''آپ نے مجھے نہیں پہچانا مسٹر وقار حسین!'' اس شخص نے اپنا ہاتھ مصافحہ کیلئے بڑھایا۔ ''میرا نام جلیل احمد ہے۔ ماسٹر جلیل احمد انجمن سکول کا ماسٹر جس کی آپ نے بڑی مدد کی تھی۔ اب یاد آیا آپ کو؟''

ماضی اس کی نظروں کے سامنے گھومنے لگا۔ اس نے سکون و اطمینان کا ایک گہرا

Pakistanipoint Waqar Azeem

سانس لیا۔ ''ہاں پہچان لیا ماسٹر صاحب!'' پھر وہ ان سے بڑی محبت اور گرمجوشی سے بغل گیر ہو گیا۔ ''لیکن آپ نے مجھے کیسے پہچان لیا؟''

''کوئی اپنے محسن کو کیسے بھول سکتا ہے۔'' مسٹر جلیل احمد نے الگ ہوتے ہوئے کہا۔

''آپ یہاں کیسے؟ کیا کہیں جا رہے ہیں؟'' وقار حسین نے ان کے پیچھے کھڑے پورٹر کو دیکھا جو ان کا سامان اٹھائے کھڑا تھا۔

''میں آج رات کی فلائٹ سے امریکہ جا رہا ہوں۔'' انہوں نے جواب دیا۔ ''میں کوئی چودہ برس سے وہاں ہوں۔ وہاں مستقل رہائش اختیار کر لی ہے۔ بیوی بچے بھی ساتھ ہیں۔ بہت خوش ہیں۔''

''مگر آپ امریکہ کس لئے گئے؟'' آپ تو ملک کی تعمیر و ترقی میں اہم کردار ادا کرنا چاہتے تھے۔''

''یہ ایک لمبی کہانی ہے وقار حسین!'' ان کے چہرے پر اذیت ناک کرب چھا گیا۔ ان کی آنکھوں کے کنارے ایک دم سے بھیگ گئے۔ ''جس ملک میں استاد کی عزت نہ ہو وہاں رہ کر کیا کیا جا سکتا ہے۔ استادوں پر جب اسلحہ اٹھایا جائے۔ جب پولیس ان کے جائز مطالبات پر لاٹھی برسائے' ان سے مجرموں جیسا سلوک کیا جائے۔ ایک استاد کے مقابلے میں سمگلروں کی عزت کی جائے تو یہاں رہ کر کیا کرے۔''

''خدا آپ کو جہاں بھی رکھے خوش اور عزت سے رکھے۔'' وقار حسین نے دعائیہ انداز میں کہا۔ ''مجھے آپ سے مل کر جتنی خوشی ہوئی میں بیان نہیں کر سکتا۔''

''آپ یہاں کس لئے آئے؟'' ماسٹر جلیل نے اس کے قریب آ کر سرگوشی کی۔ ''آج بھی آپ کی جان کو اتنا ہی خطرہ ہے جتنا کل تھا۔''

''کاش! میں موت کے خوف سے بھاگا نہ ہوتا۔'' وقار حسین نے جواب دیا۔ ''مجھے زندگی کی نہیں انسانیت کی بھلائی کی فکر ہے۔ بس آپ میری کامیابی کیلئے دعا کیجئے۔ اب آپ پھر کب آئیں گے؟''

اب کبھی نہیں آؤں گا۔'' ماسٹر جلیل نے ایک سرد آہ بھری۔ ''میں اپنے والد کی تجہیز و تکفین کیلئے آیا تھا۔ میں نے بہت چاہا اور کوشش کی وہ امریکہ آ جائیں۔ وہ نہیں آئے کیونکہ وہ اپنے وطن کی مٹی میں دفن ہونا چاہتے تھے۔''

''سر!'' ان کے پورٹر نے مداخلت کی۔ ''جلدی کیجئے آپ کی فلائٹ کا وقت ہو رہا

ہے۔''

''اللہ حافظ۔'' ماسٹر جلیل نے اس سے مصافحہ کیا۔ ''ویسے مجھے زندگی بھر اس بات کا افسوس رہے گا کہ میں کبھی آپ کے احسان کا بدلہ اتار نہیں سکا۔ یہ میری کتنی بڑی بدنصیبی ہے۔''

☆......☆......☆

وہ ہوٹل کے کمرے میں پہنچ کر ایک لمحے کیلئے بھی سکون سے بیٹھ نہ سکا۔ ماسٹر جلیل نے بھی اشارہ دیا تھا کہ آج بھی اس کی جان کو خطرہ ہے۔ اگر تھوڑی دیر اور گفتگو کی مہلت مل جاتی تو وہ ان سے اپنے دشمن کے بارے میں بہت کچھ معلوم کر لیتا۔ اس کے علاوہ اسے اور بھی بہت ساری باتیں کرنا تھیں۔ اب وہ پھر اپنی نظروں کے سامنے اندھیرا سا محسوس کر رہا تھا۔

کیا بیس برس کا عرصہ گزر جانے کے بعد بھی دشمن اس کے انتظار میں ہے۔ کیا اس کے دشمن کو اس بات کا خطرہ ہے کہ وہ کسی بھی دن آ سکتا ہے؟ کیا اسے واپس چلا جانا چاہیے؟ وہ تو اس لئے آیا تھا کہ دشمن اسے بھول چکا ہو گا۔ ''حوصلہ رکھو میرے دوست!'' اس کے دل کے نہاں خانے سے ایک آواز نے سرگوشی کی۔ ''یہ ٹھیک ہے کہ تمہارے دشمن جرائم پیشہ ہیں، خون آشام سفاک درندے جن کے نزدیک انسان کی زندگی پانی سے بھی ارزاں ہے۔ انہیں تمہاری تلاش اور انتظار اس لئے ہے کہ تم سے ڈائری حاصل کر سکیں۔ اس کے ساتھ کچھ اہم دستاویزات بھی ہیں، جن کی مدد سے تم اپنے دشمنوں کو پھانسی کے پھندے تک پہنچا سکتے ہو۔ وہ شاید تمہیں اس وقت تک اپنے راستے سے نہیں ہٹائیں گے جب تک ڈائری ہاتھ نہیں لگ جاتی۔ وہ شاید غیر محسوس انداز سے تمہارا تعاقب جاری رکھیں گے۔ جب انہیں مطلوبہ ڈائری اور کاغذات مل جائیں گے پھر تم ایک لمحے کیلئے زندہ نہیں رہو گے۔ اب یہ تم پر منحصر ہے کہ تم کیسے اور کب تک ان کی نگاہوں سے محفوظ رہ سکتے ہو۔''

پھر اسے رقیہ خانم یاد آئی۔ رقیہ خانم جانتی ہے کہ ڈائری کس کے پاس ہے۔ رقیہ خانم کو وہ کہاں اور کیسے تلاش کرے؟ بیس برس پہلے ہی وہ اچانک کہیں لاپتا ہو گئی تھی۔ اس نے چھ ماہ تک ملک کا چپہ چپہ چھان مارا تھا۔ شاید اسے قتل کر کے اس کی لاش کسی ندی نالے میں پھینک دی گئی ہو یا پھر کسی گڑھے میں دفن کر دی گئی ہو گی۔ کیونکہ اس نے ان بے رحم قاتلوں کو ڈائری نہیں دی ہو گی۔ اسی پاداش میں اسے عبرتناک سزا دی گئی ہو گی۔

نتاشا کی یاد آئی تو اس کا دل دھڑکنے لگا۔ نتاشا جو کبھی اس کی محبت تھی۔ حالات نے اسے اس کے دوست کی بیوی بنا دیا تھا۔ وہ نتاشا کو آج بھی نہیں بھولا تھا۔ رقیہ خانم نتاشا کی بچپن کی سہیلی تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے پر جان چھڑکتی تھیں۔ آج رقیہ خانم کے بارے میں اگر کوئی ہستی کچھ بتا سکتی تھی تو وہ نتاشا تھی۔ کیا نتاشا اسے رقیہ خانم کے بارے میں اطلاعات فراہم کر سکے گی۔ کیوں نہ اس سے ابھی چل کر رقیہ خانم کے بارے میں معلوم کیا جائے۔ پتا نہیں وقت کل مہلت دے یا نہ دے۔ وہ یوں بھی ہوٹل میں بیٹھ کر کیا کرے گا؟ رات کے دس ہی تو بج رہے ہیں۔

اس نے ہوٹل سے باہر آ کر ایک ٹیکسی کی۔ رینکن سٹریٹ اس نے کہا۔ ڈرائیور نے گاڑی کی رفتار تیز کر دی۔ وہ کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھنے لگا۔ بلند و بالا اور عظیم الشان عمارتوں نے شہر کی خوبصورتی میں اضافہ کر دیا تھا۔ ان بیس برسوں میں اس کے دیش نے جہاں بہت کچھ کھویا وہاں بہت کچھ پایا بھی تھا۔ اب اس دیش میں صرف دو طبقے رہ گئے تھے۔ ایک نچلا اور دوسرا اعلیٰ' درمیانہ طبقہ رہا نہیں تھا۔ اگر تھا بھی تو وہ آٹے میں نمک کے برابر۔ غربت و افلاس نے اس کے ملک کو کسی ناگ کی طرح اپنے شکنجے میں لپیٹ رکھا تھا۔

اس نے ٹیکسی گلی کے نکڑ پر رکوا لی۔ اسے کرایہ دے کر رخصت کیا۔ بیس برس گزرنے کے باوجود پرانے شہر کی حالت نہیں بدلی تھی۔ ٹیکسی نظروں سے اوجھل ہونے کے بعد اس نے چاروں طرف کا جائزہ لیا۔ کہیں اس کے دشمن کا کوئی آدمی تعاقب تو نہیں کر رہا۔ اس نے مطمئن ہونے کے بعد دونوں طرف پھیلی ہوئی ویران گلی کو دیکھا پھر وہ ایک ایک مکان دیکھتا ہوا بڑھنے لگا۔

چند قدم پیدل چلنے کے بعد وہ ایک پرانے بنگلے کے سامنے رک گیا۔ اس کی کوئی چیز نہیں بدلی تھی۔ اس بنگلے کا صرف ایک پھاٹک تھا' دوسرا غائب تھا۔ برآمدے میں ایک زرد رنگ کا بلب جل رہا تھا۔ دو کمروں کی کھڑکیوں کے پردوں پر روشنی پڑ رہی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ گھر کے مکین جاگ رہے تھے۔ وہ برآمدے کی طرف بڑھا تو اس کا دل اسی طرح دھڑکنے لگا جس طرح پہلی بار نتاشا کو دیکھ کر دھڑکا تھا۔ اب وہ عمر کے اس حصے میں تھا کہ کسی عورت کو دیکھ کر دل نہیں دھڑکتا تھا۔ مگر آج جیسے وہ جوانی کے ابتدائی دور میں پہنچ گیا تھا۔

اس نے برآمدے میں پہنچ کر اطلاعی گھنٹی کا بٹن دبایا۔ چند لمحوں کے بعد دروازہ کھلا۔ دروازے پر اٹھارہ انیس برس کی ایک حسین اور جوان لڑکی کھڑی تھی۔ اس میں نتاشا

سے بڑی مشابہت تھی۔ اس لڑکی نے اپنی نظروں کے سامنے ایک اجنبی مرد کو پایا تو وہ چونکی۔ اس نے مودبانہ انداز سے سلام کیا پھر سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔ ''آپ کو کس سے ملنا ہے؟''

''بیگم نتاشا رحمان ہیں۔'' وقار حسین نے اسے دزدیدہ نظروں سے دیکھا۔ اس نے ایک لمحے کیلئے سوچا تھا کہ اگر اس کی کوئی اولاد ہوتی تو وہ اس کی عمر کی ہوتی۔

''جی ہاں! ہیں۔'' اس نے اپنا خوشنما سر ہلایا اور ایک طرف ہٹ کر کھڑی ہوگئی۔

''اندر تشریف لائیں۔''

پھر وہ اسے نشست گاہ میں لے آئی۔ پرانے طرز کا فرنیچر تھا۔ کمرہ صاف ستھرا تھا۔ دیواروں پر رابندر ناتھ ٹیگور، نذر الاسلام اور کچھ بنگالی ادیبوں کے پورٹریٹ کے علاوہ قدرتی نظاروں کی تصویریں بھی خوب صورت فریموں میں آویزاں تھیں۔ ''کیا آپ اپنا نام بتائیں گے تاکہ میں می کو بتاؤں۔'' وہ شائستگی سے بولی۔

''اس وقت کون ملنے آیا ہے بیٹی؟'' نتاشا کی مانوس آواز برابر کے کمرے سے آئی۔ دوسرے لمحے وہ کمرے میں داخل ہو کر ٹھٹھک کر رک گئی۔ ان دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ وقت کی نبض جیسے رک گئی تھی۔ نتاشا کو کسی خواب کی طرح لگ رہا تھا۔ کچھ لمحوں کے بعد وہ چونکی۔ اس کے دل کی دھڑکن بگڑنے لگی۔ اس کی زبان مسرت سے لڑکھڑائی۔ ''وقار تم......؟ کہیں میں کوئی سپنا تو نہیں دیکھ رہی ہوں؟'' نتاشا کا چہرہ دمکنے لگا۔

''ہاں میں نتاشا!'' وہ جذباتی سا ہوگیا۔ ماضی حال بن گیا۔ ''تم کیسی ہو؟''

''دیکھ لو...'' نتاشا اس کے پاس آ کر بولی۔ ''کھڑے کیوں ہو بیٹھ جاؤ۔'' وہ بیٹھ گیا تو اپنی بیٹی سے بولی۔ ''یہ میرے کلاس فیلو مسٹر وقار حسین ہیں۔ تمہارے پپا کے بچپن کے دوست۔'' آخری جملہ ادا کرتے وقت اس کے چہرے پر کرب سا چھا گیا۔

''رحمان کہاں ہے؟'' اس نے رسمی انداز سے پوچھا۔

نتاشا نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔ وہ اپنی بیٹی کی طرف متوجہ ہو کر بولی۔

''رضیہ! انکل کیلئے کچھ لے آؤ۔''

رضیہ کمرے سے نکل گئی تو وقار نے کہا۔ ''تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔ خیریت تو ہے خدانخواستہ۔

وہ سر جھکا کر ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''اس نے دس برس پہلے مجھے طلاق

دے دی۔ عورت ایک جاہل، ظالم اور جابر قسم کے شوہر کے ساتھ تو گزارہ کر سکتی ہے مگر شکی مزاج شوہر کے ساتھ نہیں۔'' وہ بڑے کرب سے آہستگی سے کہنے لگی۔ ''میں حیران ہوں کہ میں نے اس کے ساتھ دس برس کیسے گزار لئے۔ شادی کے ایک سال کے بعد ہی اس نے مجھے طعنہ دینا شروع کر دیا تھا۔ پہلے آدمی کا طعنہ وہ کہتا تھا تم جس مرد سے محبت کرتی تھیں وہ آج بھی تمہارے دل و دماغ میں بسا ہوا ہے۔ جب تم گیت اور نغمے لکھتی ہو، رومانی افسانے لکھتی ہو تو اس میں محبوب وہی شخص ہوتا ہے وہ میرا شوہر نہیں رقیب بن گیا تھا۔ جب میں کوئی شعر ذہن میں سوچتی یا خیالوں میں ڈوب ڈوب جاتی تو وہ کہتا تم پہلے آدمی کو یاد کر رہی ہو۔ اس پہلے آدمی کا ذکر سن سن کر میرے کان پک گئے تھے۔ میں نے اس سے ایک نہیں ہزار بار یقین دلایا کہ میں اس پہلے مرد کو اپنے من اور خوابوں سے نکال چکی ہوں۔ اس کی جگہ تم لے چکے ہو۔ یہ سچ ہے کہ میں نے اپنی زندگی میں ایک مرد سے محبت کی۔ تم نے بھی ایک نہیں تین لڑکیوں سے محبت کی۔ ان میں سے دو لڑکیوں کو تم نے محبت کے نام پر فریب دیا۔ ایک لڑکی نے ذلت و رسوائی کے خوف سے خودکشی کر لی۔ دوسری کی شادی اس کے والدین نے ایک بوڑھے رئیس سے کر دی مگر میں نے کبھی تمہیں طعنہ نہیں دیا۔ مگر اس نے کبھی میری بات کا یقین نہیں کیا۔ پھر اس نے مجھے طلاق دے کر اپنی سیکرٹری سے شادی کر لی۔ اس سے میرے دو بچے ہیں۔ ایک رضیہ اور دوسرا عامر۔''

''وہ پہلا آدمی کون تھا جس کی وجہ سے تمہاری زندگی عذاب بن گئی تھی؟'' میں نے تجسس سے پوچھا۔

''تم وقار!'' اس نے بکھرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

اس وقت کیونکہ رضیہ ایک ٹرے میں لیمن اسکوائش لئے داخل ہوئی تھی اس لئے میں نے فوراً موضوع بدلا۔ ''کیا تم بتا سکتی ہو کہ رقیہ خانم کہاں ہے؟''

''کیا۔ رقیہ بیگم؟'' نتاشا کے چہرے پر شدید حیرت چھا گئی۔ اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ وہ پہلو بدل کر بولی۔ ''ساری دنیا جانتی ہے کہ وہ تمہارے ساتھ ہی اس دیش سے فرار ہوئی تھی۔''

''نہیں وہ میرے ساتھ فرار نہیں ہوئی تھی۔'' وقار حسین نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''وہ میرے ساتھ فرار ہوئی ہوتی تو میں اس کی تلاش میں یہاں کیوں آتا؟ تمہارے دروازے پر دستک کیوں دیتا۔''

''پھر۔ پھر وہ گئی کہاں؟'' نتاشا کی آواز ڈوبنے لگی۔ اس پر جیسے سکتہ سا چھا گیا تھا۔ وہ چند لمحوں کی اذیت ناک خاموشی کے بعد کہنے لگی۔ ''تم بیس برسوں کے ایک لمبے عرصے کے بعد اس کی تلاش میں میرے پاس آئے ہو۔ آج کیوں اس کی اتنی ضرورت محسوس ہوئی کہ تمہیں واپس آنا پڑا۔ اس سے پہلے تمہیں اس کا دھیان کیوں نہیں آیا؟ تم نے پہلے اسے تلاش کرنے کی کوشش کیوں نہیں کی؟''

''میں خود حیران ہوں کہ وہ گئی کہاں؟'' وقار کے لہجے میں حیرت اور تشویش تھی۔ ''میں یہاں سے فرار ہونے کے بعد اس کی تلاش میں اسی لئے آ نہیں سکا کہ میں اپنی جان دشمن کے ہاتھوں سے بچا نہیں سکتا تھا۔ میں ان کے ہاتھوں مرنا نہیں چاہتا تھا بلکہ میں انہیں ختم کرنے کا آرزومند ہوں۔ میں نے یہاں سے فرار ہونے کے بعد دو تین مہینے تک اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر اس بے وفا کو تلاش کیا تھا تاکہ اس کی غلط فہمی دور کر دوں۔ اسے اصل حقیقت سے آگاہ کر دوں اس سے ڈائری حاصل کر لوں جس سے دشمن کے گروہ کو پھانسی کے پھندے پر لٹکایا جا سکتا ہے۔ میں نے اس کی تلاش میں چپہ چپہ چھان مارا۔ یہاں سے کلکتہ اور آسام تک گیا پھر بھی میں اسے پانے میں ناکام رہا۔ پھر میں مایوس اور دشمن سے خوف زدہ ہو کر اس دیش سے چلا گیا۔ آج پھر اس کی تلاش اور دشمن کے گروہ کا قلع قمع کرنے آیا ہوں۔''

''بیس برس کے بعد مجھ پر انکشاف ہو رہا ہے کہ وہ تمہارے ساتھ نہیں گئی تو وہ پھر کہاں گئی؟'' نتاشا کا چہرہ ایک دم سے متغیر ہو گیا۔ اس کی آواز حلق میں پھنسنے لگی۔ اس نے اپنی بیٹی کی طرف دیکھا اور ہاتھ کے اشارے سے ایک گلاس پانی لانے کیلئے کہا۔ وہ پانی لانے اٹھ گئی تو وہ خوف زدہ لہجے میں بولی۔ ''کہیں دشمن نے اسے قتل تو نہیں کر دیا؟ اگر وہ زندہ ہوتی تو مجھ سے رابطہ ضرور رکھتی۔ کسی نہ کسی طرح اپنی موجودگی کی اطلاع بھجواتی۔ چاہے وہ دنیا کے کسی خطے میں ہی کیوں نہ ہوتی۔

''میرا دل اس کی زندگی کی گواہی دے رہا ہے۔ دشمن ڈائری کی تلاش میں ہے۔ دشمن کو ڈائری کی تلاش نہ ہوتی تو اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا تھا کہ اس نے ڈائری حاصل کر لی ہے اور اب اسے کسی سے کوئی ڈر اور خوف نہیں ہے۔''

رضیہ پانی لے آئی تو نتاشا نے اسے ایک ہی سانس میں ختم کر دیا۔ وہ بیٹی کی طرف خالی گلاس لوٹاتی ہوئی بولی۔ ''ہاں' مجھے یاد آیا۔ رقیہ خانم نے مجھ سے ایک بار کہا تھا کہ

تیس کروڑ ٹاکا کا سونا ایک خفیہ مقام پر چھپایا ہوا ہے۔ اس ڈائری میں اس کا نقشہ اور اشارے بھی ہیں کہیں تم اس سونے کی تلاش میں تو نہیں آئے ہو۔"

"مجھے دولت کی ہوس کل تھی نہ آج ہے۔" اس نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔"اگر اس کا بھوکا ہوتا تو میں اس گروہ کو کس لیے چھوڑ دیتا۔ آج میرے پاس دولت کی کمی نہیں ہے۔ اتنی دولت ہے کہ پچاس برس تک ایک خوشگوار زندگی گزار سکتا ہوں۔ میں یہاں سونے کے لئے نہیں آیا ہوں۔ میں تو دشمن کا نام اور زندگی صفحہ ہستی سے مٹانے آیا ہوں جو ملک کو اندر سے کھوکھلا کر رہے ہیں۔ کیا یہ دکھ اور حیرت کی بات نہیں ہے کہ یہ ملک ان کے اشاروں پر چل رہا ہے جو غیر ملکی ایجنٹ ہیں اور یہ اپنے آپ کو سب سے بڑا محب وطن کہتے ہیں۔"

"خدا کرے رقیہ خانم زندہ ہو اور تم اپنے اس نیک اور عظیم مقاصد میں کامیابی حاصل کرو۔" نتاشا نے اس کی طرف گہری نظروں سے دیکھا۔

"آپ مجھے اجازت دیں انکل!" رضیہ نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ اسے ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔"کل میرا فائنل امتحان کا پہلا پرچہ ہے۔ آپ امتحانات کے بعد آئیں گے تو میں آپ سے بات کروں گی۔"

وقار حسین نے اسے اشارے سے اپنے پاس بلایا۔ وہ آئی تو اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس صوفے پر بٹھا لیا۔ اپنی جیب سے بٹوا نکال کر اس میں ایک ہزار ٹاکا نکال کر اس کی طرف بڑھائے۔"مجھے نہیں معلوم تھا کہ نتاشا کی ایک موہنی صورت بیٹی بھی ہے ورنہ میں کوئی چیز لے آتا۔ اس میں سے تم اپنے بھائی کو بھی حصہ دے دینا۔ اللہ تمہیں سدا خوش رکھے۔" اس نے بڑی شفقت سے رضیہ کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

رضیہ نے ماں کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ اسے رقم لیتے ہوئے تذبذب سا ہو رہا تھا۔ نتاشا نے اس سے کہا۔"رقم کا کیا ہے وہ ایک دن میں خرچ ہو جائے گی۔ تمہاری دعائیں اس کیلئے سب سے بڑی دولت ہے۔ وہ ساری زندگی کام آئیں گی۔"

"میں آخری سانس تک تمہارے بچوں کیلئے دعا کرتا رہوں گا۔" وقار حسین نے کہا۔ رضیہ اس کا شکریہ ادا کر کے جانے لگی تو اس نے رضیہ سے کہا۔"تم نے میری اور اپنی ماں کی گفتگو سنی ہے اس کا ذکر تم کسی سے نہ کرنا' اپنے بھائی اور پپا سے بھی نہیں۔ میرا نام بھی نہ لینا۔ اس لئے کہ میری جان خطرے میں ہے۔ میں ایک نیک مشن پر آیا ہوں۔ میرے ذکر سے تم لوگوں کی جانوں کو بھی خطرہ لاحق ہو جائے گا۔ سفاک درندے نہ صرف میرے

ملا۔ میرے ملنے والوں کے بھی دشمن ہیں۔ میں اب یہاں کبھی نہیں آؤں گا۔''
رضیہ کا چہرہ ایک لمحے کیلئے سفید پڑ گیا۔ دوسرے لمحے اس نے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔''اچھا کیا آپ نے جو مجھے بتا دیا۔ اب میں اسے راز رکھوں گی۔''
رضیہ کمرے سے نکل گئی۔ وقار حسین نے لیمن اسکوائش کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ اب اسے پیاس سی محسوس ہوئی تو اس نے گلاس اٹھا لیا اور منہ سے لگایا پھر ایک گھونٹ لے کر اس نے پرخیال نظروں سے نتاشا کی طرف دیکھا۔ ان بیس برسوں میں وہ بہت بدل گئی تھی۔ اس کے سیاہ بالوں میں سے سفید بال جھانک رہے تھے اس کا رنگ روپ ماند پڑ گیا تھا۔ کسی مرجھائے ہوئے پھول کی طرح لگ رہی تھی۔ آنکھوں میں اسے ایک گہرا سمندر دکھائی دیا۔ دکھ' صبر اور احساس کا ایک پرسکون سمندر' ایسا سمندر اس نے کبھی کسی عورت کی آنکھوں میں نہیں دیکھا تھا۔
''مجھے اس طرح سے کیوں دیکھ رہے ہو۔'' نتاشا نے گہرے سکوت کو توڑا۔ اس کے لبوں پر بے جان مسکراہٹ پھیل گئی۔''میں آج صرف ایک ماں بن کر رہ گئی ہوں۔ میں ہر وقت اپنے بچوں کے بارے میں سوچتی رہتی ہوں۔''
''میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ میری محبت نے تم سے تمہارا سب کچھ کس لئے چھین لیا۔ مجھے رحمان سے ایسی امید نہ تھی۔''
''رحمان کے شکی مزاج ہونے کی ایک وجہ اور بھی تھی۔'' وہ کہنے لگی۔''اس کی زندگی میں کچھ شادی شدہ عورتیں بھی آئی تھیں وہ اس کی سیکرٹری رہ چکی تھیں۔ اپنے شوہروں سے ان کے ہرجائی پن نے دنیا کی ہر عورت کو مشتبہ بنا دیا تھا۔''
''اچھا اب میں چلتا ہوں۔'' وقار حسین جانے کیلئے اٹھ کھڑا ہوا۔''میں اگر اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا' میں اگر دشمن کے گروہ کا صفایا کرنے میں کامیاب ہو گیا اور رقیہ خانم کو پا لیا تو اس کے ہمراہ ضرور آؤں گا تم میرے لئے دعا کرتی رہنا۔''
نتاشا اسے رخصت کرنے برآمدے تک آئی۔ ان دونوں نے ایک دوسرے کو آج سے بیس برس پہلے اس روز کی طرح دیکھا جب ان کے درمیان رحمان دیوار بن کر حائل ہو گیا تھا اور وہ آخری ملاقات تھی۔ نتاشا کی آنکھیں چھلک پڑیں۔ وقار حسین نے اپنی جیب سے رومال نکال کر اس کی آنکھوں کے قیمتی موتیوں کو اس میں جذب کر لیا پھر وہ اس کے شانے پر اپنا سر رکھ کر سسک پڑی۔ وہ اس کو تسلی دے کر باہر نکل آیا۔ اس نے گلی میں آ کر

پلٹ کر دیکھا تو وہ ابھی تک بت بنی اسے دیکھ رہی تھی۔

وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا گلی کی نکڑ کی طرف بڑھ گیا۔ اس کے دل کو ایک گہرے صدمے کا احساس ہو رہا تھا۔ اس ویران گلی کی طرح اسے اپنے دل کے نہاں خانے محسوس ہو رہے تھے۔ اس نے سوچا وہ یہاں کس لئے آیا تھا۔ کاش نہ آتا۔ جب نتاشا کو رقیہ خانم کے بارے میں کچھ پتا نہیں ہے تو پھر کسی کو کچھ نہیں معلوم ہوگا۔ اب وہ کس سے رقیہ خانم کے بارے میں پتا کرنے جائے۔ اسے ایسا لگ رہا تھا وہ آج بھی بیس برس پہلے کی طرح گھپ اندھیرے میں کھڑا ہے اور اسے کچھ سجھائی نہیں دے رہا ہے۔

☆......☆......☆

وہ بیدار ہوا تو صبح کے دس بج رہے تھے۔ وہ رات بڑی دیر سے سویا تھا۔ اس کی نیند اچاٹ ہو گئی تھی۔ اس نے نہانے کے بعد ناشتہ اپنے کمرے میں منگوا لیا تھا۔ وہ ناشتہ کرتے ہوئے سوچتا رہا کہ اسے سب سے پہلے اپنی حفاظت کیلئے ایک ریوالور خرید لینا چاہیے۔ اس کی اسے کسی بھی لمحے ضرورت پڑ سکتی ہے۔ اس کا لائسنس حاصل کرنے میں معلوم نہیں کتنے دن لگیں۔ جب ویٹر برتن لینے آیا تو اس نے ویٹر سے دریافت کیا۔ ''کیا تم بتا سکتے ہو کہ اسلحہ کا لائسنس کتنے دنوں میں ملتا ہے؟''

''بہت مشکل سے ملتا ہے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''آپ کہاں اس چکر میں پڑتے ہیں۔ آپ کرمی ٹولا میں کالو میاں کے مکان پر جائیں اس نے اپنے گھر میں اسلحے کی دکان کھول رکھی ہے۔ آپ کو نہ صرف جدید ترین بلکہ بازار سے کم دام پر پستول، ریوالور، ٹامی گن، شارٹ گن اور کلاشنکوف بھی مل سکتا ہے۔ پانچ سو ٹاکا دیں تو ہاتھ کے ہاتھ لائسنس بھی مل جائے گا۔''

''لائسنس بھی مل جائے گا؟'' اسے بڑا تعجب ہوا۔

''جی سر!'' ویٹر نے اپنا سر ہلایا۔ پھر سرگوشی کے انداز میں بولا۔ ''لائسنس جعلی ہوتا ہے مگر وہ چلتا ہے اور چل رہا ہے۔''

''مجھے یقین نہیں آ رہا ہے۔'' وقار حسین نے مزید کریدنے کیلئے جیب سے پچاس ٹاکا کا ایک نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔ ''یہ کیسے ممکن ہے؟''

''تھینک یو سر!'' ویٹر نے نوٹ اپنی جیب میں ٹھونس لیا۔ اس کا چہرہ دمک اٹھا۔ وہ اپنے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے کہنے لگا۔ ''ارے سر! اس ملک میں کیا چیز ممکن نہیں ہے۔

پولیس زندہ باد' پولیس جرم کو جتنا فروغ دیتی ہے اتنا کوئی مجرم بھی نہیں۔ آپ جا کر دیکھیں تو سہی وہ کس طرح کھلے عام اور بلاخوف وخطر اسلحہ فروخت کر رہا ہے۔ دراصل یہ دکان پولیس والوں کی ہے۔ پولیس جو کہیں چھاپے مار کر اسلحہ برآمد کرتی ہے اس میں سے سب سے اچھا مال اس دکان پر چلا آتا ہے۔ کمشنر پولیس سے لے کر کانسٹیبل تک کو حصہ ملتا ہے۔ آپ حکم دیں تو میں شام کو ڈیوٹی سے آف ہونے کے بعد آپ کو پستول خرید کر لا دوں۔''

''نہیں مجھے پستول کی کوئی ضرورت نہیں۔'' اس نے کہا۔''میں تو معلومات کی غرض سے دریافت کر رہا تھا۔''

تھوڑی دیر بعد وقار تیار ہو کر نیچے آیا۔ وہ لفٹ سے باہر آیا تو اس نے ایک انجانے خطرے کی بو محسوس کی پھر اس نے کن انکھیوں سے اس خطرے کو دیکھ لیا جو ہال میں بیٹھا بظاہر اخبار پڑھنے میں مصروف تھا۔ اس نے اس کے پاس سے گزرتے ہوئے یہ ظاہر کیا کہ اس نے اس شخص کو دیکھا ہی نہیں۔ وہ ہوٹل میں واقع امریکن ایکسپریس کے دفتر میں داخل ہو گیا۔ اس نے اپنے ٹریولرز چیک کیش کراتے ہوئے کن انکھیوں سے شیشوں کے اس پار دیکھا تو اس نے اس خطرے کو ایک ڈسپلے فریم کے پاس کھڑے پایا جس میں ایک بری حسینہ کی تصویر آویزاں تھی۔ وہ غیر محسوس انداز سے نوٹوں کے بنڈل دیکھ رہا تھا۔ جو وقار حسین ایک لفافے میں رکھ رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وقار حسین امریکن ایکسپریس کے دفتر سے نکلا تو وہ خطرہ اپنی سابقہ جگہ بیٹھا تھا۔ اس نے ہوٹل کے کاؤنٹر پر پہنچ کر نوٹوں کا ایک بنڈل اپنے پاس رکھ کر باقی رقم اس نے کیشئر کے پاس جمع کرا دی۔ جس وقت کیشئر رسید کاٹ رہا تھا اس نے ''خطرے'' کی طرف دیکھا۔ وہ درمیانے قد کا ایک عام سا شخص دکھائی دے رہا تھا۔ جرائم پیشہ تو نہیں بلکہ کسی دفتر کا کلرک محسوس ہو رہا تھا۔ دشمن نے ایک عام سے شخص کو اس کے تعاقب پر شاید اس لئے لگا دیا تھا کہ اسے شک نہ ہو۔

وہ تھوڑی دیر بعد ہوٹل کی عمارت سے باہر آیا اور فٹ پاتھ پر اس طرح سے کھڑا ہو گیا جیسے اسے کسی کا انتظار ہو۔ اس نے اس خطرے کو دیکھا جو ایک ٹریولر ایجنسی کے شوکیس کے اس پار کھڑا اس کے شیشے میں سے اس کی نقل وحرکت پر نظریں رکھے ہوئے تھا۔ وقار چند لمحوں کے بعد مخالف سمت چل پڑا۔ پہلے تو اس نے اپنی رفتار تیز کر دی۔ کوئی سو قدم چلنے کے بعد اس نے اپنی رفتار اچانک کم کر دی اور ایک دم سے رک کر تیزی سے پلٹا اور پھر تیز تیز قدم چلنے لگا تو اس کے تعاقب میں آنے والا شخص بوکھلا سا گیا۔ وہ اس کے پاس پہنچ کر

رکا۔ ''تم میرا تعاقب کر رہے ہو۔''

''ہاں' جی' نہیں' نہیں۔'' وہ ہڑبڑا گیا اور ہونقوں کی طرح اس کی شکل دیکھنے لگا۔ اس کی پیشانی پر پسینہ پھوٹ پڑا۔

''لگتا ہے تم اپنی زندگی میں پہلی بار کسی کا تعاقب کر رہے ہو۔''

''مجھے کیا ضرورت پڑی ہے آپ کا تعاقب کروں۔'' اس نے اپنی جیب سے رومال نکال کر پسینہ پونچھا۔ اس کی آواز گلے میں پھنس رہی تھی۔ ''میں تو آپ کو جانتا بھی نہیں' میں ایک ہفت روزہ اخبار کا کرائم رپورٹر ہوں۔ میں یہاں ایک سیاسی لیڈر سے انٹرویو لینے آیا تھا۔'' اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر اپنا شناختی کارڈ نکال کر اس کی نظروں کے سامنے لہرا دیا۔

وقار حسین نے اس کے ہاتھ سے کارڈ نہیں لیا۔ اس کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ بکھر گئی۔ ''تمہاری جیب میں میری جو تصویر ہے ذرا وہ بھی تو دکھا دو۔''

اس کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ وہ بغلیں جھانکنے لگا پھر اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے بولا۔

''میرے پاس آپ کی کوئی تصویر نہیں ہے۔''

''تم کسی بھی لحاظ سے کرائم رپورٹر نہیں دکھائی دیتے۔'' وقار حسین اس کی گھبراہٹ سے لطف اندوز ہونے لگا۔ ''کیا خیال ہے اگر ہم اس ریسٹورنٹ میں چل کر ایک کپ چائے پی لیں۔''

وہ تذبذب میں پڑ گیا۔ دوسرے لمحے وہ بے دلی سے بولا۔ ''چلیے۔''

اس شان دار ایئر کنڈیشنڈ ریسٹورنٹ کی ایک میز پر بیٹھ کر وقار حسین نے اس کیلئے پرتکلف ناشتہ منگوایا۔ اس نے اپنے دشمن کے آدمی سے کہا۔ ''ایسا لگ رہا ہے کہ تم نے صبح ناشتہ نہیں کیا۔ بھوکے ہو۔''

''صبح میں نے صرف چائے پی تھی۔'' اس نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیری۔

''تمہارے کتنے بچے ہیں؟''

''چھ بچے ہیں۔'' اس نے جھجکتے ہوئے بتایا۔ ''دو مہینے کے بعد میری بیوی ساتویں بچے کی ماں بننے والی ہے۔''

''ہم بنگالی بچے پیدا کرنے کی دوڑ میں دنیا میں سب سے آگے ہیں۔'' وقار حسین نے تبصرہ کیا۔

''ہم لوگ مرتے بھی تو زیادہ ہیں۔'' اس نے بیساختگی سے جواب دیا۔ ''سیلاب' بارش' طوفان اور فسادات میں ہزاروں لاکھوں لوگ مر جاتے ہیں۔ فاقوں سے مرنے والوں کی تعداد بھی کچھ کم نہیں۔''

''تم ٹھیک کہتے ہو۔'' وقار حسین نے سر ہلایا۔ اب مطلب کی بات کرو۔ مجھ سے چھپانے اور جھوٹ بولنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں تم سے دوستانہ ماحول میں بات کر رہا ہوں۔ یہ بتاؤ تمہیں میرے تعاقب کا معاوضہ کیا دیا گیا ہے؟''

اس نے قدرے تذبذب سے جواب دیا۔ ''دو سو ٹاکا۔''

''صرف دو سو ٹاکا۔'' وقار حسین نے حیرت سے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ اس نے ان عقاب جیسی نگاہوں کی تاب نہ لا کر اپنی نظریں نیچی کر لیں۔ وقار حسین نے اپنی جیب سے بٹوا نکالا۔ اس میں سے پانچ سو کی رقم نکال کر اس کی طرف بڑھائی۔ ''تم نے بہت کم قیمت پر اپنی جان خطرے میں ڈال دی ہے۔ یہ رقم میں تمہیں اس لئے دے رہا ہوں کہ تم میرا تعاقب نہ کرو۔ نجانے کیوں تم پر رحم آ گیا ہے۔ میں یہ فیصلہ کر کے وطن واپس آیا ہوں کہ اپنے دشمن کے کسی آدمی کو زندہ نہیں چھوڑں گا۔'' وقار حسین کا لہجہ سرد اور سفاک تھا۔

اس شخص نے پس و پیش کے بعد رقم لے لی اور اسے جیب میں رکھتے ہوئے بولا۔ ''مگر میں انہیں آپ کے بارے میں کیا اطلاع دوں؟''

''ان سے کہہ دینا کہ تم نے میرا پرانا ہلٹن تک تعاقب کیا تھا اس کے بعد میں کہیں ہجوم میں غائب ہو گیا۔''

''میں آپ کو ایک مخلصانہ مشورہ دینا چاہتا ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''میرا مخلصانہ مشورہ یہ ہے کہ آپ جہاں سے آئے ہیں وہیں واپس لوٹ جائیں اور ڈائری اپنے دشمن کے حوالے کر دیں۔ اس لئے کہ آپ کا دشمن بہت سفاک ہے اور پھر وہ ایک نہیں پورے دس شیطان ہیں جن کے ہاتھوں میں اس ملک کی تقدیر ہے وہ سیاہ سفید کے مالک ہیں۔ ان کے آگے ہر شخص بے بس ہے۔ ان سے آپ تنہا کبھی مقابلہ نہیں کر سکتے ہیں۔ ان بیس برسوں میں جن لوگوں نے ان کے مقابلے پر آنے کی کوشش کی ان کی لاشوں کا پتا نہیں چل سکا۔ انہوں نے بربریت میں ہلاکو اور چنگیز خان کو بھی شرمندہ کر دیا ہے۔''

''تمہارے مشورے کا شکریہ۔'' وقار حسین نے کہا۔

''اب تم اپنی فکر کرو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میرے ساتھ بیٹھ کر چائے پینے کی پاداش

میں وہ لوگ تمہیں ٹھکانے لگانے کی کوشش کریں اور تم اپنے ساتویں بچے کو دیکھ بھی نہ سکو۔''

☆......☆......☆

وقار حسین نے کرمی ٹولا جا کر ایک جدید ترین اور بے حد خطرناک پستول خریدا جو ساختہ امریکہ تھا۔ وہ واقعی یہ دیکھ کر بہت حیران ہوا تھا کہ اس دکان پر غیر قانونی اسلحے کی خرید و فروخت کا کاروبار بڑے اطمینان سے ہو رہا ہے۔ وہ پستول خرید کر نکلا تو اسے سکون و اطمینان سا محسوس ہوا۔ وہ اپنے آپ کو بے حد ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔

☆......☆......☆

بیرسٹر سید محمد احمد کا خوب صورت اور نہایت آراستہ و پیراستہ دفتر موتی جھیل میں واقع تھا۔ وہ ایک مانا ہوا وکیل تھا۔ وہ بڑا با اصول اور مصروف ترین شخص تھا۔ وقار حسین اس کی سیکرٹری کے پاس پہنچا۔ چالیس برس کی یہ عورت اسے بہت تیز اور تند خو سی لگی۔ ''میں بیرسٹر صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔''

''کیا آپ نے ان سے وقت لیا ہوا ہے؟'' سیکرٹری نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

''جی میرا کوئی اپائنٹ منٹ نہیں ہے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''لیکن میں ان سے اسی وقت ملنا چاہتا ہوں۔''

''وہ بغیر اپائنٹ منٹ کے کسی سے نہیں ملتے۔ آپ کل شام پانچ بجے تشریف لے آئیں۔ صرف دس منٹ کا وقت مل سکتا ہے۔'' سیکرٹری نے قلم سنبھالتے ہوئے کہا۔ ''آپ کا کیا نام ہے؟'' وہ ڈائری پر جھک گئی۔

وقار حسین نام بتانے کے بجائے دروازے کی طرف بڑھا تو سیکرٹری نے آواز دے کر روکنے کی کوشش کی پھر وہ برقی سرعت سے اس کے راستے میں حائل ہو گئی اور تیز و تند لہجے میں اسے خشمگیں نظروں سے گھورتی ہوئی بولی۔

''آپ اندر نہیں جا سکتے۔''

وقار حسین نے اپنی جیب سے پستول نکال کر اس پر تان لیا۔ ''کیا تمہیں اپنی جان عزیز نہیں ہے؟''

سیکرٹری کا چہرہ سفید پڑ گیا اور اس کی آنکھیں دہشت سے پھیل گئیں۔ اس نے کچھ کہنا چاہا تو اسے اپنے گلے میں گولا سا پھنستا ہوا محسوس ہوا۔ وہ ایک طرف ہٹ گئی تو وقار نے تیز لہجے میں کہا۔ ''آدمی دیکھ کر بات کیا کیجئے۔''

وقار حسین نے کمرے میں داخل ہو کر دیکھا۔ بیرسٹر سید محمد احمد ایک فائل پر جھکا

ہوا اس کا بڑے انہماک سے مطالعہ رہا تھا اور لال قلم سے کہیں کہیں نشان بھی لگا رہا تھا۔ اس نے دروازہ کھلنے، بند ہونے اور کمرے میں کسی کی آمد محسوس کر کے ناگواری اور غصے سے سر اٹھا کر دیکھا۔ اس نے سختی سے سیکرٹری تک کو اندر آنے سے منع کیا ہوا تھا۔ دوسرے لمحے اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ پھر اس کا چہرہ دمک اٹھا۔ وہ فائل میز پر رکھ کر اس کی طرف لپکا اس نے اپنے بازو پھیلا دیئے۔ دوسرے لمحے وہ دونوں خوشی، محبت اور بڑی گرمجوشی سے بغل گیر ہو گئے۔ اس وقت سیکرٹری نے دروازہ کھول کر خوف زدہ نظروں سے جھانکا اور اس کے ساتھ سکیورٹی گارڈ بندوق ہاتھ میں لئے کھڑا تھا۔ سیکرٹری نے یہ منظر بڑی حیرانی سے دیکھا اور پھر فوراً ہی دروازہ بے آواز بند کر دیا۔

''میں بیس برس سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔'' بیرسٹر سید محمد احمد نے اس سے الگ ہو کر اس کے شانے تھام لئے اور محبت پاش نظروں سے اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگا۔ ''مجھے امید تھی تم ایک دن ضرور آؤ گے۔ میرا دل کہتا تھا تم زندہ ہو۔''

تھوڑی دیر تک وہ دونوں رسمی باتیں کرتے رہے۔ وقار حسین نے چائے کے دوران اس سے کہا۔ ''تمہارا وقت بہت قیمتی ہے۔ میں زیادہ وقت نہیں لوں گا۔ کیا تمہارے علم میں ہے کہ رقیہ خانم کہاں ہے؟ وہ زندہ ہے یا اسے قتل کر دیا گیا ہے؟''

''میں نے اسے دس برس پہلے کلکتہ کے ایئرپورٹ پر دیکھا تھا۔'' اس نے جواب دیا۔ ''رقیہ خانم کی نظر جیسے ہی مجھ پر پڑی وہ بڑی گھبرا گئی اور سراسیمہ ہو کر بھیڑ میں گم ہو گئی۔ پھر وہ مجھے کبھی دکھائی نہیں دی۔''

''غفور چوہدری کہاں ہے؟'' وقار حسین نے پوچھا۔ ''مجھے اس کی بھی تلاش ہے۔''

''تمہارے خیال میں کیا دشمن نے اسے بیس برس تک زندہ رہنے کی مہلت دے دی ہو گی؟'' اس نے جواب دیا۔ ''تمہارے یہاں سے فرار ہونے کے بیس دن کے بعد دشمن نے اسے اتنی بے رحمی سے قتل کیا کہ تم تصور تک نہیں کر سکتے۔ اس کی لاش کو بھی جلا کے راکھ کر دیا۔ پھر اس کے باپ کی تلاش میں شکاری کتوں کو چھوڑ دیا۔ باپ اپنے بیٹے کی المناک موت کا صدمہ برداشت نہ کر سکا اور اپنے خالق حقیقی سے جا ملا۔''

''مجھے اپنے دشمن سے بہت سے بدنصیب لوگوں کا حساب لینا ہے۔'' وقار حسین نے گہری سانس لی اور بڑے کربناک لہجے میں کہا۔ ''اگر مجھے کسی طرح سے رقیہ بیگم مل جائے یا وہ ڈائری جس میں دشمن کے دس شیطانوں کے نام و پتے شامل ہیں تو میں ایک ایک کر کے ان سب کو ٹھکانے لگا دوں گا۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں صرف دو یا تین شیطانوں سے

واقف ہوں۔ انہیں ختم کرنے سے کچھ حاصل نہ ہو گا۔"

"تمہیں میری اور مجھ سے کسی قسم کی مدد کی جب بھی ضرورت ہو تو میں حاضر ہوں۔ تم مجھے پیچھے نہیں پاؤ گے۔"

"شکریہ میرے دوست!" وقار حسین اٹھ کھڑا ہوا۔ "مجھے تم سے ایسی ہی امید تھی۔ دوست ہی دوست کے کام آتا ہے۔"

وقار حسین کمرے سے نکلا تو سیکرٹری نے اسے متوحش نظروں سے دیکھا۔ وہ ابھی تک خوف زدہ تھی۔ وقار حسین اسے مسکرا کے دیکھتا ہوا باہر نکل گیا۔ نیچے آ کر اس نے ایک بے بی رکشا (آٹو رکشا) کو روکا اور اس سے کہا "صدر گھاٹ چلو۔"

☆......☆......☆

ڈاکٹر امجد جعفر ابھی ابھی چیف منسٹر کے طبی معائنے سے فارغ ہوا تھا۔ اس کی حسین اور جوان سیکرٹری چائے اور سینڈوچ رکھ کر کمرے سے نکل گئی۔ تبھی اس کے گرین ٹیلی فون کی گھنٹی بجی تو اس نے چونک کر ریسیور اٹھا لیا۔ "ہیلو ڈاکٹر امجد جعفر اسپیکنگ۔"

"سر! میں شمسو میاں بول رہا ہوں۔" وہ کہنے لگا۔ "وقار حسین نے آج کالو میاں سے ایک خطرناک قسم کا پستول اور گولیوں کا ایک ڈبہ خریدا ہے۔ اب وہ صدر گھاٹ گیا ہے۔ شاید وہ وہاں عبدالغنی کی تلاش میں گیا ہو۔"

"تم نے صدر گھاٹ تک اس کا تعاقب نہیں کیا؟ میں نے تم سے کہا نہیں تھا کہ اس پر نظر رکھو۔"

"اس کی کیا ضرورت ہے سر!" وہ سفاک لہجے میں بولا۔ "اسے کل شام تک ختم جو کر دینا ہے۔"

"تم نے اسے ابھی تک ختم کیوں نہیں کیا؟" آخر اسے کل تک زندہ رہنے کی مہلت کس لئے دی جا رہی ہے؟"

"اوپر والوں کا ٹیلیفون آیا تھا کہ اس کو ڈھاکہ شہر سے باہر ختم کیا جائے۔ آپ اوپر والوں کو یقین دلا دیں کہ میں وقار حسین کو اس طرح قتل کروں گا کہ اس کا سراغ کسی کو نہیں ملے گا۔ اس کی لاش جلا کر راکھ کر دوں گا۔"

"تمہیں پورا اختیار ہے کہ اسے جب جس وقت اور جہاں چاہے قتل کرو اور ہاں اس کی لاش کی راکھ مجھے دکھانا نہ بھولنا۔"

☆......☆......☆

''جانتے ہو دوست ! میں تمہارے پاس کس لئے آیا ہوں؟'' وقار حسین نے پولیس انسپکٹر جمشید کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ ''اس لئے کہ تم ایک فرض شناس پولیس افسر سمجھے جانے کے ناتے اس شہر میں عزت و احترام کی نظروں سے دیکھے جاتے ہو۔ کسی نے تمہارے بارے میں یہ بتایا ہے کہ تم پولیس افسر کے بھیس میں ایک وحشی قاتل ہو۔ تم دس شیطانوں کے گروہ کے آلہ کار ہو۔ تم نے جن لوگوں کو اب تک قتل کیا ہے اس کا کفارہ ادا کرنا ہے۔ اس سلسلے میں میری مدد کرو۔ ہم دونوں مل کر دس شیطانوں کو ایک ایک کر کے قتل کر دیں گے۔ اس طرح یہ گروہ اپنی موت آپ مر جائے گا۔''

''میں مجبور ہوں اس گروہ کے احکام بجا لانے کے لئے۔'' جمشید نے خفت سے کہا۔ ''اگر میں نے ان کے کسی حکم کی خلاف ورزی کی تو وہ نہ صرف مجھے بلکہ میری بیوی بچوں کو بھی ختم کر دیں گے۔ میں اتنا جانتا ہوں کہ یہ دس شیطانوں کا ایک خطرناک گروہ ہے مگر میرا واسطہ اور تعلق صرف ایک شیطان سے ہے۔ باقی شیطان کون ہیں؟ ان کے نام کیا ہیں؟ میں نہیں جانتا۔''

''اچھا تو تم قانون کے محافظ ہوتے ہوئے قانون شکنی پر مجبور ہو۔'' وقار حسین نے تیز لہجے میں کہا۔ ''جب تم ایسا کر سکتے ہو تو پھر مجھے بھی یہ حق حاصل ہے کہ میں قانون کو ہاتھ میں لوں۔ مگر میں کسی ایسے شخص کو قتل نہیں کروں گا جو بے گناہ ہو میں صرف انہی درندوں کو قتل کروں گا جو دس شیطانوں کے گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔''

''اگر تم ان لوگوں کو قتل کر دو تو مجھے بہت خوشی ہوگی مگر تم ان دس شیطانوں کا پتا کیسے چلاؤ گے؟''

''ڈائری اور رقیہ خانم کی مدد سے۔'' وقار حسین بولا۔ ''میں رقیہ خانم کی تلاش میں سرگرداں ہوں۔''

''میں تمہیں ایک راز کی بات بتاؤں۔'' جمشید کہنے لگا۔''بیس برس پہلے جب تم اس دیش سے فرار ہو کر چلے گئے تھے تب تمہارے دوست رحمان نے اس سے کہا وہ اس سے خفیہ شادی کر لے۔ وہ نتاشا کو اس شادی کی خبر ہی نہیں ہونے دے گا۔ اسے چٹا گانگ میں رکھے گا۔ رقیہ خانم نے صاف انکار کر دیا جس پر اس نے مشتعل ہو کر رقیہ خانم کو قتل کر دیا۔ تفتیشی پولیس افسر کو اس پر شک ہو گیا تو وہ میرے پاس آیا تھا۔ میں نے اسے پناہ دی تھی اور اس کا کیس ختم کرا دیا تھا۔ رقیہ خانم اب اس دنیا میں نہیں ہے۔''

وقار حسین نے اسے گہری نظروں سے دیکھا۔''تم مجھے غلط راستے پر ڈالنے کی کوشش مت کرو۔ اپنے جھوٹ کے پلندے کو اپنے پاس ہی رکھو۔ میں نے تمہارے بارے میں اتنا کچھ معلوم کر لیا ہے کہ تم سوچ بھی نہیں سکتے۔ تم شادی شدہ نہیں ہو مگر ہر وہ عورت وقتی طور پر تمہاری بیوی بن جاتی ہے جو حوالات میں کسی جرم کی پاداش میں بند کر دی گئی ہو۔ تم ایک سفاک اور بے رحم قاتل ہو۔'' وقار حسین نے اپنی جیب سے پستول نکال کر اسے نشانے کی زد میں لیا تو جمشید بری طرح چونک پڑا۔ اس کا چہرہ پیلا پڑ گیا اور آنکھیں پھیل گئیں۔ وقار حسین نے اسے کچھ کہنے کا موقع نہیں دیا۔ اپنی دوسری جیب سے سائلنسر نکالتے ہوئے کہنے لگا۔''تم نے اپنے بچپن کے دوست غفور چوہدری تک کو نہیں بخشا۔ اس کی بیوی کو ایک ہفتہ تک یرغمال بنا کر رکھا۔ اپنے دوست کو قتل کر کے اس کی لاش جلا دی۔ میں یہ جانتا ہوں کہ ان دس بڑے شیطانوں میں سے جب تک ایک شیطان بھی موجود ہے اس وقت تک تم پر آنچ نہیں آ سکتی۔ اس لئے میں تمہارا ناپاک وجود ہی اس دنیا سے مٹا دینا چاہتا ہوں۔ کاش میں تمہیں سسکا سسکا کر ختم کر سکتا لیکن اس کیلئے میرے پاس وقت ہے اور نہ ہی موقع۔''

''سنو میری بات سنو۔'' جمشید نے اپنا ہاتھ فضا میں بلند کیا۔ اس کی آواز حلق میں پھنس رہی تھی۔ وہ گڑگڑانے لگا۔''میں تم سے رحم کی بھیک مانگتا ہوں۔ تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ......''

''جنہیں تم نے بے رحمی اور سفاکی سے قتل کیا انہوں نے بھی تو تم سے زندگی کی بھیک مانگی ہو گی؟ کیا تم نے ان پر رحم کھایا تھا؟''

جمشید کے چہرے پر پسینہ پھوٹ پڑا۔''تم میری بات کا یقین کرو۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ میں تم سے ہر طرح کا تعاون کروں گا۔ مجھے معاف کر دو۔''

''میں جھوٹے کی کسی بات پر اعتبار نہیں کرتا۔'' وقار حسین نے بھڑک کر تیز لہجے میں کہا۔ ''تم معافی کے قابل بالکل نہیں ہو۔''

''میں دس بڑے شیطانوں کے نام بتانے کیلئے تیار ہوں۔'' جمشید کا ہاتھ غیر محسوس انداز سے ہولسٹر کی طرف بڑھنے لگا۔ وہ اس کی توجہ ہٹانے کیلئے نفسیاتی حربے سے کام لینے لگا۔ ''تمہیں تیس کروڑ ٹاکا کے سونے کا راز بھی بتا سکتا ہوں۔''

''پھر تم جھوٹ بول رہے ہو مگر میں تمہارے فریب میں نہیں آنے کا۔'' وقار حسین نے اس کی کھوپڑی کی طرف شست باندھی۔

''میں کس لئے فریب دوں گا جب کہ تم میرا ساتھ دینے پر آمادہ ہو۔'' جمشید نے ہولسٹر کا بٹن کھول لیا۔

''جمشید اپنا ہاتھ ہٹالو اور دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو جاؤ۔'' وقار حسین نے غصیلے لہجے میں کہا۔ ''تم ناقابل اعتبار ہو۔ میں نے پولیس پر کبھی بھروسہ نہیں کیا آج کیسے کر سکتا ہوں۔ تم میں اور سانپ میں کوئی فرق نہیں ہے۔''

جمشید نے اس کے حکم کی بلاچوں و چرا تعمیل کی۔ اس کے سوا چارہ بھی نہیں تھا۔ وقار حسین نے آگے بڑھ کر اس کے ہولسٹر سے ریوالور نکال لیا پھر اسے حکم دیا کہ وہ اس کی طرف گھوم جائے۔ وہ گھوم گیا تو وقار حسین نے اپنا پستول اپنی جیب میں رکھ لیا پھر اس سے مخاطب ہو۔ ''اب میں نے تمہیں اپنے پستول سے قتل کرنے کا ارادہ بدل دیا ہے۔ میں تمہیں تمہارے ریوالور سے شوٹ کروں گا تا کہ یہ تاثر لیا جائے کہ کسی مجبور اور مظلوم عورت نے تمہاری بربریت اور درندگی کی وجہ سے انتقاماً تمہیں قتل کر دیا ہے۔

جمشید کے چہرے پر لہو کی ایک بوند تک نہیں رہی تھی۔ اس کے بدن پر لرزہ طاری ہو گیا تھا۔ وقار حسین نے ڈیک کے پاس جا کر اس کا بٹن آن کر دیا۔ فضا میں پاپ میوزک بجنے لگی۔ پھر اس کی آواز اتنی بڑھا دی کہ کان کے پردے پھٹتے ہوئے محسوس ہونے لگے۔ پھر اس نے بڑی احتیاط کے ساتھ اس کے جسم کو گولیوں کا نشانہ بنا دیا۔ ان زخموں سے خون کے فوارے ابل پڑے۔ وہ کٹے ہوئے درخت کی طرح زمین پر آ رہا۔ وقار نے ایک چھوٹے شیطان کو اس دنیا سے پاک کر دیا تھا جس نے دولت اور ترقی کی ہوس میں نہ صرف قانون شکنی شروع کر دی تھی بلکہ نجانے کتنے بیگناہوں کے خون سے ہولی کھیلی تھی۔

وقار حسین نے اپنی جیب سے رومال نکال کر ریوالور کو صاف کیا۔ پھر اس نے ان

جگہوں پر سے اپنے ہاتھ کے نشانات صاف کیے جہاں جہاں اسے چھونے کا گمان تھا۔ پھر اس نے ڈیک کا والیوم کم کر کے ڈیک پر سے اپنے ہاتھ کے نشان مٹا دیئے۔ تھوڑی دیر بعد وہ گھر سے نکلا۔ باہر گھپ اندھیرا تھا۔ پھر وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا گھاٹ کی طرف چل پڑا جہاں ایک کشتی اس کی منتظر تھی۔ اس کے دل کو بڑا سکون اور بڑی فرحت سی محسوس ہو رہی تھی کہ اس نے اپنے مشن کا آغاز شیطانوں کے گروہ کے ایک قاتل کو کیفر کردار تک پہنچا کر کیا تھا۔ بیس برس کے بعد یہ پہلی کامیابی تھی جس نے اس کے قدم چومے تھے۔

وقار حسین نے اپنی زندگی میں پہلی اور آخری محبت صرف نتاشا سے کی تھی۔ اس نے رقیہ خانم سے محبت کرنے کی کوشش کی تھی مگر رقیہ خانم نے کبھی اسے کچھ نہیں جانا تھا۔ اور نہ اس کی محبت کی قدر کی تھی۔ حالانکہ اس نے رقیہ خانم کے لئے کیا کچھ نہیں کیا تھا۔ آخر میں رقیہ خانم نے اس سے بڑی محبت کی اس کا دل جیتنے اور نتاشا کی جگہ لینے کی کوشش کی تھی لیکن رقیہ خانم کی یہ محبت فریب تھی۔ اس کی محبت میں وہ دھوکا کھا گیا تھا۔ رقیہ خانم نے اسے دشمن کے حوالے کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔ معلوم نہیں وہ اس سے کس بات کا انتقام لینا چاہتی تھی۔ اس کی بے وفائی کے داغ کے باوجود وہ اس کی تلاش میں تھا۔ انتقام لینے کیلئے نہیں بلکہ اسے سمجھانے' ڈائری حاصل کرنے اور دشمن کا قلع قمع کرنے کیلئے۔

☆……☆……☆

سپنا بیدار ہوئی تو اس کا سر بری طرح بھاری تھا اور آنکھوں میں انگارے چبھ رہے تھے۔ وہ اپنے کمرے میں تھی۔ وہ حیران تھی کہ گزشتہ شب اسے یہاں کون لایا ہوگا؟ کیا اس کی امی نے رات والی حالت تو نوٹ نہیں کی ہوگی۔ اس کا خود چل کر آنا سمجھ میں آنے والی بات نہ تھی اس لیے کہ رات اس کی سہیلی افروزہ نے شراب' دوا کہہ کر پلا دی تھی۔ یہ حرکت اس کی سہیلی نے اس لئے کی تھی کہ اس کا ذہن کچھ سوچنے اور سمجھنے کے قابل نہ رہے۔ اس بھیانک واقعے سے نجات حاصل کرنے کا یہی طریقہ تھا مگر وہ خواب آور گولیاں بھی تو کھا سکتی تھی۔ اس کے گھر میں خواب آور گولیوں کی ایک شیشی موجود تھی۔ کیونکہ اس کی امی کو بے خوابی کی شکایت تھی۔ وہ کسی کسی دن اس کا استعمال کرتی تھیں۔ اس نے جب سے ہوش سنبھالا تھا تب سے اپنی امی کو ان گولیوں کا عادی دیکھا تھا۔

وہ خود کو سنبھالتی ہوئی اٹھی اور اس نے سرہانے رکھی ہوئی اوڑھنی اٹھا کر اپنے جسم پر ڈال لی۔ پھر اپنی جلتی ہوئی آنکھوں کو اپنی ہتھیلیوں سے ملا۔ اس کے سامنے سنگھار میز تھی

اوراس کے بڑے آئینے میں اس کا چہرہ دکھائی دے رہا تھا۔ وہ اپنی صورت دیکھ کر ایک دم سے چونکی وہ برسوں کی مریض دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے چہرے پر غم اور کرب کے سائے لرزاں تھے۔ اس کی امی نے اسے اس کیفیت میں دیکھ لیا تو کیا سوچیں گی؟ اس نے وحشت زدہ ہوکر سوچا۔ وہ اپنے تیز اور نوکیلے سوالوں کے نیزوں سے اسے بری طرح چھلنی کر کے رکھ دیں گی۔ وہ ان کے ایک سوال کا بھی تسلی بخش جواب نہیں دے پائے گی۔

اس خیال نے اسے بری طرح جھنجوڑ کے رکھ دیا تھا۔ اسے اس حالت میں اپنی امی کے پاس نہیں جانا چاہیے۔ اسے رات کے واقعے کو تازہ نہیں کرنا چاہیے۔ اسے فوری طور پر چائے کی ایک پیالی اور ٹھنڈے پانی کے غسل کی ضرورت تھی۔ اس کے بغیر اس کی حالت کا سنبھلنا مشکل تھا۔ اس نے دیوار گیر گھڑی کی طرف دیکھا۔ سات بجنے میں بیس منٹ باقی تھے۔ اس کی امی اس وقت کاپیاں چیک کرتی تھیں یا پھر نوٹس تیار کرتی تھیں۔ اس نے اپنے کمرے سے نکل کر اپنی ماں کے کمرے کی طرف دیکھا۔ دبے پاؤں بڑھ کر اس نے جھانکا تو انہیں ایک کاپی پر جھکا ہوا پایا۔

وہ دبے پاؤں باورچی خانے کی طرف بڑھ گئی۔ اس نے دیکھا کیتلی گرم ہے اور اس میں دوتین کپ چائے بھی موجود ہے۔ اس کی ماں بھی بیڈ ٹی لیتی تھی۔ جب وہ چائے پی رہی تھی تب اس کی نظروں میں حیات اور راحیل کے چہرے گھومنے لگے۔ حیات نے شکیل کو صرف اس بات پر قتل کر دیا تھا کہ شکیل اس کی محبت کا دعویدار تھا۔ حیات اپنے دوست کو قتل کر کے فرار ہو گیا تھا۔ شکیل کے قتل کا سبب وہ اور اس کی سہیلی افروزہ کے سوا کوئی نہیں جانتا تھا۔ اس کا حسن و شباب وبال جان بن گیا تھا۔ یہ اس کیلئے پہلا قتل ہوا تھا۔ حالانکہ وہ ان دونوں میں سے کسی سے محبت نہیں کرتی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ قتل کا سبب کسی کے علم میں آئے۔ پولیس نہ صرف اس کا ناک میں دم کر دے گی بلکہ اخبارات ایک سکینڈل کھڑا کر دیں گے۔ حیات نے شہر سے فرار ہونے سے پہلے افروزہ کو ٹیلی فون پر بتایا تھا کہ اس نے کس لئے شکیل کو قتل کیا۔ وہ اتفاق سے رات کو افروزہ سے نوٹس لینے اس کے گھر گئی تھی جہاں یہ انکشاف اس پر بجلی بن کر گرا تھا۔ وہ غش کھا گئی تھی۔

اس نے چائے زہر مار کرنے کے بعد سوچا کہ اسے تالاب میں نہا لینا چاہیے۔ پھر وہ اپنے کپڑے لے کر تالاب پر پہنچی۔ گھر کے پیچھے یہ تالاب جھاڑیوں اور درختوں سے گھرا ہوا تھا اور اس کی ملکیت تھا۔ جب بہت سخت گرمی اور حبس ہوتا تھا وہ اور اس کی امی تالاب

میں بڑی آزادی، سکون اور اطمینان سے نہاتی اور تیرتی رہتی تھیں۔ اس طرح بڑا سکون اور فرحت سی محسوس ہوتی تھی۔

جس وقت وہ تالاب کے کنارے کھڑی اپنی چوٹی کھول رہی تھی تو اسے ایسا لگا تالاب کے پانی کی سطح پر شکیل کی لاش تیر رہی ہے۔ اس کے اندر دہشت کی ایک لہر اٹھی اور یکدم سارا جسم سن ہو گیا۔ وہ سراسیمگی کے عالم میں گھر کی طرف لپکی۔ گھر میں داخل ہو کر غسل خانے میں گھس گئی۔

سپنا نے جب سے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا تھا تب سے اس کا حسن اس کیلئے ایک پرابلم ہی رہا تھا۔ شباب کی حدود میں قدم رکھنے کے بعد تو وہ ایک قیامت بن گئی تھی۔ اس کی سیاہ آنکھیں بڑی بڑی اور روشن روشن سی تھیں۔ بہت لانبے سیاہ بال گھنے اور چمکیلے تھے۔ جسم چھریرا اور متناسب تھا۔ اس کی شخصیت کا سب سے نمایاں پہلو اس کا قد تھا۔ وہ پانچ فٹ آٹھ انچ کی تھی۔ متناسب بدن کی وجہ سے وہ اور لمبی دکھائی دیتی تھی۔ اس کے سرو قد نے اس کے حسن و شباب کی کشش میں غیر معمولی اضافہ کر دیا تھا۔ وہ اپنے حسن بے مثال کی وجہ سے بہت پریشان تھی۔ اس لئے کہ وہ جہاں سے گزرتی مردوں کی توجہ کا مرکز بن جاتی تھی۔ کالج میں لڑکے اس کی قربت کیلئے کوشاں رہتے تھے۔ ان تمام باتوں کے باوجود اس میں پندار حسن نہیں پیدا ہوا تھا۔ وہ معمولی اور قبول صورت سی لڑکیوں کو دیکھ کر سوچتی کاش! وہ بھی ان کی طرح ہوتی۔

قتل کا جو واقعہ پیش آیا اس نے اسے خوف میں مبتلا کر دیا تھا۔ پولیس نے اس لرزہ خیز قتل کو یونین کی سیاست کا شاخسانہ بنایا تھا۔ خود اس نے بھی یہی سمجھا تھا مگر حیات نے ٹیلی فون پر افروزہ کو اصل بات بتا دی تھی۔ اس کے دل میں ایک خوف دامن گیر تھا کہ حیات کو پولیس نے گرفتار کر لیا تو پھر اصل بات آشکارا ہو جائے گی۔ پھر یہ سوچ کر اس نے دل کو تسلی دی کہ یہ قتل اس نے تو نہیں کیا اور نہ کرایا ہے۔ اگر اس کیلئے دو لڑکے آپس میں خون خرابا کر بیٹھے تو اس میں اس کا کیا قصور۔ اس انکشاف سے زیادہ سے زیادہ یہ ہو گا کہ اس کی بدنامی ہی تو ہو گی۔ اسے پھانسی پر تو نہیں لٹکایا جائے گا۔

وہ شاور کے نیچے کھڑی بھیگتی اور سوچتی رہی۔ دروازے پر دفعتہً دستک ہوئی تو وہ چونک پڑی۔ اس کی امی کی تیز آواز سنائی دی۔ ''اتنی دیر سے نہا رہی ہو جلدی کرو وقت نکلا جا رہا ہے۔''

وہ تھوڑی دیر کے بعد غسل خانے سے باہر آئی تو اس نے اپنے آپ کو بے حد ہلکا پھلکا سا محسوس کیا۔ اس کے ذہن پر کوئی بوجھ نہ تھا مگر دل میں کوئی چیز نیزے کی انی کی طرح چبھتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ جلدی سے تیار ہو کر ناشتے کی میز پر پہنچی تو اس کی ماں بلقیس بانو اس کا انتظار کر رہی تھیں اور ان کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات دیکھ کر وہ دل میں خوف زدہ سی ہو گئی۔

سپنا کبھی کبھی اپنی ماں کے بارے میں بڑی سنجیدگی سے سوچتی تھی کہ اس کی ماں دوسری ماؤں سے یکسر مختلف کیوں ہے۔ اس نے ہمیشہ اپنی ماں کو ایک پہیلی کی طرح پایا تھا۔ وہ انہیں کسی خول میں بند محسوس کرتی تھی۔ وہ ماں کم استانی زیادہ تھیں۔ یہ اس کی ماں کی فطرت تھی کہ اس کے ساتھ سرد مہری سے پیش آتی تھیں۔ وہ اپنے جذبات و احساسات کا کوئی سرا ظاہر ہونے نہیں دیتی تھیں۔ وہ ہمیشہ پتھر کی طرح سخت اور سمندر کی طرح خاموش اور پر سکون نظر آتی تھیں۔ اس کے علاوہ اس کی ماں کی زندگی میں بڑا نظم و ضبط رکھ رکھاؤ پایا جاتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ہر چند اس نے اپنے باپ کو نہیں دیکھا تھا لیکن اسے کبھی اس بات کا احساس نہیں ہونے دیا گیا تھا کہ وہ باپ کے سائے سے محروم ہے۔ اس کی ماں کے مزاج میں جو سختی اور مردانہ پن تھا اس کے سہارے باپ کا رول بھی وہ خود ہی ادا کرتی تھیں۔ سکول سے لے کر کالج تک وہ واحد لڑکی تھی جو اپنی سہیلیوں کے گھروں میں منعقد ہونے والی تقریبات میں شرکت نہیں کر سکتی تھی۔ چاہے وہ محفل موسیقی ہو یا سالگرہ۔ اس کی ماں ان لڑکیوں سے سخت نفرت کرتی تھی جو شوخ، چنچل اور بناؤ سنگھار کی دلدادہ ہوتی تھیں، جو تعلیم سے زیادہ شوبزنس میں دلچسپی لیتی تھیں۔ اس کی ماں ایسی لڑکیوں کو بے ہودہ اور خراب لڑکیاں کہتی تھی۔ اگر اسے کبھی کالج سے گھر آنے میں تھوڑی دیر ہو جائے یا وہ بھولے سے کسی سہیلی کے ہاں چلی جائے تو وہ نہایت غصے اور برہمی سے اس کا استقبال کرتی تھی۔ پھر ماں کا موڈ سارا دن خراب رہتا تھا جب تک وہ دن میں دو تین بار ندامت کا اظہار نہ کر لے اور معافی نہ مانگ لے ان کا موڈ خراب رہتا تھا۔

وہ خود بھی جانتی تھی کہ اس کی ماں اس طرح سے کیوں پیش آتی اور نصیحتیں کرتی رہتی ہیں۔ اس لئے کہ آج کا ماحول بہت خراب ہے۔ لڑکوں سے میل جول اور گھروں میں ان کی آمد و رفت کو معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اس وجہ سے لڑکیاں انجانے راستوں پر دور نکل جاتی تھیں اور پچھتاوا ان کا مقدر بن جاتا تھا۔ ان کے پاس محض آنسوؤں کا خزانہ باقی رہ

جاتا تھا۔ اس کے علاوہ منشیات کی وباء کی لعنت بھی غیر محسوس انداز سے زہر کی طرح سرایت کر رہی تھی۔ اصل میں اس کی ماں کو اس کی بھلائی کا خیال تھا۔ وہ چاہتی تھیں کہ ان کی بیٹی مقرر کردہ اصولوں کے مطابق زندگی گزارے جب کہ خود سپنا چاہتی تھی کہ اسے اتنی آزادی ہو کہ وہ سکون سے سانس تو لے سکے۔

''سپنا! یہ تم کہاں کھو گئی ہو؟'' بلقیس بانو کی تیز آواز نے سے چونکا دیا۔ ''کیا تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ تمہارے چہرے سے ایسا لگ رہا ہے جیسے تم رات بڑی دیر سے سوئی ہو مگر میں نے جب تمہارے کمرے میں جھانکا تو تم گہری نیند سو رہی تھیں۔''

''جی...... جی میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' اس نے بات بنائی۔ اس کی ماں محلے کی ایک عورت کے ساتھ دن ڈوبنے کے بعد ہسپتال چلی گئی تھی اور دیر سے آنے کا کہہ کر گئی تھی۔ اس عورت کا ڈلیوری کیس تھا۔ وہ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر افروزہ کے ہاں گئی تھی اور ماں کی واپسی سے پہلے افروزہ نے شاید اپنی بہن کی مدد سے اسے یہاں پہنچایا تھا۔

''رات کے آخری پہر میری آنکھ کھل گئی تھی پھر میں سو نہ سکی تھی۔''

''تم کالج جاتے ہوئے میرے سکول میں میری چھٹی کی درخواست دے جانا۔ میں دو دن چھٹی کروں گی۔'' بلقیس بانو بولیں۔

''کیا آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے؟'' سپنا نے ان کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے تشویش سے پوچھا۔

''نہیں، میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' بلقیس بانو نے جواب دیا۔ ''پرکاش آنند کلکتہ سے دو تین دن کے بعد میری تصویریں لینے آنے والے ہیں۔ ان کا پچھلے ہفتے خط آیا تھا کہ ویزا مل گیا ہے۔ کچھ تصویریں جو ادھوری ہیں میں انہیں مکمل کر لینا چاہتی ہوں۔ رقم کی بھی سخت ضرورت ہے اور پھر پرکاش آنند سے اچھا خریدار کوئی نہیں ہے۔''

اس کی امی ایک بہترین مصورہ تھیں۔ اسے اس بات پر بڑی حیرت ہوئی تھی کہ انہیں شہرت کی ذرا بھی فکر نہیں تھی اور نہ ہی دلچسپی تھی۔ وہ ایک چھوٹے سے شہر میں گمنامی کی زندگی بسر کر رہی تھیں۔ پرکاش آنند سال میں تین چار مرتبہ ہندوستان سے کاروبار کے سلسلے میں آتا تھا۔ ان کی تصویروں کے منہ مانگے دام دے جاتا تھا۔ بڑی عجیب سی بات تھی۔ اس کی امی ان تصویروں پر اپنا نہیں بلکہ سپنا کا نام لکھتی تھیں۔ اس نے بھی اپنی ماں سے مصوری سیکھی تھی لیکن اسے موسیقی سے زیادہ دلچسپی تھی۔ اس نے ایک گٹار خرید کر رکھا ہوا تھا۔ وہ

مصوری سے زیادہ وقت موسیقی کیلئے دیتی تھی۔ اس کی ماں کا کہنا تھا کہ مصوری سے آدمی چاہے تو بہت کچھ کما سکتا ہے۔

سپنا کالج پہنچی تو اس نے وہاں کی فضا بڑی سوگوار دیکھی۔ شکیل کے قتل پر سارا کالج اداس تھا۔ وہ کالج کی فٹ بال ٹیم کا مانا ہوا کھلاڑی تھا۔ اس کی لاش پولیس نے پوسٹ مارٹم کے بعد واپس کر دی تھی۔ اس کا جنازہ ظہر کے وقت اٹھایا جارہا تھا اس لئے تیسرے پیریڈ کے بعد چھٹی ہو گئی تھی۔ افروزہ اسے قریبی ریسٹورنٹ کے ایک کیبن میں لے گئی۔ ان دونوں نے وہاں بیٹھ کر چائے پی۔ وہ افروزہ پر بگڑ گئی تھی کہ اسے شراب کیوں پلائی۔ افروزہ نے اسے بتایا کہ فوری طور پر شراب نہیں پلاتی تو اس کی ذہنی حالت بگڑ جاتی۔ پھر اسے افروزہ نے بتایا کہ حیات سرحد عبور کر کے کلکتہ پہنچ گیا۔ شاید وہ وہاں سے اڑیسہ یا نیپال چلا جائے گا۔ اب ساری زندگی لوٹ کر نہیں آئے گا۔ یہ بات اسے حیات کی بہن سے معلوم ہوئی تھی۔ حیات افروزہ کا کزن تھا۔ سپنا نے یہ سن کر سکون کا سانس لیا۔ اس کے دل میں جو ایک کانٹا تھا وہ نکل گیا تھا۔

وہ گھر پہنچی تو دروازہ بھڑا ہوا سا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ماں شاید دروازہ بند کرنا بھول گئی ہے۔ وہ اندر داخل ہوئی تو اسے باتیں کرنے کی آواز سنائی دی۔ اس کی ماں کہہ رہی تھی۔

''چمپا! سونیا سے کہو کہ سپنا کیلئے کوئی اچھا سا رشتہ ہو تو بتائے۔''

چمپا نے کہا۔ ''تم ایک استانی ہو کر اس انداز سے سوچ رہی ہو۔ ابھی اسے پڑھنے دو۔''

''وہ شادی کے بعد بھی اپنی تعلیم جاری رکھ سکتی ہے اگر اسے شوق ہوا تو ......''

بلقیس بانو بولیں۔ ''بات یہ ہے کہ میری صحت روز بروز گرتی جارہی ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ آنکھ بند ہونے سے پہلے اس کا گھر بسا دوں۔''

''تمہیں وہم ہو گیا ہے۔'' چمپا نے شوخی سے کہا۔ ''تم عمر میں مجھ سے تین برس بڑی ہو مگر میں تم سے دس برس بڑی دکھائی دیتی ہوں۔ تمہارا ایک بال بھی سفید نہیں ہوا ہے۔ چہرے پر ایک شکن تک نہیں آئی ہے۔ کہو تو میں سونیا سے کہہ کر تمہارے لئے رشتہ لگا دوں؟ تمہیں شوہر اور سپنا کو باپ مل جائے گا۔''

''چمپا میری بات کو مذاق میں مت ٹالو'' وہ بڑے کرب سے بولی۔ ''سپنا کا حسن

روز بروز خطرناک ہوتا جا رہا ہے۔ مجھے نجانے کیوں رات دن ایک انجانا خوف ڈستا رہتا ہے کہ کل کچھ ہو گا تو میں کیا کر سکوں گی۔ میں ایک عورت ہوں۔ اس ناتے اچھی طرح یہ بات سمجھتی ہوں کہ ایک عورت کیلئے سب سے مضبوط سہارا مرد کا ہوتا ہے۔''

''کیا تم اس معاشرے کیلئے بہترین مثال نہیں ہو کہ تم نے عورت ہوتے ہوئے تیز و تند حالات کا مقابلہ کیا۔ اپنی عزت اور بھرم کو قائم رکھا۔ کتنے مردوں نے تم سے شادی کی تمنا کی تھی۔ تم نے بھری جوانی میں کسی کا سہارا قبول نہیں کیا۔''

''تم کچھ بھی کہہ لو۔ میں نے سپنا کی شادی کا فیصلہ کر لیا ہے۔ میں اپنے آخری فرض سے سبکدوش ہو جانا چاہتی ہوں۔''

''اس کے لئے چودھری اور خوندکر گھرانوں کے رشتے آئے تھے تم نے انکار کر دیا تھا۔''

''مجھے ان کے اوباش لڑکے پسند نہیں آئے۔'' بلقیس بانو نے جواب دیا۔ ''میں سپنا کا ہاتھ ایسے لڑکے کے ہاتھ میں دینا چاہتی ہوں کہ وہ شریف ہو بھلے اس کا تعلق متوسط گھرانے سے ہو۔ مگر جو میری بیٹی کو سکھ سے رکھ سکے اور میں سکون سے مر سکوں۔ تم نہیں جانتی ہو چمپا! میں سپنا سے کتنا پیار کرتی ہوں۔ اگر وہ نہ ہوتی تو میں کب کی خودکشی کر کے زندگی کا خاتمہ کر لیتی۔''

سپنا کا دل ایک دم سے بھر آیا اور اس کی آنکھوں کے گوشے صاف و شفاف موتیوں سے بھر گئے۔ ماں کیلئے اس کے دل کے کسی کونے میں محبت کی شدید لہر اٹھی۔ آج اس پر منکشف ہوا تھا کہ ماں اسے دل کی اتھاہ گہرائیوں سے چاہتی ہے مگر ماں نے کبھی اپنی اس محبت کا اظہار اس پر نہیں کیا تھا۔ آخر وہ اپنی محبت کہاں چھپاتی تھی۔

☆......☆......☆

سپنا آج کالج سے دو پیریڈ پہلے ہی نکل آئی۔ آج پرکاش آنند تصویریں لینے کلکتہ سے آنے والا تھا۔ ماں نے اسے دوپہر کے کھانے پر مدعو کیا ہوا تھا۔ وہ جلد سے جلد گھر پہنچ کر ماں کا ہاتھ بٹانا چاہتی تھی۔ اس نے کالج سے نکل کر کچھ فاصلہ طے کیا تھا ایک اجنبی مردانہ آواز نے اسے پکارا۔

''سنئے؟''

وہ ایک دم سے ٹھٹک کر رک گئی۔ اس کی آواز میں کوئی سحر تھا جس نے اس کے

قدم روک لئے۔ اوباش مرد اور لڑکے اسے کبھی چھیڑتے‘ فقرے کستے اور آواز دیتے تو وہ رکتی نہیں تھی اور نہ ہی پلٹ کر دیکھتی تھی۔ مگر آج اب وہ پلٹ کر دیکھنے پر مجبور ہوگئی۔ اس نے ایک شخص کو اپنی طرف تیزی سے آتے دیکھا۔ وہ شاید اس گاڑی سے اترا تھا جو کچھ قدم پر سڑک کے کنارے کھڑی تھی۔

سپنا ایک لمحے کیلئے اس شخص کو دیکھتی رہ گئی۔ خود فراموشی کی حالت میں وہ کوئی جوان مرد نہیں تھا۔ ساٹھ باسٹھ برس کا دراز قد شخص تھا۔ اس کے سر کے بالوں اور قلموں میں سے سفید بال جھانک رہے تھے اور اس کی وجاہت میں اضافہ کر رہے تھے۔ وہ پروقار شخصیت کا مالک لگ رہا تھا۔ اس شخص نے اسے جیسے ہپناٹائز کر دیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں میلا پن نہیں تھا۔ وہ پہلی بار دیکھ رہی تھی۔

وہ اسے اپنی عقاب جیسی آنکھوں سے دیکھتا ہوا آ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں میلا پن نہیں تھا صرف ایک عجیب تجسس جھلک رہا تھا۔ سپنا کو دوسرے لمحے نجانے کیوں ایسا محسوس ہوا کہ جیسے وہ اسے جنم جنم سے جانتی ہو۔ ذہن کے تاریک گوشوں میں کہیں اس کا ایک دھندلا سا نقش موجود ہے۔ اس شخص سے اس کا کوئی رشتہ ناتا ہے۔

اس شخص نے قریب پہنچ کر بڑے صاف وشائستہ لہجے میں کہا۔ ”آپ برا نہ مانیں تو میں آپ سے کچھ عرض کرسکتا ہوں۔“

”جی۔“ سپنا کا دل بڑی تیزی سے دھڑکنے لگا۔

”مجھے کچھ معلومات حاصل کرنا ہیں۔“ اس نے بڑی شائستگی سے کہا۔ ”یہاں کھڑے ہو کر بات کرتے ہوئے اچھا نہیں معلوم ہو رہا ہے۔ سامنے والے ریسٹورنٹ میں چل کر بیٹھتے ہیں۔ میں آپ کے صرف پانچ سات منٹ لوں گا۔“

اس نے راہ گیروں کی تجسس بھری اور کینہ توز نگاہیں اپنے بدن میں چبھتی ہوئی سی محسوس کیں۔ اس نے ایک لمحے کیلئے سوچا کہ کیا حرج ہے اس سے تھوڑی دیر ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر باتیں کر لے۔ یہ کوئی جوان لڑکا تو ہے نہیں اس کے باپ کی عمر کا ہے اور پھر اجنبی ہے مہذب‘ شریف اور شائستہ مزاج بھی ہے۔ وہ بادل نخواستہ بولی۔

”چلئے۔“

وہ دونوں سامنے والے ریسٹورنٹ کے اندر ایک فیملی کیبن میں آ بیٹھے۔ مرد نے اس کے منع کرنے کے باوجود آئس کریم‘ فالودہ کا آرڈر دے دیا تھا۔ ویٹر چلا گیا تو اس نے

کہا۔ ''میں اس شہر میں ایک عورت کی تلاش کر رہا ہوں جس کا نام رقیہ خانم ہے۔''

''رقیہ بیگم؟'' وہ زیر لب مسکرا دی۔ ''اس شہر میں ایسی تین لڑکیوں اور چار عورتوں کو میں جانتی ہوں جن کے نام رقیہ بیگم ہیں۔ اس نام کی نجانے کتنی اور عورتیں ہوں گی۔ آپ کس رقیہ بیگم کے بارے میں پوچھ رہے ہیں۔''

''میں رقیہ بیگم نہیں بلکہ رقیہ خانم نام کی عورت کو تلاش کر رہا ہوں۔'' اس نے تصحیح کی۔

''آئی ایم ساری۔'' سپنا ساڑی کا پلو سنبھالتے ہوئے خفت سے بولی۔ ''اس نام کی ایک لڑکی رقیہ خانم میری کلاس فیلو ہے۔ دوسری عورت ایک لیڈی ڈاکٹر ہے۔ لال داس لین۔۔ اس کی اپنی ذاتی ڈسپنسری ہے۔''

''کیا وہ شادی شدہ ہے؟''

''جی ہاں۔'' سپنا نے اپنا خوشنما سر ہلایا۔ ''اس کے دو لڑکے پہلے شوہر سے ہیں۔ تین لڑکیاں موجودہ شوہر سے ہیں۔''

ویٹر آئس کریم فالودہ لے آیا۔ جب وہ چلا گیا تو اس شخص نے کہا۔ ''مجھے دراصل ایک ایسی رقیہ نام کی عورت کی تلاش ہے جو اس وقت چالیس بیالس برس سے زیادہ کی نہ ہو گی۔ اس کے سر کے بال اب تک سفید ہو گئے ہوں گے۔ جوانی میں بہت خوبصورت اور پرکشش عورت تھی۔ اب بھی شاید اس میں دل کشی ہو۔ آپ میں اس کی کچھ کچھ شباہت پائی جاتی ہے۔ بائی داوے آپ کی والدہ کا نام کیا ہے؟''

''میری والدہ کا نام بلقیس بانو ہے۔'' سپنا نے جواب دیا۔ ''شاید میری امی یا ان کی سہیلی سونیا اس رقیہ خانم کو جانتی ہوں۔ آپ میرے گھر چلئے میں آپ کو اپنی امی سے ملائے دیتی ہوں۔ یہ رقیہ خانم ہیں کون؟''

''آپ کی امی کیسے جانتی ہوں گی؟ آپ کی امی کی سہیلی کیا کرتی ہیں؟'' اس شخص نے تجسس سے پوچھا۔ ''میں کسی اور دن آؤں گا۔''

''میری امی لڑکیوں کے ایک سکول میں ہیڈ مسٹریس ہیں۔ سونیا آنٹی سوشل ورکر کے دفتر میں کام کرتی ہیں اور سائیڈ میں رشتے لگانے کا کام کرتی ہیں۔ وہ دونوں اس شہر کی تقریباً تمام عورتوں کو جانتی ہیں۔''

''مجھے تھوڑی دیر میں ایک ضروری کام سے کھلنا شہر جانا ہے۔'' مرد نے کہا۔

''میں شاید دو ایک دن میں واپس آؤں آپ اپنی امی سے ذکر کر رکھئے گا۔ اس رقیہ خانم کے بارے میں اتنا بتا دوں کہ وہ اس شہر میں اکیلی رہتی ہو گی۔ گزر اوقات کیلئے شاید اس نے کوئی انڈسٹریل ہوم کھول رکھا ہو گا کیونکہ اس میں اس نے ڈپلومہ لیا ہوا تھا۔''

وہ دونوں تھوڑی دیر بعد ریسٹورنٹ سے نکلے۔ اس شخص نے اسے اپنی گاڑی میں لفٹ کی پیشکش کی تو اس نے شکریے کے ساتھ انکار کر دیا اور کہا کہ اس کا گھر یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔ آٹھ دس منٹ کا پیدل راستہ ہے۔ اس کے علاوہ اس کی امی اور محلے والے اسے ایک اجنبی مرد کے ساتھ گاڑی میں دیکھ کر نجانے کیا سوچیں۔ خواہ مخواہ چہ میگوئیاں ہوں گی۔ وقت کچھ ایسا ہے کہ لوگ ہر بات کو شک کی نظر اور ایک مختلف زاویے سے دیکھتے ہیں۔ میری امی ایک سخت گیر خاتون ہیں۔ وہ ناراض ہو جائیں گی۔'' اس نے بڑی صاف دلی اور معصومیت سے دل کی باتیں کہہ دی تھیں۔

وہ شخص دل کش انداز میں مسکرا دیا۔ ''آپ جتنی خوبصورت ہیں آپ کی باتیں بھی اتنی خوبصورت اور معصومانہ ہیں۔ آپ کی امی کا سخت مزاج فطری ہے۔ اس لئے کہ وہ ایک استانی جو ٹھہریں۔''

جب وہ دونوں اپنی اپنی سمت جانے لگے تو اس شخص کو ایک دم سے کچھ یاد آیا۔ اس نے پلٹ کر کہا۔

''سنئے۔''

اس کی آواز سن کر سپنا رک گئی اور اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی تو وہ بولا۔ ''کتنی عجیب بات ہے کہ ہم اتنی دیر بیٹھے رہے، بہت ساری باتیں کیں مگر ایک دوسرے کا تعارف نہ ہو سکا۔ آپ نے اپنا نام نہیں بتایا۔ آپ کا نام کیا ہے؟''

''مس سپنا مشتاق چودھری۔'' اس نے آہستگی سے کہا۔

''میرا نام فرقان احمد ہے۔'' مرد نے اپنا نام غلط بتایا۔ اس نے کسی وجہ سے ایسا کیا تھا۔ ''آپ سے جلد ملاقات ہو گی۔''

وہ اپنی گاڑی میں بیٹھ کر مشرق کی سمت چلا گیا۔ سپنا شمال کی سمت بڑھنے لگی۔ سارا راستہ وہ اس اجنبی کے بارے ہی میں سوچتی رہی تھی۔ اسے فرقان احمد بہت مہذب شخص لگا تھا۔ فرقان احمد نے اس سے جس خلوص اور اپنائیت سے باتیں کی تھیں اس نے دل موہ لیا تھا۔ اس شخص کی دل کش شخصیت اور باتیں اس کے دل و دماغ پر چھا کر رہ گئی تھی۔ وہ زندگی

میں کسی شخص سے اس قدر متاثر نہ ہوئی تھی۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کا اس شخص سے کوئی رشتہ ہے۔ پاکیزہ، گہرا اور اچھوتا رشتہ۔ ایک ایسا رشتہ جسے وہ خود سمجھنے سے قاصر ہے۔

سپنا گھر پہنچی تو اس نے اپنی ماں کو باورچی خانے میں مصروف دیکھا۔ پرکاش آنند تصویریں لینے ابھی نہیں آیا تھا۔ وہ کپڑے بدل کر باورچی خانے میں آئی تاکہ اسے فرقان احمد کے بارے میں بتائے اور پوچھے کہ کیا وہ کسی ایسی رقیہ خانم نامی عورت کو جانتی ہیں جو بیس برس پہلے ڈھاکہ شہر سے یہاں آئی اور اکیلی رہ رہی ہو مگر اسے بات کرنے کا موقع نہیں ملا۔ اس لئے کہ اسی وقت پرکاش آنند آ گیا تھا۔ اس نے اسے نشست گاہ میں لے جا کر بٹھایا اور اس سے باتیں کرنے لگی۔

کھانے سے فراغت پانے کے بعد پرکاش آنند نے نو تصویریں خرید لیں۔ بلقیس بانو بہت خوش دکھائی دے رہی تھیں۔ اس مرتبہ تصویریں بھی بہت اچھی بنی تھیں اور دام بھی اچھے ملے تھے۔ پرکاش آنند نے رخصت ہونے سے پہلے ماں بیٹی کو ہندوستان آنے کی دعوت دی۔ انہیں بتایا کہ طعام اور رہائش ان کیلئے کوئی مسئلہ نہ ہو گا۔

سپنا برتن دھو کر اور باورچی خانہ ٹھیک کر کے ماں کے کمرے میں آئی تو اس نے دیکھا وہ بستر پر بے سدھ پڑی تھیں اور گہری نیند میں غرق تھیں۔ تھکن سے چور لگ رہی تھیں۔ بستر پر وہ اور ان کا لباس بھی بے ترتیب ہو رہا تھا۔ اس نے چونک کر انہیں اس طرح سے دیکھا جیسے وہ پہلی بار ناقدانہ نظروں سے دیکھ رہی ہو۔ وہ اسے ماں نہیں بلکہ بڑی بہن کی طرح دکھائی دیتی تھیں۔ کبھی کبھی وہ شوخ کپڑے پہن لیتیں تو انہیں دیکھ کر کسی دوشیزہ کا دھوکا ہوتا۔ سپنا نے آج پہلی مرتبہ سوچا کہ جب اس کی امی بھری جوانی میں بیوہ ہو گئی تھیں تو انہوں نے دوسری شادی کیوں نہیں کی۔ وہ اپنی جوانی میں کسی قیامت سے کم نہیں رہی ہوں گی۔ وہ مردوں کے دلوں پر بجلیاں گراتی ہوں گی ان سے نجانے کتنے مردوں نے شادی کی کوشش کی ہو گی مگر انہوں نے ہی تمام رشتوں کو ٹھکرا دیا ہو گا۔

اس کے دل میں ایک آوارہ سا خیال آیا کہ اگر فرقان احمد نے اس کی امی کو دیکھ کر پسند کر لیا اور شادی کی درخواست کی تو کیا امی اس سے شادی کر لیں گی پھر وہ اپنے اس احمقانہ خیال پر ہنس پڑی۔ اس نے سوچا فرقان احمد اس کی امی سے بھلا شادی کیوں کرنے لگے۔ انہیں تو رقیہ خانم کی تلاش ہے۔ وہ شاید اس سے شادی کریں۔

سپنا نے سہ پہر کے وقت اپنی ماں کو دیکھا۔ آج وہ بہت خوش دکھائی دے رہی

تھیں۔ ان کا موڈ بہت اچھا تھا۔ اس نے بہت دنوں کے بعد انہیں اس قدر مسرور دیکھا تھا۔ وہ صحن میں بیٹھی ہوئی مصوری کا ایک رسالہ الٹ پلٹ کر دیکھ رہی تھیں۔ آج اسے بھی یہ ستمبر کی شام بہت حسین معلوم ہوئی۔ وہ چائے بنا کر اور لے کر صحن میں پہنچی۔ اس نے ایک پیالی انہیں دی۔ دوسری پیالی خود لے کر بیٹھ گئی۔ اس نے چند لمحوں کے بعد چائے کا ایک گھونٹ حلق سے اتارتے ہوئے کہا۔ ''امی آج ایک بڑی عجیب سی بات ہوئی۔''

''کیا ہوا تھا؟'' بلقیس بانو نے اس کی طرف دیکھے بغیر چائے پیتے ہوئے پوچھا۔

''ایک اجنبی شخص نے سرراہ مجھ سے دریافت کیا تھا کہ کیا آپ رقیہ خانم نامی عورت کو جانتی ہیں؟'' سپنا نے دانستہ ریسٹورنٹ کا ذکر گول کر دیا تھا۔

''کیا کہا؟ وہ رقیہ خانم کے بارے میں دریافت کر رہا تھا؟'' بلقیس بانو ایک دم سے اس طرح اچھل پڑی جیسے انہیں بجلی کا جھٹکا لگا ہو۔ ان کے ہاتھ سے چائے کی پیالی چھوٹ کر فرش پر گری تو وہ ٹوٹ کر بکھر گئی۔ چائے ان کے کپڑوں اور رسالے پر بھی گر گئی تھی۔ ان کا چہرہ سفید پڑتا چلا گیا۔

''امی!'' سپنا ایک دم سے گھبرا گئی۔ وہ دل میں بڑی حیران ہوئی کہ رقیہ خانم کا نام سن کر اس کی ماں دہشت زدہ کیوں ہوگئی ہیں۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ بلقیس خانم رسالہ میز پر رکھ کر کھڑی ہوگئیں اور اپنے کپڑے جھاڑنے لگیں۔ ''آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟''

''معلوم نہیں کیوں چکر سا آ گیا تھا۔'' بلقیس بانو نے خود کو سنبھالتے ہوئے جواب دیا۔ ''تم میرے لئے ایک کپ چائے بنا دو میں اتنی دیر میں کپڑے بدل کر آتی ہوں۔''

سپنا نے جلدی سے اس کی کرچیاں سمیٹیں۔ جھاڑو دی۔ فرش اور میز صاف کی۔ باورچی خانے میں جا کر کیتلی چولہے پر چڑھا دی۔ اس کی ماں کو کپڑے بدل کر آنے میں پورے بیس منٹ لگ گئے تھے۔ کپڑے بدلنے میں اتنی دیر تو نہیں لگتی ہے۔ ماں نے صرف ساڑھی بدلی تھی۔ اس نے دیکھا ماں کا چہرہ زرد سا ہو رہا ہے اور آنکھوں سے ایک عجیب سی وحشت جھانک رہی ہے۔

''وہ شخص کون تھا اور کیا پوچھ رہا تھا۔'' بلقیس بانو نے اپنی پلکیں جھپکائیں۔ سپنا کو ان کی آواز سن کر ایسا لگا جیسے وہ خالی کمرے میں بول رہی ہوں۔ کھوکھلا اور ویران لہجہ مگر بیٹھی ہوئی تیز آواز میں ان کے مزاج کی سخت گیری کا انداز جھلک رہا تھا۔

''اس نے پوچھا تھا کہ اس شہر میں رقیہ خانم نام کی کوئی ایسی عورت رہتی ہے جو تنہا ہو اور کوئی انڈسٹریل ہوم چلا رہی ہو۔ اس کے بچے نہ ہوں۔ شوہر بھی نہ ہو۔''

''اس نے یہ ساری باتیں تم سے کیوں پوچھی تھیں؟'' بلقیس بانو نے اسے مشکوک نظروں سے گھورا۔ ''کیا اس شہر میں اسے کوئی اور لڑکی دکھائی نہیں دی؟''

''اس لئے کہ اسے مجھ میں رقیہ خانم کی کچھ مشابہت محسوس ہوئی تھی۔''

بلقیس بانو چونک سی پڑیں۔ انہیں اپنے گلے میں گولہ سا پھنستا محسوس ہو رہا تھا۔

''وہ شخص کیسا تھا؟ اپنی وضع قطع اور چہرے مہرے سے بدمعاش تو نہیں لگ رہا تھا؟''

''وہ بڑا باوقار، سمارٹ، خوبصورت، وجیہہ اور شائستہ مزاج شخص تھا۔'' وہ اپنی رو میں کہتی گئی۔ ''دراز قد تھا، اس کی عمر ساٹھ برس کے لگ بھگ ہو گی۔ وہ کوئی بڑی شخصیت دکھائی دے رہا تھا۔''

''میں نے تم سے تفصیلات نہیں پوچھی تھیں۔'' بلقیس بانو نے سخت لہجے میں کہا۔

''اس نے اپنا نام بتایا تھا؟''

''جی ہاں فرقان احمد بتایا تھا۔''

''اس نے تمہارا اور میرا نام بھی پوچھا تھا۔'' بلقیس بانو نے ڈوبتے لہجے میں پوچھا۔

''جی...... میں نے اسے اپنا اور آپ کا نام ہی بتایا تھا۔ اسے یہ بھی بتایا کہ آپ ایک سکول میں ہیڈ مسٹریس ہیں۔''

''تمہیں اس سے بات کرنے اور اتنا کچھ بتانے کی کیا ضرورت تھی۔'' وہ بگڑ گئیں۔ ''تم پرلے درجے کی احمق ہو۔ آج کی لڑکیوں کی طرح تیز طراری اور ہوشیاری بالکل ہی نہیں ہے۔ کیا تم نے اسے اپنے باپ کا نام بھی بتایا تھا؟''

''میں نے اسے اپنا نام مس سپنا مشتاق چودھری بتایا تھا۔ اس نے اس طرح میرے والد کا نام جان لیا۔''

اس نے محسوس کیا کہ ماں کے چہرے پر کرب چھا گیا ہے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ماں اس اجنبی شخص کا ذکر سن کر اس قدر پریشان اور دہشت زدہ سی کیوں ہو گئی ہے۔

☆......☆......☆

پاکستان ڈائجسٹ

''فرقان احمد؟'' بلقیس بانو کی آواز سپنا کو کنویں کی تہہ سے آتی سنائی دی۔ اس نے دیکھا ماں کے چہرے پر کرب چھا گیا اور ان کی پیشانی پر گہری سلوٹیں پڑ گئیں جیسے ان کے دل کو بڑی اذیت ہو رہی ہو۔ سپنا بے حد حیران و پریشان بیٹھی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس اجنبی کا ذکر سنتے ہی ماں اس قدر دہشت زدہ کیوں ہو گئی اور پھر اس اجنبی کا حلیہ سنتے ہی ان کا مزاج یک لخت مزید بگڑ گیا تھا۔ وہ اس وقت اس کے بارے میں کیا سوچ رہی ہیں؟

''سپنا!'' وہ سوچوں کی دنیا سے نکل کر اس کی طرف دیکھنے لگیں۔ ان کا لہجہ ٹوٹا ہوا تھا۔ ''تم اس شخص کا ایک رف اسکیچ ابھی مجھے بنا کر دکھاؤ۔ میں دیکھوں تو سہی۔''

سپنا اپنے کمرے میں گئی۔ اس نے ایک سفید فل اسکیپ کاغذ پر پنسل سے فرقان احمد کا ایک رف اسکیچ بنایا۔ تھوڑی دیر بعد وہ ان کے پاس لے کر پہنچی۔ بلقیس بانو نے اس کے ہاتھ سے اسکیچ لے کر دیکھا تو کاغذ ان کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ ان کا چہرہ پھر ایک بار زرد پڑ گیا۔

''امی! کیا بات ہے؟ کیا آپ فرقان احمد کو جانتی ہیں؟'' سپنا نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ اس نے فرش پر سے کاغذ اٹھا لیا۔

''ہاں۔'' بلقیس بانو نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔ اب انہیں اپنے جذبات کے بے قابو ہونے کا احساس ہونے لگا تھا۔ ''ہاں۔'' وہ چند لمحوں کے بعد خود پر قابو پا کے اور گہری سانس لے کر بولیں۔ ''یہ شخص تمہارے باپ کا قاتل ہے۔''

''کیا؟'' سپنا کو ایسے لگا جیسے اس کے سینے میں کسی نے کوئی تیز چھری اتار دی ہو۔ نجانے کیوں اسے یقین نہیں آیا۔ اس شخص کی صورت اس کی نظروں میں گھومنے لگی۔ اس کی صورت ہی پیاری نہیں تھی اس کی باتیں بھی دل موہ لینے والی تھیں۔ اس کی زبان سے

نکلنے والا ہر لفظ سات سروں کی طرح تھا۔ ایسا شخص قاتل کیسے ہوسکتا ہے۔ اس نے تکرار کی۔

’’نہیں امی! وہ شخص شریف النفس اور بڑا مہذب لگ رہا تھا۔ قاتل ایسے تھوڑی ہوتے ہیں؟ ان کے چہرے اور آنکھوں سے سفاکی اور درندگی جھلکتی ہے۔‘‘

’’کیا تمہیں میری بات کا یقین نہیں آ رہا ہے۔‘‘ وہ برہم ہو کر بولیں۔ سپنا ان کی شعلہ بار آنکھیں دیکھ کر سہم گئی۔ وہ ایک دم سے مشتعل ہو گئی تھیں کچھ اس طرح کہ فرقان احمد سامنے آ جاتا تو وہ اسے قتل کر بیٹھتیں۔ ان کی یہ حالت زیادہ دیر برقرار نہ رہی۔ ’’کیا میں کبھی تمہارے باپ کے قاتل کو بھول سکتی ہوں؟ ہرگز نہیں۔ اس خبیث شخص نے میرا گھر اور سہاگ اجاڑ دیا۔ تمہیں یتیم اور بے سہارا کر دیا۔ اس کا نام فرقان احمد نہیں ہے۔ وقار حسین ہے۔ وہ نہیں چاہتا ہے کہ نام سے اس کی شناخت ہو جائے۔‘‘

’’مگر امی آپ نے تو مجھ سے کئی بار کہا تھا کہ میرے ابو کی موت گاڑی کے ایک حادثے میں واقع ہوئی تھی۔‘‘ سپنا نے کہا۔ ’’شاید آپ نے مجھے ایک مرتبہ اخبار کی ایک کٹنگ بھی دکھائی تھی جس میں ابو کے حادثے کی خبر درج تھی۔‘‘

’’اس سفاک اور بے رحم قاتل نے تمہارے باپ کو گاڑی سے کچل کر ہلاک کیا تھا اور فرار ہو گیا تھا۔‘‘ وہ نفرت اور غصے سے بولیں۔

’’یہ رقیہ خانم کون ہے جس کی تلاش میں وہ یہاں آیا ہے۔‘‘ سپنا کو اس شخص کا اصل روپ جان کر صدمہ ہوا تھا۔

’’رقیہ خانم اس کی بیوی اور میری بچپن کی سہیلی ہے۔‘‘ بلقیس خانم اس سے کہنے لگی۔ ’’جس وقت وقار حسین نے تمہارے باپ کو قتل کیا تھا وہ اس وقت گاڑی میں اس کے ہمراہ موجود تھی۔ وہ اس المناک قتل کی عینی گواہ ہے۔ اس نے اپنے شوہر سے کہا تھا کہ وہ اپنے آپ کو قانون کے حوالے کر دے۔ وقار حسین نے انکار کر دیا تھا۔ تب اس نے دھمکی دی تھی کہ وہ پولیس کو بتا دے گی۔ اس بات پر وقار حسین اس کی جان کا دشمن ہو گیا اور وہ فرار ہو گئی۔ وقار حسین اس عینی گواہ کو صفحہ ہستی سے مٹانے کیلئے اسے تلاش کر رہا ہے۔‘‘

’’مگر یہ تو بیس برس پہلے کی بات ہے۔ کیا رقیہ خانم نے پولیس میں اس کے خلاف رپورٹ درج نہیں کرائی تھی؟‘‘

’’رقیہ خانم موت کے خوف سے کلکتہ فرار ہو گئی اور وقار حسین گرفتاری اور پھانسی کی سزا پانے کے خوف سے بیرون ملک نکل گیا۔ وہ بیس برس بعد یہاں پھر سے زندگی گزارنے

آیا ہے۔ وہ یہ چاہتا ہوگا کہ رقیہ خانم کو تلاش کر کے اسے موت کے گھاٹ اتار دے تا کہ سکون واطمینان کی زندگی گزار سکے۔ اس لئے وہ اسے کسی شکاری کتے کی طرح تلاش کرتا پھر رہا ہے۔''

''کیا آپ جانتی ہیں کہ رقیہ خانم کہاں ہے؟ کیا وہ زندہ ہیں؟''

''رقیہ خانم کلکتہ جانے کے بعد پھر کبھی نہیں لوٹی اور نہ ہی مجھے اس کی کوئی خبر ہے کہ وہ زندہ ہے یا مرگئی ہے۔''

''مگر آپ اس شخص کی وجہ سے اس قدر خوف زدہ اور پریشان کیوں ہیں؟'' سپنا نے حیرت سے پوچھا۔

''اس لئے کہ وہ مجھے بھی نقصان پہنچا سکتا ہے کہ میں رقیہ خانم کی سہیلی ہوں اور اس کے خلاف گواہی دے سکتی ہوں۔''

''مگر اسے کیا معلوم کہ آپ ہی رقیہ خانم کی سہیلی بلقیس بانو ہیں۔''

''اس نے تمہارے باپ کے نام سے معلوم کرلیا ہوگا کہ تم میری بیٹی ہو۔'' بلقیس بانو نے بکھرے ہوئے لہجے میں اپنا خدشہ ظاہر کیا۔ ''دنیا میں ایسا اتفاق کم ہوگا کہ دو ہم نام عورتوں کے شوہروں کے نام بھی ایک ہی ہوں۔''

''مگر اس نے میرے ابو کے بارے میں نہ تو کچھ پوچھا اور نہ ہی میں نے اسے بتایا کہ وہ زندہ ہیں یا وفات پا چکے ہیں۔''

''ممکن ہے کسی وجہ سے اس وقت اس نے کوئی دھیان نہیں دیا ہو۔'' وہ بولیں۔ ''اب خطرے کی گھنٹی بج چکی ہے۔ کچھ دنوں کیلئے ہمیں کسی اور شہر میں جا کر روپوش ہو جانا ہو گا۔''

''اگر وہ وہاں بھی پہنچ گیا تو کیا ہوگا؟'' سپنا نے تشویش کے لہجے میں کہا۔ ''اور پھر آئندہ ماہ میرے امتحان بھی ہونے والے ہیں۔''

''اس سال امتحان نہیں دوگی تو زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا نا کہ ایک سال خراب ہو جائے گا۔'' بلقیس بانو نے برہمی سے کہا۔ ''تمہیں اس بات کا ذرا بھی احساس نہیں ہے یہاں جان پر بنی ہے۔ وہ ہم دونوں ہی کو قتل کر دے گا۔''

''مگر ہم کہاں روپوش رہ سکیں گے؟ ہر جگہ اس کا خطرہ منڈلاتا رہے گا۔'' سپنا اپنی ماں کے چہرے پر سختی دیکھ کر سہم گئی۔

''ہم کلکتہ پرکاش آنند کے پاس چلے جائیں گے۔'' یکبارگی اس خیال سے بلقیس بانو کا چہرہ دمک اٹھا۔''ہو سکے تو ہم سال ڈیڑھ سال کا عرصہ بڑے سکون واطمینان سے گزار کر واپس آ سکتے ہیں۔ اس عرصے میں وقار حسین ہمیں تلاش نہ کر سکے گا اور ناکام ہو کر بیٹھ جائے گا۔ کلکتہ میں گزر معاش کیلئے ہم دونوں تصویریں بنائیں گے۔ پرکاش آنند ہماری مدد کریں گے۔''

''تین مہینے سے زیادہ کا ویزا ملنا مشکل ہے۔ ہم وہاں سال بھر تک کیسے رہ سکیں گے؟''

''ہم کسی دلال کی مدد سے ایک ہزار ٹاکا دے کر کلکتہ چلے جائیں گے۔'' بلقیس بانو بولیں۔''کبھی کبھار پرکاش آنند بھی تو اس طرح آتے ہیں۔ جب تم بہت چھوٹی تھیں میں دو مرتبہ اس طرح کلکتہ جا چکی ہوں۔ جعفر دلال کی بیٹی میرے سکول میں پڑھتی ہے۔ میں اس سے بات کرلوں گی۔ وہ پانچ سو ٹاکا میں ہمیں پہنچا کر آ جائے گا۔''

''پھر ہم کب چلیں گے؟'' سپنا نے اپنی پلکیں جھپکائیں۔

''دو دن کے اندر اندر.....'' وہ سرگوشی کے انداز میں کہنے لگیں۔''اس بات کی کسی کو بھی ہوا نہ لگے۔ روانگی والے دن ہم یہ کہہ کر جائیں گے کچھ عرصہ کیلئے ڈھاکہ جا رہے ہیں۔ اس مکان کی چابی ہم مسجد کے پیش امام تنزیل الرحمان کو دے جائیں گے۔''

مغرب کی اذان ہونے لگی تو بلقیس بانو ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ انہوں نے اپنی بیٹی کو متفکر اور پریشان پایا تو ملائمت سے بولیں۔''کوئی ضروری نہیں کہ ہم ہندوستان میں سال ڈیڑھ سال رہیں۔ ایک دو مہینے میں واپس آ جائیں گے۔ میں جعفر دلال کے ہاں جا رہی ہوں واپسی میں دیر ہو تو گھبرانا نہیں۔ دروازے اور کھڑکیاں اچھی طرح سے بند کر کے رکھنا۔ وقار حسین کا کوئی بھروسہ نہیں۔ شاید وہ اس شہر میں ہو۔''

بلقیس بانو گھر سے نکلیں تو اس نے دروازہ اندر سے بند کیا اور اپنے کمرے میں آ کر بستر پر گر گئی۔ کیا سچ تھا کیا جھوٹ تھا اس کا ذہن ان باتوں کو سمجھنے سے قاصر تھا۔ اس کا دھڑکتا ہوا پریشان دل اس بات کو تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھا کہ وقار حسین اس کے باپ کا قاتل ہے لیکن کیسی عجیب اور اچنبھے کی بات تھی کہ اس نے اپنے باپ کو نہیں دیکھا اس لئے کہ اس کے باپ کی زندگی جب المناک حادثے کی نذر ہوئی تھی اس کا وجود دنیا میں نہیں آیا تھا مگر اس نے اپنے باپ کی تصویریں بھی نہیں دیکھی تھیں۔ اس کی ماں کے پاس باپ کی

ایک تصویر بھی نہ تھی۔ ایک مرتبہ جب وہ بارہ تیرہ برس کی تھی تو کاغذ پر اس کی ماں نے باپ کا ایک رف اسکیچ بنا کر دکھایا تھا اور اسے فوراً پھاڑ بھی دیا تھا۔ جیسے اس نے اپنی زندگی کی فاش ترین غلطی کی ہو۔ اس نے ماں سے پوچھا تھا۔ ''آپ نے یہ کاغذ کیوں پھاڑ دیا؟''

''اس لئے کہ مجھے تمہارے باپ سے سخت نفرت تھی۔ میں نے اس کی تمام تصویریں پھاڑ کے جلا دیں۔''

''اس کاغذ کو آپ میرے پاس تو رہنے دیتیں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''مجھے تو ان سے نفرت نہیں ہے۔ میں ان کی کمی محسوس کرتی ہوں۔ کاش وہ زندہ ہوتے۔''

''اچھا ہوا وہ آج زندہ نہیں ہے۔'' وہ سی ناگن کی طرح پھنکاری تھیں۔ ''وہ زندہ ہوتا تو میں اسے قتل کر دیتی۔''

''آپ آپ میرے باپ کو قتل کر دیتیں؟ اگر آپ ایسا کرتیں تو میں آپ کو قتل کر دیتی۔'' اس کے منہ سے بے اختیار نکل گیا تھا۔

اس لمحے بلقیس بانو کا ہاتھ گھوم کر اس کے منہ پر پڑا تھا۔ وہ تھپڑ سپنا کو آج بھی یاد تھا۔ جب کبھی اسے اس دن کے واقعے کی یاد آتی تو وہ اس کی جلن اپنے رخسار پر محسوس کرتی تھی۔ گو یہ سات آٹھ برس پہلے کی بات تھی۔ وہ اسے کبھی بھول نہیں سکتی تھی۔ اس نے جب سے ہوش سنبھالا اپنی ماں کو ایک خول میں بند پایا تھا۔ وہ آج اسے بے حد عجیب' پراسرار اور ناقابل فہم سی لگی تھیں۔ نجانے کیوں اس انکشاف پر کہ وقار حسین اس کے باپ کا قاتل ہے اس کے خلاف نفرت پیدا نہ ہو سکی اور پھر یہ بات بھی الجھی ہوئی تھی کہ وہ اس کے باپ سے کس لئے اتنی شدید نفرت کرتی تھیں؟ کیا وہ واقعی بہت برا تھا۔

بلقیس بانو کوئی دو گھنٹے کے بعد واپس آئیں تو ان کا چہرہ زرد ستا ہوا اور دل شکستگی کی تصویر بنا ہوا تھا۔ انہوں نے اندر داخل ہوتے ہی دروازے اور کھڑکیوں کو اچھی طرح بند کر کے پردے کھینچ دیئے۔ ان کی سانس بری طرح پھول رہی تھی جیسے وہ بہت دور سے دوڑتی ہوئی آرہی ہوں۔ اس نے خوفزدہ لہجے میں پوچھا۔ ''کیا ہوا امی؟ آپ اتنی پریشان کیوں ہو رہی ہیں؟''

''میں نے وقار حسین کو روپ لال سینما ہال کے پاس دیکھا۔'' انہوں نے دبی زبان اور سراسیمگی سے جواب دیا۔ ''اس کی مجھ پر نظر پڑتے پڑتے رہ گئی۔ میں کس طرح سے اس کی نظروں سے بچ کر آئی ہوں یہ میرا دل ہی جانتا ہے۔''

سپنا نے جلدی سے ایک گلاس پانی لا کر دیا تو بلقیس بانو نے اسے ایک ہی سانس میں خالی کر دیا۔ کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔ چند لمحوں کے بعد آنکھیں کھول کر انہوں نے اپنی متفکر بیٹی کو دیکھا جو بے حس و حرکت بیٹھی تھی۔ پھر وہ آہستگی سے بولیں۔ ''میں نے جعفر دلال سے بات کر لی ہے وہ ہمیں پرسوں صبح چار بجے جیسور کے راستے کلکتہ پہنچا دے گا۔''

☆......☆......☆

سپنا کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے کھٹ پٹ کی آواز سنی جیسے کوئی گھر کی چیزیں غیر محسوس انداز سے الٹ پلٹ کر رہا ہو۔ اس کے اندر خوف کی لہر آئی پھر اسے ایک آہٹ سی سنائی دی۔ ایک ہلکا سا کھٹکا ہوا۔ اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ کہیں کوئی چور تو گھر میں نہیں گھس آیا ہے۔ اس علاقے میں برابر چوریاں ہو رہی تھیں۔ کوئی ایک ہفتہ پہلے کی بات تھی کہ ایک سرکاری افسر کے گھر پر ڈاکہ پڑا تھا۔ ڈاکو کھڑکی کا جنگلا اکھاڑ کر مکان کے اندر داخل ہو گئے تھے۔ بندوق کے زور پر ساری نقدی اور تمام زیورات لے گئے تھے جو دس لاکھ کی مالیت کے تھے۔ حیرانی کی بات تھی کہ ایک سرکاری افسر کے پاس اتنا سب کچھ کہاں سے آیا۔ اس علاقے میں پہرے کا کوئی بندوبست بھی نہیں تھا۔ ان کا مکان تو گلی کے اختتام پر تھا بیس بائیس گز دور تک کوئی مکان نہ تھا۔ اس نے سوچا۔ ڈاکو ہوئے تو وہ کیا کر سکتی ہے۔ کیا اس کی اور ماں کی چیخیں سن کر ان کی مدد کو کوئی آ سکے گا؟ اس کیلئے چیخنا بے سود ہی تھا۔ یہ انسان تھوڑی ہوتے ہیں درندے ہوتے ہیں۔ اتنے بڑے مکان میں دو عورتوں کو اکیلا دیکھ کر ان کی نیت میں فتور آ گیا تو کیا ہو گا؟ پھر اسے ایسا لگا جیسے صحن میں صندوق کو لے جایا جا رہا ہو پھر اس کی سمجھ میں آ گیا کہ دوسرا معاملہ ہے۔ اس نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی تو لگا کہ باہر سے کنڈی لگی ہوئی ہے۔ پھر اس نے صحن میں کھلنے والی کھڑکی کا پٹ کھول کر جھانکا۔ اس نے دیکھا تو ششدر رہ گئی۔ صندوق جو ماں کا تھا وہ باورچی خانے کے باہر رکھا تھا۔ بلقیس بانو اس میں سے کاغذات نکال کر اسے چولہے میں جھونک رہی تھیں۔

لوہے کا یہ صندوق ماں کے کمرے میں ہوتا تھا اور اس میں ایک بھاری تالا لگا ہوا تھا۔ اسے آج تک یہ پتا نہیں چل سکا تھا اس میں ہے کیا جب بھی اس نے ان سے پوچھا وہ ٹال گئی تھیں۔ وہ صندوق سے کاغذات نکلتا دیکھ کر حیران ہو رہی تھی۔ یہ کیسے کاغذات ہیں جنہیں انہوں نے چھپا کر اور بڑی حفاظت سے رکھا ہوا تھا۔ وہ آج اس لئے انہیں جلا رہی

تھیں کہ یہ شہر کچھ عرصے کیلئے چھوڑ کر جانے والی تھیں۔

وہ بستر پر لیٹ گئی۔ کہیں بلقیس بانو اسے جھانکتا ہوا دیکھ کر بگڑ نہ جائے۔ وہ ان کاغذات کے بارے میں سوچنے لگی جسے جلانے میں بھی وہ بڑی احتیاط کر رہی تھیں پھر وہ سوچتے سوچتے گہری نیند میں ڈوب گئی۔

جب وہ بیدار ہوئی تو کمرے میں اندھیرا تھا۔ رات کا وقت تھا۔ اس نے سنا کہ کوئی دروازے پر دستک دے رہا ہے۔ اتنی رات کون ہوسکتا ہے؟ پھر اس نے بلقیس بانو کی تیز اور وحشیانہ آواز سنی۔ ''کون ہے؟'' وہ نفرت بھرے لہجے میں پوچھ رہی تھیں۔

''رقیہ خانم ! میں ہوں۔ تمہارا وقار حسین......'' وقار حسین نے اپنائیت بھرے لہجے میں جواب دیا۔ ''دروازہ کھولو۔''

''میں رقیہ خانم نہیں ہوں اور نہ ہی کسی وقار حسین کو جانتی ہوں۔'' بلقیس بانو نے ہذیانی لہجے میں کہا۔ ''میں اتنی رات گئے دروازہ نہیں کھول سکتی ہوں اس لئے کہ گھر پر مرد نہیں ہیں۔''

''تم رقیہ خانم نہیں ہو تو پھر کون ہو؟'' وقار حسین نے بشاشت کے لہجے میں پوچھا۔

''میرا نام بلقیس بانو ہے۔'' انہوں نے تیز سانسوں سے جواب دیا۔ ''صرف میرا محلہ ہی نہیں سارا شہر جانتا ہے کہ میرا نام کیا ہے؟''

''مجھے کسی سے پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' وقار حسین کے لہجے میں مٹھاس تھی۔ ''اس لئے کہ تم رقیہ خانم ہو۔ تمہاری آواز لب ولہجہ اور میرا دل گواہی دے رہا ہے کہ تم رقیہ خانم ہی ہو۔''

''سنئے جناب !'' بلقیس بانو نے چند ثانیوں کے بعد آواز کی لرزش پر قابو پا کے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''میں رقیہ خانم ہوتی تو مجھے اعتراف کرنے میں کوئی خوف اور جھجک نہ ہوتی۔ آپ کو جانتی ہوتی تو اس سے انکار نہیں کرتی۔''

''میری آنکھیں بھی دھوکا نہیں کھا سکتی ہیں۔ میں نے آج شام تمہاری ایک جھلک دیکھی تھی۔ اس نے بھی تصدیق کر دی تھی کہ تم وہی ہو جس کی مجھے تلاش ہے۔ جو میرے من کے نہاں خانے میں آج بھی بسی ہوئی ہے۔''

''آپ کو میرے بارے میں کوئی غلط فہمی یا خوش فہمی ہوئی ہے اس کا میرے پاس

کوئی علاج نہیں ہے البتہ آپ اپنی آنکھیں ضرور ٹیسٹ کرائیں۔'' بلقیس بانو نے زہرناک لہجے میں کہا۔

''کیا تم یہ سمجھتی ہو کہ میں تمہاری ان باتوں کا یقین کرلوں گا۔'' وقار حسین نے بڑے پرسکون لہجے میں بے حد سنجیدگی سے کہا۔''کیا تم یہ سمجھتی ہو کہ میں تم سے ملے یا اپنے ساتھ لئے بغیر یہاں سے چلا جاؤں گا؟ ہرگز نہیں رقیہ خانم! بیس برس کے ایک لمبے اور صبر آزما عرصے کے بعد صرف تمہاری تلاش میں آیا ہوں تاکہ ہم دونوں مل کر شیطانوں کو اس دنیا سے نیست و نابود کرنے کا بیڑا اٹھائیں جن کی وجہ سے ہمارے درمیان بھی ایک خلیج حائل ہوگئی ہے۔ تمہاری اور ڈائری کی مدد کے بغیر میں تن تنہا انہیں کیفر کردار تک نہیں پہنچا سکتا ہوں۔''

''ایک شریف عورت کو غلط فہمی کی بنا پر اتنی رات گئے ہراساں اور پریشان کرنے کا یہ کون سا طریقہ ہے؟'' بلقیس بانو بھڑک اٹھیں۔ وہ نفرت اور غصے کے عالم میں بولیں تو ان کی آواز ہی نہیں جسم بھی کانپ رہا تھا۔''مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ آپ ایک عورت کو گھر میں اکیلی پاکر اسے اغوا کرنے آئے ہیں۔''

''میرا ہرگز ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔'' وقار حسین نے کہا۔''البتہ تم نے میرے ساتھ چلنے سے انکار کیا تو شاید مجھے یہ بھی کرنا پڑے گا۔''

''اگر آپ کو اپنے بازوؤں پر ناز ہے تو یہ سوچ لیجئے کہ میں نہتی نہیں ہوں۔'' وہ دھمکی آمیز لہجے میں بولیں۔''میرے ہاتھ میں اس وقت جو پستول ہے اس کی چھ کی چھ گولیاں آپ کے جسم میں بلا کسی خوف و جھجک کے اتار دوں گی۔''

''رقیہ خانم۔'' وقار حسین نے گہری سانس لی۔ پھر وہ نپے تلے مدھم لہجے اور سمجھانے کے انداز میں کہنے لگا۔''بیس برس پہلے تمہاری اس ضد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے پریشانیوں کے سوا کچھ نہیں ملا۔ وہ دشمن آج بھی اتنا ہی طاقتور اور با اثر ہے۔ سفاک اور درندہ صفت ہے جتنا کل تھا۔ اس کی وجہ سے ہم دونوں کو جدا اور روپوش ہونا پڑا۔ مگر آج اب میں نہیں چاہتا کہ پھر اس سنگین غلطی کا اعادہ ہو۔ تمہیں اس بنیادی حقیقت کو سمجھ لینا چاہیے کہ دشمن آج بھی ہماری گھات میں ہے۔ کسی بھی دن ہم دونوں کو تلاش کر کے قتل کر سکتا ہے۔ اگر ہم نے ان خون آشام بھیڑیوں کو ختم نہیں کیا تو یہ سوچ لو کہ پھر انہیں کوئی بھی قبر میں نہیں پہنچا سکے گا۔ وہ اپنی طبعی موت تک خون کی ہولی کھیلتے رہیں گے۔ پھر اس وطن عزیز پر ظلمت

کے اندھیرے چھائے رہیں گے۔''

''میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔'' وہ پھنسی پھنسی آواز میں بولیں۔ ''آخر آپ کون ہیں؟ کیا چاہتے ہیں؟ وہ دشمن کون ہے؟ مجھے ان باتوں سے کوئی دلچسپی اور سروکار نہیں ہے۔''

''تم عقل کے بجائے جذبات سے کام لے رہی ہو۔'' وقار حسین کے لہجے میں دکھ اور کرب سمٹ آیا۔ وہ دل گرفتہ انداز سے کہنے لگا۔ ''تم ایک ذرا سی غلط فہمی کی بنا پر آج بھی میری صورت دیکھنے کی روادار نہیں ہو۔ تمہیں مجھ سے شدید قسم کی نفرت ہو چکی ہے تو میں کیا کرسکتا ہوں۔''

''میں کہتی ہوں آپ ابھی اور اسی وقت یہاں سے چلے جائیں۔'' وہ ہیجانی لہجے میں بولیں۔ ''کسی نے آپ کو دیکھ لیا اور یہ باتیں سن لیں تو وہ میرے بارے میں کیا سوچے گا؟ میں ایک شریف عورت ہوں جناب!''

''میں ایک شرط پر یہاں سے جا سکتا ہوں۔'' وقار حسین کے لہجے میں مایوسی اور دل شکستگی ٹپک رہی تھی۔

''کیسی شرط؟'' بلقیس بانو نے چونک کر پوچھا۔

''تم مجھے ڈائری دے دو میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ پھر کبھی نہیں آؤں گا اور نہ تم سے ملنے کی کوشش کروں گا۔''

''میرے پاس نہ تو کوئی ڈائری ہے اور نہ ہی میں کسی ڈائری کے بارے میں جانتی ہوں۔'' بلقیس بانو نے سرد مہری سے کہا۔

''رقیہ!'' وقار حسین نے جذباتی لہجے میں اسے مخاطب کیا۔ ''آخر تم کس لئے ہٹ دھرمی پر اتر آئی ہو؟ وہ ڈائری تمہارے کسی کام کی نہیں ہے۔ اس ڈائری کی وجہ سے تمہاری زندگی بھی خطرے میں ہے۔ تمہیں یہ ڈائری بہت مہنگی پڑے گی۔''

''میں نے آپ سے ایک بار کہہ دیا نا کہ میرے پاس کوئی ڈائری نہیں ہے اور نہ میں رقیہ خانم ہوں۔'' بلقیس بانو تیز لہجے میں بولیں۔ ان کی سانس پھولنے لگی اور ان کا چہرہ تمتما اٹھا تھا۔ ''میں آپ سے پھر کہہ رہی ہوں کہ یہاں سے چلے جایئے ورنہ میں ہوائی فائر کر کے محلے والوں کو اکٹھا کرلوں گی۔''

''میں اس وقت تو یہاں سے جا رہا ہوں لیکن رخصت ہونے سے پہلے کچھ کہنا

چاہتا ہوں۔'' وقار حسین نے مشتعل ہوئے بغیر کہنا شروع کیا۔ تم سکون اور ٹھنڈے دل سے سوچنے کی کوشش کرو۔ جذبات کے بجائے عقل سے کام لو۔ اگر تم نے معاملہ فہمی کا ثبوت نہیں دیا اور مجھے ڈائری نہیں دی تو تم بھی ان نافرض شناس لوگوں میں شامل ہو جاؤ گی جنہوں نے انسانیت کے مجرموں کو قانون کے حوالے کرنے کے بجائے ان کا تحفظ کیا۔ انہیں اس بات کے مواقع فراہم کیے کہ وہ سیاہ وسفید کے مالک بن جائے اور ان کی شخصیت کے اصل روپ بے نقاب کرنے کے بجائے راز میں رکھا۔ تم میری نظر میں اس لئے بھی مجرم ہو کہ مجھ سے تعاون نہیں کر رہی ہو میں دو ایک دن میں پھر یہاں آؤں گا تاکہ تمہارا فیصلہ سن سکوں۔'' تم بھلے اس مشن میں میرے ساتھ شامل نہ ہو لیکن وہ ڈائری مجھے ضرور دے دینا۔''

''آپ یہاں آ کر اپنا وقت برباد کریں گے۔ اس لئے کہ میں وہ عورت نہیں ہوں جس کی آپ کو تلاش ہے۔''

''اگر تم نے مجھے ڈائری نہیں دی تو پھر جان لو کہ تمہاری زندگی کی کوئی ضمانت نہیں ہو گی۔ پھر تمہیں سزائے موت ملے گی مگر یہ موت اتنی ہولناک ہو گی کہ تم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتی ہو۔ وقار حسین نے سرد اور سفاک لہجے میں کہا۔

سپنا کے سارے جسم میں جھرجھری سی آ گئی۔ اس نے دوسرے لمحے قدموں کی آواز سنی جو معدوم ہوتی چلی گئی۔ چند ثانیوں کے بعد گاڑی سٹارٹ ہونے کی آواز آئی۔ گاڑی تیز رفتاری سے گلی سے نکلی تو دو ایک پل کیلئے رات کا سکوت درہم برہم ہوا۔ اس نے سوئچ آن کیا تو کمرہ روشنی میں نہا گیا۔ دیوار گیر گھڑی میں اس وقت رات کے دو بج کر بیس منٹ ہو رہے تھے پھر وہ دروازے کی طرف بڑھی تاکہ ماں سے جا کر وقار حسین کے بارے میں پوچھے۔ اس نے دروازہ کھولنا چاہا تو وہ نہیں کھلا۔ باہر سے کنڈی لگی ہوئی تھی۔ اس کا دماغ سنسنا رہا تھا۔ سارے بدن میں لہو کی روانی تیز ہو گئی تھی۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ اس کے ذہن میں خیالات کے زہریلے ناگ پھن اٹھائے کھڑے تھے۔ تاریکی باہر ہی نہیں اس کے دل و دماغ میں بھی تھی۔ وہ اپنے آپ سے پوچھ رہی تھی کہ اس کے باپ کا قاتل کس لئے اتنی رات گئے چوروں کی طرح اس کی ماں سے ملنے آیا تھا؟ وہ دن میں بھی تو آ سکتا تھا؟ اور پھر کس لئے اس کی ماں کو رقیہ خانم کے نام سے بار بار مخاطب کر رہا تھا؟ اس کی ماں کہیں رقیہ خانم ہی تو نہیں ہے؟ وہ موت کے خوف کی وجہ سے شاید بلقیس بانو بن کر رہ رہی ہو۔ ماں نے اس سے کہا تھا کہ وقار حسین رقیہ خانم کا دشمن

ہے۔ وہ رقیہ خانم کو موت کے گھاٹ اتارنے کیلئے سرگرمی سے تلاش کر رہا ہے مگر ماں کی ساری باتیں غلط ثابت ہوئی تھیں۔ اس نے ابھی ابھی جو گفتگو وقار حسین اور اس کی ماں کے مابین سنی تھی اس سے یہ اندازہ ہوا تھا کہ وہ رقیہ خانم کی موت کا خواہاں نہیں ہے اسے تو ڈائری کی ضرورت ہے۔ وہ رقیہ خانم اور ڈائری کی مدد سے دس بڑے شیطانوں کے گروہ کا خاتمہ کرنا چاہتا ہے۔ آخر یہ کیسی ڈائری ہے جس کیلئے وقار حسین اس قدر بے تاب اور پریشان ہو رہا ہے؟ کیا اس نے ماں کے پاس کبھی کوئی ڈائری دیکھی تھی؟ اسے اچانک یاد آیا کہ ایک رات وہ بیدار ہوئی تو اسے سخت پیاس لگ رہی تھی۔ یہ کوئی چھ سات برس پہلے کی بات تھی۔ اس کے کمرے میں پانی کا گلاس نہیں تھا۔ وہ اپنے کمرے سے نکلی تو اس نے ماں کے کمرے میں روشنی دیکھی تھی۔ وہ حیران تھی کہ اس کی امی اب تک کیوں جاگ رہی ہیں۔ کہیں وہ کاپیاں تو چیک نہیں کر رہی ہیں؟ وہ ماں کے کمرے میں داخل ہوئی تو اس نے دیکھا کہ اس کی ماں ایک درمیانہ سائز کی ڈائری بڑی انہاک سے پڑھ رہی ہیں۔ ماں نے جیسے ہی اسے دیکھا تو ان کا چہرہ ایک دم متغیر ہو گیا اور انہوں نے ڈائری کو تکیے کے نیچے سراسیمگی سے چھپا لیا تھا۔ وہ ماں کی اس حرکت پر کئی دنوں تک بے حد حیران رہی اور سوچتی رہی تھی کہ اس ڈائری میں ایسی کیا بات تھی اسے پوچھنے کی جرأت ہی نہیں ہوئی تھی اس لئے کہ وہ اپنی ماں سے بہت ڈرتی تھی۔ پھر اس کے دل میں اس ڈائری کو دیکھنے اور پڑھنے کا تجسس پیدا ہوا تھا۔ اس کے دل میں ایک خیال آیا تھا کہ ماں نے شاید اپنی شادی سے پہلے کسی اور شخص سے محبت کی ہو گی۔ انہوں نے اس ڈائری میں اپنی محبت کے لمحات اور یادوں کو لکھا ہو گا۔ اس میں شاید خفیہ پیار بھرے خطوط بھی ہوں گے جن میں جوانی کی امنگوں اور حسین جذبات کا خوبصورت شاعرانہ انداز میں اظہار کیا گیا ہو گا۔ اس لئے تو وہ رات کے وقت اسے پڑھ رہی تھی۔ اس نے ماں کی غیر موجودگی میں کتنی ہی مرتبہ اس ڈائری کو تلاش کیا تھا لیکن وہ اس کے ہاتھ نہیں لگ سکی تھی۔ پھر یہ سوچ کر اس نے تلاش ختم کر دی تھی کہ ڈائری صندوق میں محفوظ ہو گی۔ اس صندوق کی چابی اس کے ہاتھ لگنا ناممکن تھی۔ شاید اس ڈائری کیلئے وقار حسین آیا تھا۔ آج اس پر انکشاف ہوا تھا کہ وہ ڈائری کسی اور نوعیت کی ہے۔ بالفرض محال اس کی ماں رقیہ خانم نہیں ہیں تو ماں کو اس قدر دہشت زدہ ہونے کی کیا ضرورت تھی؟ ماں نے جب یہ سنا کہ ایک شخص رقیہ خانم کی تلاش کر رہا ہے تو ان کی حالت کیوں غیر ہو گئی تھی؟ دوسری طرف وقار حسین کو اتنی بڑی غلط فہمی کیسے ہو گئی تھی کہ اس کی ماں رقیہ خانم

ہیں۔ وہ جتنی گہرائی میں سوچ رہی تھی اتنی ہی الجھتی جا رہی تھی۔ اسے اپنے کسی سوال کا جواب نہیں مل رہا تھا۔ وقار حسین رقیہ خانم اور بلقیس بانو کی شخصیت اور ڈائری اس کیلئے معمہ بن گئے تھے۔

اس نے چند لمحوں کے بعد وحشت زدہ ہو کر زور زور سے دروازہ پیٹنا شروع کر دیا۔ ''امی......امی......دروازہ کھولئے۔''

چند لمحوں کے اذیت ناک انتظار کے بعد اس نے قدموں کی آواز سنی۔ رات کی گہری خاموشی میں دروازہ چرچراتا ہوا کھلا تو بلقیس بانو کا زرد' ستا چہرہ اور پھٹی پھٹی آنکھیں دیکھ کر سپنا کو جیسے سکتہ ہو گیا تھا۔ وہ دم بخود سی کھڑی رہی۔ اس کا سارا جسم بھی سن ہو گیا تھا۔ اس لمحے اسے ایسا لگا جیسے اس کی ماں کا ہوش لمحہ بہ لمحہ ان سے چھنتا جا رہا ہو۔ جسم میں خون ہی نہ رہا ہو۔ بس اب کسی بھی لمحے تیورا کر گرنے والی ہوں۔ بلقیس بانو نے دوسرے لمحے لپک کر اپنی بیٹی کا شانہ لرزتے ہاتھوں سے تھام لیا مگر اسے خود بھی تو سہارے کی ضرورت تھی۔ وہ اپنے آپ کو بہت ٹوٹی ٹوٹی سی محسوس کر رہی تھی پھر بھی وہ کسی نہ کسی طرح سہارا دے کر انہیں پلنگ کے پاس لے آئی اور ہلکے سے بستر پر بٹھا دیا۔ اس سے ماں کی یہ حالت دیکھی نہیں جا رہی تھی۔ اس نے جلدی سے میز سے پانی کا بھرا ہوا گلاس اٹھا کر ماں کی طرف بڑھایا اور خود پر قابو پا کر رندھی ہوئی آواز میں بولی۔ ''امی! پانی پی لیجئے۔''

بلقیس بانو نے اپنی تھرتھراتی پلکیں اوپر اٹھا کر پہلے تو اپنی بیٹی کا چہرہ دیکھا جو رنج و الم کی تصویر بنا ہوا تھا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں افق تا افق سیاہ بادل تیر رہے تھے۔ انہیں ایسا لگ رہا تھا جیسے یہ ابھی برس پڑیں گے۔ انہیں اپنا حلق سوکھتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ کانٹے سے چبھ رہے تھے۔ انہوں نے بیٹی کے ہاتھ سے گلاس لے کر دو تین گھونٹ حلق سے اتارے تھے کہ ان کے ہاتھ میں ہلکی سی کپکپاہٹ آ گئی۔ انہوں نے ایک اور گھونٹ لینے کے بعد گلاس کو منہ سے ہٹا کر بیٹی کو واپس کر دیا پھر وہ بڑی خاموشی سے بستر پر لیٹ گئیں۔

سپنا گلاس لے کر کمرے سے نکل گی۔ اسے بھی سخت پیاس لگ رہی تھی۔ وہ پانی پی کر کمرے میں آئی اور بستر پر ان کے پاس آ بیٹھی۔ اس نے ماں کی طرف رحم بھری نظروں سے دیکھا۔ اس کے دل میں ہمدردی اور محبت کے جذبات ابھر رہے تھے۔ آج سے پہلے کبھی اس کے دل میں ایسے جذبات ماں کیلئے نہیں ابھرے تھے۔ بلقیس بانو نے اپنی پلکوں کی چلمن کو بند کر لیا تھا۔ وہ سمجھ گئی کہ ماں نے اپنے آنسو اس سے چھپانے کیلئے ایسا کیا ہے۔ ان

کے چہرے پر شدید کرب کے آثار تھے۔ سپنا کو ان کے بشرے سے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کسی بھی پل پھوٹ پھوٹ کر رو پڑیں گی اور خود پر قابو پانے کی اندر ہی اندر جو جدوجہد کر رہی ہیں وہ اس میں ناکام ہو جائیں گی۔

چند لمحوں تک سناٹا رہا۔ بلقیس بانو نے نہ تو اپنی آنکھیں کھولیں اور نہ ہی سپنا نے ان سے کچھ کہا۔ اسے ان کی حالت ایسی نہیں لگ رہی تھی کہ کچھ پوچھا جائے۔ اس کے دل کو قرار تھا نہ نظروں کو۔ وہ اپنے اندر ایک عجیب سی وحشت محسوس کر رہی تھی۔ اس کی نظریں تھیں کہ بار بار ماں کے چہرے پر گر جاتی تھیں۔ وہ ابھی تک بے سدھ پڑی تھیں۔

بلقیس بانو نے تھوڑی دیر کے بعد اپنی آنکھیں کھول دیں پھر اپنی نگاہیں بیٹی کے زرد چہرے پر مرکوز کر دیں۔ اسے بے حد غم زدہ متفکر اور پریشان دیکھ کر انہوں نے بڑے جبر سے مسکرانے کی کوشش کی۔ مسکراہٹ کا دل نے ساتھ نہیں دیا۔ اس نے ابھرتے ہی دم توڑ دیا پھر انہوں نے اپنا ہاتھ بڑھا کر سپنا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا تو اسے اپنی ماں کا ہاتھ بے حد سرد لگا۔ ان کے ہاتھ کی ساری ٹھنڈک اس کے سارے جسم میں بجلی کی لہر کی طرح دوڑ گئی۔

سپنا ان کے قریب سرک آئی اور جھک کر رندھی ہوئی آواز میں پوچھا۔ ”امی! آپ کی طبیعت کیسی ہے؟“

”ٹھیک ہوں بیٹی!“ بلقیس بانو کے لہجے میں ہلکی سی نقاہت تھی۔ تم اس قدر پریشان کیوں ہو رہی ہو؟

”امی! یہ سب کیا ہے؟“ وہ سسک پڑی۔

”کچھ نہیں ہے بیٹی! سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ بلقیس بانو نے اسے دلاسہ دیا۔

”تم جلدی سے ایک کپ چائے تو بنا لاؤ۔“

سپنا مشینی انداز میں باورچی خانے کی طرف بڑھ گئی۔ بلقیس بانو جب بہت تھک جاتی تھیں یا سخت بیمار ہوتی تھیں تو انہیں چائے کی بڑی طلب محسوس ہوتی تھی۔ چائے ان کیلئے دوا کا کام کرتی تھی۔ سپنا نے باورچی خانے کی لائٹ آن کی تو اس نے فرش پر بہت سارے کاغذ کے پرزے بکھرے ہوئے دیکھے جو جلنے سے رہ گئے تھے۔ اس نے جلدی سے چولہا جلایا اور کیتلی میں چائے کیلئے پانی بھر کے اسے چولہے پر رکھا پھر تجسس سے ان پرزوں کو دیکھنے لگی۔ ان میں تصویروں کے ٹکڑے تھے۔ اسے ایک تصویر کا ایسا ٹکڑا ملا جو اس کی ماں

کی نوجوانی کا تھا۔ چہرے کا نصف حصہ نظر آ رہا تھا۔ اس نے ماں کی جوانی کی یہ پہلی تصویر دیکھی تھی۔ شادی کی تصویر لگ رہی تھی۔ وہ بہت حسین پیاری اور پرکشش دکھائی دے رہی تھیں۔ مگر امی نے اپنی تمام تصویریں کس لئے پھاڑ اور جلا دیں۔ انہیں کس بات اور خوف نے ایسا کرنے پر مجبور کیا ہے؟ دشمن ان کی تصویروں سے کیا حاصل کر سکتا ہے؟ شاید انہوں نے وہ ڈائری بھی جلا دی ہے جس کی وقار حسین کو اشد ضرورت ہے۔

وہ چائے لے کر کمرے میں پہنچی تو اس نے بلقیس بانو کو دیکھا۔ وہ خیالوں میں گم دیوار کو تک رہی تھیں۔ وہ اس کی آہٹ سن کر چونکی تھیں۔ اس نے ان کی طرف چائے کی پیالی بڑھا دی۔ بلقیس بانو نے چائے کی پیالی اس کے ہاتھ سے لیتے ہی منہ سے لگا لی۔ سپنا اپنی ماں کے سامنے بیٹھی انہیں دیکھ رہی تھی۔ انہیں جیسے ہوش ہی نہیں تھا۔ ساڑی کا پلو شانے سے ڈھلک کر گود میں گر گیا تھا۔ ان کی پیشانی پر بے شمار لکیریں کھنچ گئی تھیں۔ اس کا دل بھی بیٹھا جا رہا تھا۔ ماں کو بظاہر خاموش اور کھویا ہوا دیکھ کر اس پر ایک دیوانگی سی طاری ہو گئی تھی۔ وہ اپنی ماں کو اچھی طرح جانتی تھی کہ اس وقت وہ کس اذیت میں مبتلا ہیں۔

سپنا اچانک اپنی جگہ سے اٹھی اور مضطربانہ آگے بڑھ کر پلنگ کے پاس والی کرسی پر جا بیٹھی۔ بلقیس بانو نے چونک کر حیرت بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھا تو اس نے پوچھا۔ ”امی میرے باپ کا قاتل کس لئے آیا تھا؟“

”تم نے اس کی اور میری پوری گفتگو سنی تھی؟“ وہ بیٹی کی آنکھوں میں جھانکنے لگیں۔

”ہاں!“ سپنا نے اثبات میں سر ہلایا۔ پھر وہ قدرے توقف سے بولی۔ ”کیا یہ سچ ہے کہ آپ رقیہ خانم ہیں؟“

”یہ جھوٹ ہے۔“ بلقیس بانو کو اپنی آواز کھوکھلی سی لگی۔ ان کے چہرے پر اندھیرا سا چھا گیا۔ وہ اپنے آپ کو سنبھالتی ہوئی بولیں۔ ”میں واقعی رقیہ خانم ہوتی تو کیا اسے پولیس کے حوالے نہ کر دیتی؟“

”مگر وہ آپ کو رقیہ خانم ہی سمجھ رہا تھا اور آپ اس کی غلط فہمی دور نہ کر سکیں۔“ سپنا نے کہا۔ ”یہ آخر اسے کیوں آپ پر شک ہو رہا تھا؟“

”اس لئے کہ میری آواز رقیہ خانم کی آواز سے حیرت انگیز طور پر ملتی جلتی ہے۔ انہوں نے وضاحت کی۔“ آپ نے اس کے سامنے ظاہر ہو کر اس کی یہ غلط فہمی دور کیوں

نہیں کر دی؟'' سپنا نے جرح کے انداز میں کہا۔

''اس لئے کہ وہ مجھے دیکھ کر پہچان لیتا کہ میں کون ہوں اور مجھ سے رقیہ خانم کے بارے میں معلوم کرنے کی کوشش کرتا۔ میرے انکار کرنے پر مجھ پر تشدد کرتا۔ شاید مجھے قتل بھی کر دیتا۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ اسے تمہارے بارے میں بھی معلوم ہو جائے۔''

''کیا اس نے یہ معلوم نہیں کر لیا ہو گا کہ میں آپ کی بیٹی ہوں؟''

''وہ شاید میرا کسی وقت تعاقب کرتا ہوا یہاں تک آیا ہو گا۔ اس نے میرے بارے میں کسی سے پوچھنا مناسب نہیں سمجھا ہو گا۔ وہ رات کے وقت چوری چھپے اپنے شک کی تصدیق کیلئے آیا تھا۔''

''مگر اس نے یہ بھی تو کہا تھا کہ اس نے آپ کی ایک جھلک دیکھی تھی۔''

''میری رقیہ خانم سے معمولی سی مشابہت ہے جسامت قد و قامت بھی ایک طرح کا ہے اس لئے اسے ایک جھلک دیکھنے پر شک ہوا ہو گا۔''

''آپ نے تو اسے اپنا نام بلقیس بانو بتایا تھا نا؟'' سپنا کے چہرے پر گہرا استعجاب چھا گیا پھر بھی اس نے آپ کو نہیں پہچانا کہ آپ اس کے اس دشمن کی بیوی ہیں جس نے اسے قتل کر دیا تھا؟''

''اس کی وجہ یہ تھی کہ میرا اصل نام بلقیس بانو نہیں بلکہ سدرہ بیگم ہے۔''

''سدرہ بیگم؟'' سپنا نے حیرت آمیز انداز سے اپنی پلکیں جھکائیں۔ ''مگر آپ نے تو مجھے کبھی اپنا اصل نام نہیں بتایا؟''

''میں نے اس کی کبھی کوئی ضرورت محسوس نہیں کی۔'' وہ سرد مہری سے بولیں۔

''آپ اسے اپنا اصلی نام بتا دیتیں تو اس سے کیا فرق پڑتا؟''

''اگر میں اسے اپنا اصلی نام بتاتی تو وہ اس کا یقین نہیں کرتا۔'' وہ کہنے لگیں۔ ''میں اس کی غلط فہمی دور کرنے کیلئے اس کے سامنے چلی جاتی تو وہ مجھے دیکھ کر شاید سخت مشتعل ہو جاتا اور وہ اس وقت تک میری جان بخشی نہیں کرتا تاوقتیکہ میں اسے رقیہ خانم کے بارے میں بتا نہیں دیتی۔''

''میرے خیال میں تو آپ کو رقیہ خانم کے بارے میں بتا کر جان چھڑا لینی چاہیے۔'' سپنا متفکر لہجے میں بولی۔ ''وہ صرف رقیہ خانم اور ڈائری کی تلاش میں آیا تھا۔ وہ آپ سے کچھ نہیں کہتا۔''

''میں اسے کیا رقیہ خانم کے بارے میں بتاتی جبکہ میں خود بھی نہیں جانتی ہوں کہ وہ کہاں ہے؟ زندہ ہے یا اسے قتل کر دیا گیا ہے۔ مجھے تو خود بھی اس کی تلاش ہے۔'' انہوں نے ایک لمبی سانس لی۔

''مگر وہ تو اپنی دانست میں آپ کو سو فیصد رقیہ خانم سمجھ کر گیا ہے۔'' سپنا تشویش سے بولی۔ ''اور پھر وہ دوبارہ آنے والا ہے تاکہ آپ سے سامنا کرے اور ڈائری کا مطالبہ پھر سے دہرائے۔ تب آپ کیا کریں گی۔''

''وہ مجھ سے ملنے یا رقیہ خانم کیلئے نہیں بلکہ ڈائری کیلئے آئے گا۔ وہ صرف اور صرف ڈائری کیلئے آ رہا ہے اگر اسے رقیہ خانم یا ڈائری میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنے کیلئے کہا جائے تو وہ ڈائری کا انتخاب کرے گا۔''

''آخر اسے رقیہ خانم سے زیادہ ڈائری سے دلچسپی کیوں ہے؟'' سپنا بولی۔ ''اس نے آپ سے یہ بھی کہا تھا کہ وہ ڈائری اور رقیہ خانم کی مدد سے دشمن پر قابو پا لے گا۔ کیا اس صورت میں وہ رقیہ خانم کو تلاش نہیں کرے گا؟''

''اصل بات یہ ہے کہ وقار حسین دشمن کا ایجنٹ ہے اور اس کے اشارے پر اپنا اصل چہرہ چھپا کر ہمدرد کا بہروپ بھر کے رقیہ خانم اور ڈائری کی تلاش میں نکلا ہے اس نے اسی طرح تمہارے باپ کو بھی قتل کیا تھا۔''

''یہ دشمن کون ہے؟''

''یہ وقت فضول باتوں کا نہیں ہے۔'' بلقیس بانو نے چونک کر بیٹی کی طرف دیکھا پھر چائے کی پیالی کی طرف' انہوں نے ایک ہی گھونٹ میں بچی کھچی چائے حلق سے اتار کے خالی پیالی میز پر رکھ دی۔ چند لمحوں کے بعد انہوں نے بیٹی کی طرف دیکھتے ہوئے پست لہجے میں کہا کیا تم نے نہیں سنا کہ وہ کیا دھمکی دے کر گیا ہے؟''

''ہاں میں نے اس کی ساری گفتگو سنی تھی۔'' سپنا نے اثبات میں اپنا خوشنما سر ہلایا۔ ''آپ پہلی فرصت میں پولیس سے رابطہ قائم کیوں نہیں کرتی ہیں۔ انہیں بلاخوف وخطر بتائیں کہ وقار حسین نامی شخص نے آپ کے شوہر اور میرے ابو کو اپنی گاڑی سے کچل کر بیس برس پہلے قتل کیا تھا اور ملک سے فرار ہو گیا تھا۔ اب وہ مجھے قتل کرنے کے درپے ہے اسے زنداں کے حوالے کر دیا جائے۔''

''اس کیلئے عینی شاہد یا کسی ٹھوس ثبوت کی ضرورت ہے جو میں فراہم نہیں کر سکتی۔''

پاکستان ویب ڈائجسٹ

وہ افسردگی سے بولیں۔ ''کاش! رقیہ خانم مل جائے تو ایسا ممکن ہو مگر ہم اسے کہاں تلاش کریں۔ وقار حسین ڈائری کے بہانے اسے تلاش کر رہا ہے تا کہ اسے قتل کر دے۔''

''اب ہم کیا کریں امی۔'' سپنا نے سراسیمگی سے پوچھا۔

''میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا ہے کہ آخر یہ سب کیا ہے؟ اور پھر آپ مجھے کھل کر بہت سی باتیں بتا نہیں رہی ہیں مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ آپ بھی کچھ چھپا رہی ہیں؟''

''وقت آنے پر تمہیں نہ صرف سب کچھ پتا چل جائے گا بلکہ ہر سوال کا جواب بھی مل جائے گا۔'' وہ اسے متوحش نظروں سے دیکھنے لگی۔

''مجھے آج ابھی تم سے بے حد ضروری باتیں کرنا ہیں اور کچھ سمجھانا بھی چاہتی ہوں۔ کیونکہ وہ تمہیں بھی میرے ساتھ قتل کرنے کی کوشش کرے گا۔''

☆......☆......☆

''مجھے'' وہ ذرا سی دیر کیلئے سانس لینا بھول گئی۔ اس نے تھوک نگلتے ہوئے پوچھا۔
''وہ کس لئے؟ میں نے کیا کیا ہے؟''

بلقیس بانو نے ٹوٹے لہجے میں جواب دیا۔ ''وقار حسین نے تمہارے باپ کو قتل کرنے کے بعد قسم کھائی تھی کہ وہ اپنے دشمن کی بیوی اور بچی کو بھی قتل کر دے گا۔''

''آخر کس بات نے وقار حسین کو جنون میں مبتلا کر دیا تھا کہ اس نے میرے ابو کو قتل کیا اور اب بیس برس کے بعد مجھے اور آپ کو انتقام کا نشانہ بنانا چاہتا ہے۔'' سپنا کا چہرہ سفید پڑ گیا۔

''یہ ایک لمبی کہانی ہے۔'' بلقیس بانو نے جواب دیا۔ ''میں تمہیں مختصر طور پر بتاتی چلوں کہ تمہارے باپ نے اپنے شب و روز اس بات کی تصدیق کیلئے وقف کر دیئے تھے کہ دشمن کا اصل چہرہ وہ نہیں ہے جو بظاہر دکھائی دیتا ہے۔ تمہارے باپ نے ان دس شیطانوں کے خلاف ٹھوس ثبوت حاصل کر لئے تھے اور اس کی دشمن کو خبر ہو گئی تھی پھر انہیں وحشیانہ طریقے سے ختم کر دیا گیا مگر تمہیں خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے اس لئے کہ مارنے والے سے بچانے والا بڑا ہوتا ہے۔''

بلقیس بانو نے سانس لینے کیلئے توقف کیا تو سپنا دہشت زدہ لہجے میں بولی۔
''کیوں نہ ہم صبح ہوتے ہی کہیں اور پناہ لے لیں۔''

''اس سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔'' وہ کہنے لگیں۔ ''وقار حسین ایک دن بعد آئے گا۔ ہمارے پاس فرار کیلئے کافی وقت ہے۔ کل میں تمہیں اپنی ایک دیرینہ سہیلی کے ہاں کسی کے ساتھ روانہ کر دوں گی جو باریسال میں رہتی ہے۔ وہاں تم محفوظ رہو گی۔''

''کیا آپ میرے ساتھ باریسال نہیں چلیں گی؟'' سپنا نے سراسیمگی سے پوچھا۔
''نہیں تم اکیلی جاؤ گی۔'' انہوں نے جواب دیا۔

''آپ میرے ہمراہ کیوں نہیں چلیں گی؟ کیا یہاں آپ کی جان کو خطرہ لاحق

نہیں؟ آپ کو چلنا ہو گا۔ وہ آپ کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔'' سپنا کی آواز حلق میں پھنس رہی تھی۔

''اس لئے کہ وقت کا ہر لمحہ ناقابل اعتبار ہے۔ میں کہیں بھی جاؤں' کہیں بھی پناہ لوں موت کے پنجے سے بچ نہیں سکتی کیونکہ موت میرے گرد اپنا حصار قائم کر رہی ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ تم اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے باریسال چلی جاؤ۔ وہاں دست قاتل کی رسائی تمہاری زندگی تک نہ ہو سکے گی۔ پھر میری سہیلی تمہیں کسی نہ کسی طرح کلکتہ پہنچا دے گی۔ تم پرکاش آنند کے پاس جا کر زندگی بسر کرنا۔'' بلقیس بانو کی آواز بھرا گئی۔

''نہیں' نہیں' میں آپ کو اس مشکل میں چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔'' سپنا کی آنکھیں چھلک پڑیں۔ وہ رونے لگی۔

''یہ میرا فیصلہ ہے جو میں نے بہت سوچ سمجھ کر کیا ہے۔'' وہ دل گرفتہ انداز میں بولیں۔ ''مجھے اب موت سے کوئی نہیں بچا سکتا۔''

''سپنا پر جیسے کوئی بجلی سی گری۔ اس دم اسے ایسا لگا جیسے اس کا دل اچھل کر باہر آ جائے گا۔ یکا یک اس کا سر چکرانے لگا اور ایسا محسوس ہوا جیسے زبردست زلزلہ آ گیا ہو۔ ہر چیز کانپ رہی ہو۔ ڈول رہی ہو۔ ''امی!'' وہ ہچکیوں کے درمیان بولی تو آواز اس کے حلق میں اٹک رہی تھی۔ ایسی باتیں نہ کیجئے۔ میرا دل ڈوبا جا رہا ہے۔ اللہ آپ کو سلامت رکھے۔''

''سپنا بیٹی!'' وہ اس کا سر اپنے سینے سے لگا کر اس کے ریشمی بالوں کو سہلانے لگیں۔ ''مجھے تمہارے آنسوؤں کی نہیں عزم و حوصلے کی ضرورت ہے۔ میں نے بھی قسم کھائی تھی کہ وقار حسین سے اپنے شوہر کی موت کا بدلہ لوں گی لیکن اس کے اس ملک سے باہر چلے جانے کی صورت میں میرے انتقام کی آرزو پوری نہ ہو سکی۔ اب چوں کہ میری زندگی کی مہلت ختم ہونے والی ہے اس لئے انتقام کی یہ امانت تمہارے حوالے کرتی ہوں۔ تم کلکتہ میں پرکاش آنند کو اپنے اعتماد میں لے کر سب کچھ بتا دینا۔ تمہیں وہاں کسی بھی ایسے کیمپ میں تربیت دلوا دے گا جہاں گوریلا جنگ کی تربیت دی جاتی ہے پھر تم واپس آنا اور وقار حسین کو تلاش کر کے اسے موت کے گھاٹ اتار دینا اس کی موت سے میری روح کو کس قدر سکون ملے گا تو تصور بھی نہیں کر سکتی ہو۔''

''مجھے اپنے باپ کے قاتل سے انتقام لیتے ہوئے کس قدر خوشی ہو گی یہ میں بتا نہیں سکتی۔'' سپنا کا چہرہ سرخ ہو گیا اور اس کی آنکھوں میں ایک سفاک چمک آ گئی۔ ایک پل کیلئے وہ موت کو بھول گئی تھی پھر کسی خیال کے زیر اثر بولی۔ ''امی! میرا ایک خطرناک قاتل

سے انتقام لینا اتنا آسان نہیں ہے جتنا آپ سمجھ رہی ہیں کیا میں ایک کمزور سی لڑکی نہیں ہوں۔''

''تم ابھی جوان اور باہمت ہو' ذہین اور تعلیم یافتہ ہو۔'' وہ کہنے لگیں۔''انتقام لینے کیلئے کوئی ضروری نہیں کہ ہاتھ میں خطرناک اسلحہ ہو۔ اس کیلئے عزم وحوصلے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اپنی جرأت اور ہشیاری سے تم ساری دنیا سے ٹکر لے سکتی ہو۔ یہ وقار حسین کیا چیز ہے جسے تم چیونٹی کی طرح مسل نہ سکو۔''

''مگر آپ خود حوصلہ کیوں ہار رہی ہیں۔'' سپنا نے پرخیال نظروں سے انہیں دیکھا۔''ہم دونوں مل کر کیا دشمن سے مقابلہ نہیں کر سکتے۔''

''میں اندر سے اس قدر ٹوٹ چکی ہوں کہ اب مجھ میں طاقت ہی نہیں رہی ہے۔'' وہ کہنے لگیں۔''اگر کسی لمحے دشمن کے ہاتھوں میری زندگی کا چراغ گل ہو جائے تو تم حوصلہ نہیں ہارنا۔ یہاں سے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر نکل جانا۔ میری تجہیز و تکفین کا انتظار بھی نہیں کرنا۔ میں اس مکان کی ایک چابی اور کاغذات مسجد کے پیش امام عبدالسبحان کو صبح دے دوں گی تاکہ وہ اس مکان کی دیکھ بھال اور حفاظت کر سکیں۔ جب بھی حالات بہتر ہو جائیں تم یہاں آکر اپنی زندگی ازسرنو شروع کر سکتی ہو یا پھر اسے فروخت کر دینا۔''

☆.........☆.........☆

صبح بلقیس بانو نے اسے پانچ ہزار کی رقم کا ایک چیک کاٹ کر دیا کہ وہ کالج سے واپسی پر اسے کیش کرا کے لے آئے۔ اس نے اپنی ماں سے کہا تھا کہ وہ کالج جا کر اپنی سہیلیوں سے الوداعی ملاقات کر کے جلد ہی آ جائے گی۔ بلقیس بانو نے ایک دستی بیگ اور ایک بڑا سوٹ کیس رات میں تیار کر دیا تھا۔

وہ ٹھیک نو بجے کالج جانے کیلئے نکلی۔ اس کی ماں مولوی عبدالسبحان کے ہاں جانے کی تیاری کر رہی تھی۔ اسے واپسی میں پورے دو گھنٹے لگ گئے۔ بینک میں اسے چیک کیش کرانے میں آدھا گھنٹہ لگ گیا تھا۔ بینک سے نکل کر اس نے رکشہ کر لیا جب رکشہ گلی میں داخل ہوا تو اسے گلی آج بڑی ویران لگ رہی تھی۔ چاروں طرف سناٹا اور مردنی سی چھائی ہوئی تھی وہ سارے راستے سوچتی آ رہی تھی کہ کہیں وقار حسین صبح تو نہیں آ گیا۔ اس کا آنا غیر متوقع نہیں تھا۔ اس نے اپنے مکان کے سامنے گاڑی نہیں دیکھی تو سکون و اطمینان کا سانس لیا گویا ابھی تک خیر خیریت تھی۔

جب رکشہ والا کرایہ لے کر چلا گیا تو اس نے دروازے پر دو تین مرتبہ وقفے

وقفے سے دستک دی دروازہ نہیں کھلا تو اسے تشویش ہوئی اور دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اس نے دروازے کو اندر کی طرف دھکیلا تو وہ چرچراتا ہوا کھل گیا۔ وہ اندر داخل ہوئی تو اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ وہ سن ہو کر رہ گئی۔ گھر کے اندر کسی طوفان کی سی تباہ کاریوں کا سماں تھا۔ تینوں کمروں میں ہر طرف بے رحم اور درندہ صفت دشمن کی ہلاکت خیزی کے آثار تھے۔ لکھنے پڑھنے کی میز کی درازوں اور الماریوں کے سب خانوں سے ہر چیز نکال کر باہر پھینک دی گئی تھی۔ سوٹ کیس اور صندوق بھی کھلا پڑا تھا۔ تکیے اور کشن تک بیدردی سے پھاڑ دیئے گئے تھے۔ تمام کتابیں شیلف سمیت فرش پر ڈال دی گئی تھیں۔ اس کے گھر کو تباہ کر جانے والے ایک فتح کا جشن منانے کیلئے شاید اس کی ماں کو اپنے ساتھ لے گئے تھے۔

سپنا کے پاؤں تھرتھرانے لگے۔ گرتے گرتے اس نے بایاں ہاتھ پھیلا کر کسی چیز کا سہارا لینا چاہا اور ایک جھٹکے سے اس کا ہاتھ دروازے پر پڑ گیا وہ وہیں زمین پر بیٹھ گئی۔ ساتھ ہی اس کے منہ سے کراہ نکل گئی۔ پھر وہ اسی طرح آہستہ آہستہ دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی اس کا دل بری طرح سے دھڑک رہا تھا جیسے سینہ پھاڑ کر نکل آئے گا۔ پورے گھر میں قبرستان کی سی خاموشی تھی۔ معاً اس کی نظر فرش پر ٹوٹی ہوئی چوڑیوں پر پڑی جو چاروں طرف بکھری ہوئی تھیں۔ فرش پر کہیں کہیں اسے خون کے دھبے دکھائی دیئے۔ دشمن کے تشدد کے دوران اس کی ماں کی چوڑیاں نہ صرف ٹوٹ گئی تھی بلکہ کلائیاں بھی زخمی ہو گئی تھیں۔

وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ وہ چشم تصور میں دیکھ رہی تھی کہ دشمن اس کی ماں کو بربریت کا نشانہ بنا رہا ہے۔ پھر اس کے کانوں میں ماں کی لرزیدہ آواز گونجنے لگی۔ ''سپنا! مجھے تمہارے آنسوؤں کی نہیں عزم و حوصلے کی ضرورت ہے۔ اب تمہیں اپنے باپ کی موت ہی کا نہیں بلکہ میرا بھی انتقام لینا ہے تم نے حوصلہ نہیں ہارنا' یہاں سے جتنا جلد ہو سکے نکل جانا' کہیں ایسا نہ ہو کہ دشمن تمہاری تلاش میں پہنچ جائے وہ تمہیں بھی زندہ نہیں چھوڑے گا۔ اٹھو بیٹی! زندگی میں ایسے نشیب و فراز بہت سارے آتے ہیں۔ آدمی کو حالات کے پل صراط سے حوصلے سے گزرنا پڑتا ہے۔ تمہارے پاس وقت بہت کم ہے۔''

اس نے جلدی سے اپنے آنسوؤں کو ساڑھی کے پلو میں جذب کیا۔ خود پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگی۔ چند لمحوں کے بعد اس نے اپنے اندر توانائی سی محسوس کی اور اسے ایک آس سی پیدا ہو گئی تھی کہ شاید اس کی ماں زندہ ہو۔ اس وقت تک دشمن اس کی ماں کو قتل نہیں کرے گا جب تک رقیہ خانم اور ڈائری کا پتا نہیں چل جاتا۔ یہ سب کچھ سوچتے ہوئے اس نے کھڑے ہونے کی کوشش کی۔ وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب ہو گئی۔ پھر اسے بڑے

زور کی پیاس محسوس ہوئی۔ حلق میں کانٹے چبھ رہے تھے۔

صحن کی طرف جاتے ہوئے اس نے محسوس کیا کہ وہ بہت نحیف اور کمزور ہو گئی ہے۔ جیسے اس کے جسم میں سے کسی نے بہت سارا خون نچوڑ لیا ہو۔ وہ ہلتی ڈولتی کسی نہ کسی طرح صحن میں پہنچی نیم کے پیڑ کے نیچے رکھے ہوئے مٹکے سے پانی نکال کر پیا۔ پانی پینے سے اس کے دھک دھک کرتے دل کو کسی قدر سکون ملا۔ جب وہ اپنے کمرے میں آئی تو اسے بار بار ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی چیز بار بار سانپ کی طرح کنڈلی مار کر اس کے حلق سے باہر نکلنے کیلئے بے تاب ہو رہی ہو۔ وہ بستر پر بیٹھ کر لمبے لمبے سانس لینے لگی۔

تھوڑی دیر میں اس نے بڑی حد تک خود پر قابو پا لیا۔ اس نے اپنا پرس اٹھا کر اس میں سے بینک سے لائی ہوئی رقم نکال کر گریبان میں رکھ لی۔ اس کے پرس میں اتنی رقم پڑی تھی کہ سفر کے کام آ سکتی تھی۔ اس نے دستی بیگ اٹھا کر دیکھا۔ وہ اس قابل نہیں رہا تھا کہ اسے ساتھ لے جایا جا سکے۔ اسے چاقو کی نوک سے چاروں طرف سے کاٹ دیا گیا تھا۔ سوٹ کیس بھی استعمال کے قابل نہیں رہا تھا۔ آخر اس نے ایک چھوٹا سا دستی بیگ تلاش کر لیا جو پرانا اور بوسیدہ تھا مگر اس میں تین چار جوڑے آسانی سے آ سکتے تھے۔ اس میں اس نے اپنے جوڑے رکھے۔ پھر اس نے تالا تلاش کیا جو اسے کھانے کی میز کے نیچے پڑا ہوا ملا۔ اس میں چابی بھی لگی ہوئی تھی۔ اس نے اپنا حلیہ درست کرنے کے ارادے سے آئینے میں اپنے چہرے کا جائزہ لیا تو وہ چونک پڑی وہ برسوں کی مریض لگ رہی تھی۔ چہرہ مردے کی طرح سفید ہو رہا تھا۔ اس نے جلدی سے غسل خانے میں جا کر منہ دھویا۔ اپنا حلیہ درست کیا۔ باہر نکلنے سے پہلے اس نے گلی میں جھانکا تو پڑوسی کے دو لڑکوں کو گلی میں کھیلتے دیکھا۔ اس نے باہر نکل کر ان لڑکوں کو آواز دی۔ جبار! بذلو! ادھر آؤ۔ میری بات سنو۔"

وہ دونوں کھیل چھوڑ کر لپک کر اس کے پاس آ کھڑے ہو گئے۔ جبار نے حیرت سے پوچھا۔ "آپا! آج آپ کالج نہیں گئیں؟"

"نہیں۔" اس نے جواب دیا۔ "امی کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اس لئے آج چھٹی کر لی۔"

"ایک گھنٹہ پہلے ایک نئی اور خوبصورت سی گاڑی آپ کے گھر پر آئی تھی۔" بذلو بولا۔

"اچھا۔" وہ چونک سی گئی۔ "وہ امی کی طبیعت پوچھنے آئے ہوں گے۔ گاڑی میں کتنے آدمی تھے۔"

''کیا آپ کو معلوم نہیں کہ کتنے آدمی آئے تھے؟'' بذلو تعجب سے اس کی شکل دیکھنے لگا۔''آپ تو گھر میں تھیں نا۔''

''میں امی کیلئے دوا لینے ڈاکٹر کے پاس گئی تھی۔'' سپنا نے جھوٹ بولا۔''گھر آئی تو امی نہیں تھی۔''

''کل تین آدمی تھے وہ۔'' جبار نے بتایا۔

''کیسے تھے وہ؟''

''انہوں نے سفاری سوٹ پہن رکھے تھے اور کالے شیشوں کے رنگ کے چشمے پہن رکھے تھے۔'' جبار نے کہا۔

''میری امی کیا ان لوگوں کے ساتھ گئی ہیں؟'' سپنا نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''ہم نے گاڑی کو واپس جاتے ہوئے نہیں دیکھا لیکن وہ گاڑی بہت دیر تک کھڑی رہی تھی۔'' جبار نے بتایا۔

''اچھا!'' سپنا نے اداسی سے ایک گہرا سانس لیا۔''تم دونوں میں سے کوئی ایک میرے لئے رکشہ لے آؤ۔''

''کہاں جانے کیلئے۔'' جبار نے پوچھا۔

''ریلوے سٹیشن۔'' سپنا نے متوحش نظروں سے گلی کا جائزہ لیا۔ اسے ایک انجانہ سا خوف محسوس ہو رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ دشمن کسی بھی لمحے اس کی تلاش میں آ سکتا ہے۔ وہ دھک دھک کرتے ہوئے دل سے بولی۔''جلدی کرو۔ مجھے دیر ہو رہی ہے کہیں گاڑی نہ چھوٹ جائے۔ مجھے اپنی ایک سہیلی کو الوداع کہنے کیلئے جانا ہے جو ڈھاکہ جا رہی ہے۔''

سپنا نے اپنے پرس سے پانچ کا ایک نوٹ نکال کر ان کی نظروں کے سامنے لہرایا۔

''تم دونوں اس کی آئس کریم کھا لینا۔''

وہ دونوں تیزی سے دوڑتے ہوئے گلی سے نکل گئے۔ سپنا ان تینوں بدمعاشوں کے بارے میں سوچنے لگی جو گاڑی میں اس کے گھر پر آئے تھے۔ ان میں ایک یقیناً وقار حسین ہو گا۔ اگر وہ کسی وجہ سے ان کے ساتھ نہیں آیا ہو گا تو پھر اس نے اپنے آدمی بھیجے ہوں گے۔ وہی بدمعاش اس کی امی کو اغوا کر کے نامعلوم مقام پر لے گے۔ اللہ جانے انہوں نے اس کی ماں کے ساتھ کیا سلوک کیا ہو گا؟ اس کا دل اور آنکھیں بھر آئیں۔

تھوڑی ہی دیر میں جبار اور بذلو ایک سائیکل رکشہ لے آئے۔ اس نے رکشہ کو گلی میں داخل ہوتا دیکھ کر جلدی سے اپنے آنسو پونچھے۔ مکان کے دروازے پر تالا لگا دیا۔ رکشہ

قریب پہنچا تو وہ دستی بیگ اور لباس کو سنبھالتی ہوئی رکشہ میں سوار ہوگئی پھر وہ رکشہ والے سے مرتعش لہجے میں بولی۔ ''جلدی چلو۔''

رکشہ والا جوان آدمی تھا۔ وہ تیزی سے رکشہ چلانے لگا۔ اس سے کہیں تیزی سے اس کا ذہن سوچ رہا تھا۔ اس نے فیصلہ کرلیا تھا کہ وہ چاند پور کے ریلوے سٹیشن پر اتر جائے گی پھر گھاٹ سے باریسال جانے والے کسی بھی اسٹیمر یا تیز رفتار لانچ میں سوار ہو جائے گی۔ وہ چھ سات برس پہلے اپنی ماں کے ساتھ ایک مرتبہ تعطیلات میں باریسال جا چکی تھی۔ زلیخا آنٹی اسے اچانک اور غیر متوقع دیکھ کر کسی قدر خوش اور حیران ہوں گی۔ کتنی سندر لگ رہی ہے۔ ماں کو ساتھ نہ دیکھ کر ان کی حیرت کی انتہا نہ رہے گی۔ پھر وہ انہیں ساری کہانی سنائے گی۔ انہیں یقین نہیں آئے گا پھر وہ اسے سینے سے لگالیں گی اور اسے تسلی دیں گی کہ فکر نہ کرو پھر وہ اسے کچھ دنوں کے بعد حفاظت سے کلکتہ پرکاش آنند کے پاس پہنچا دیں گی۔

ریلوے سٹیشن آ گیا تھا وہ سراسیمگی سے اتر پڑی۔ اس نے کرایہ ادا کیا۔ ٹکٹ گھر کی طرف بڑھتے ہوئے اسے اپنے پیر منوں بھاری لگ رہے تھے۔ دل دھک دھک کر رہا تھا کہ کہیں دشمن اس کے تعاقب میں تو نہیں پہنچ گیا۔ اسے یہاں بھی نادیدہ دشمنوں کی آنکھیں اپنی طرف دیکھتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ اسے ایسا لگ رہا تھا کہ دشمن اس کے گرد اپنا حصار قائم کر رہا ہے۔ وہ اسے شاید گاڑی میں سوار نہ ہونے دے۔ وہ اگر سوار ہو گئی تو شاید اسے چلتی گاڑی سے دھکا دے دیا جائے۔ اندیشوں کے سانپ تھے کہ اسے ڈس رہے تھے۔

وہ ٹکٹ لے کر زنانہ ویٹنگ روم کی طرف جا رہی تھی کہ ایک دم سے ٹھٹھک کے رک گئی۔ اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ اس کا جسم سن ہونے لگا۔ اس نے وقار حسین کو دیکھا جو مردانہ ویٹنگ روم سے نکل کر ایک بک سٹال کی طرف جا رہا تھا۔ اس نے دہشت زدہ ہو کر سوچا وقار حسین کا سٹیشن پر ہونا اتفاق کی بات ہے یا وہ اس کی تلاش میں آیا ہے۔

سپنا نے خود کو فوراً سنبھال لیا اور تیزی سے لپک کر زنانہ ویٹنگ روم میں داخل ہو گئی۔ ویٹنگ روم میں ایک معمر عورت کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ وہ اخبار پڑھنے میں منہمک تھی۔ سگریٹ بھی پی رہی تھی اس کے چہرے مہرے اور وضع قطع سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ کسی افسر کی بیوی ہے۔ اس کے پاس صرف ایک دستی بیگ تھا۔ اس عورت نے سپنا کے قدموں کی آواز سن کر اخبار سے نظریں ہٹا کر دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا۔ وہ دیوار کے پاس والی آرام دہ کرسی پر ڈھیر ہو گئی۔ اس کی پیشانی عرق آلود ہو رہی تھی۔ اس نے جلدی سے پرس سے

رومال نکال کر پسینہ خشک کیا۔ وہ اپنے دھک دھک کرتے دل پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگی۔

تھوڑی دیر کے بعد ایک ریل گاڑی پلیٹ فارم پر آ گئی۔ اس کی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ وہ ویٹنگ روم سے نکل کر گاڑی میں سوار ہو جائے۔ وقار حسین کے آسیب نے اسے بری طرح جکڑ لیا تھا۔ وہ عورت گاڑی کی آمد سے چند لمحے پہلے نکل کر جا چکی تھی اس کے دل و دماغ میں بڑی کشمکش جاری تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ کیوں نہ وہ دوسری گاڑی سے نکل جائے جو ایک گھنٹے کے بعد آنے والی تھی مگر وہ لیٹ بھی ہو سکتی تھی کیونکہ اس وقت جو گاڑی آئی تھی وہ پورے بیس منٹ لیٹ تھی اس کیلئے یہاں ایک منٹ رکنا بھی خطرے سے خالی نہیں تھا۔ اس بات کا قوی امکان تھا کہ دشمن اسے اس وقت سٹیشن پر نہ پا کر اور گاڑی میں سوار نہ ہوتا دیکھ کر اس کی تلاش شروع کر دے۔ وہ اس روم میں بھی جھانک کر دیکھ سکتا ہے۔ دشمن کیلئے اسے اغوا کر کے لے جانا کونسا مشکل کام ہو گا۔ ادھر چند برسوں سے لاقانونیت کا دور دورہ تھا۔ دن دہاڑے عورتوں کا اغوا روز کا معمول بن گیا تھا اس کیلئے گاڑی کا ڈبہ ہی محفوظ ہو گا۔ مسافروں کی موجودگی اور چلتی گاڑی کی وجہ سے دشمن اسے نہ کوئی نقصان پہنچا سکے گا نہ اغوا کر سکے گا۔

اس نے خیالوں سے نکل کر پلیٹ فارم کی طرف دیکھا۔ گاڑی رینگنے لگی تھی اس نے جلدی سے اپنا دستی بیگ اور پرس سنبھالا اور ویٹنگ روم سے نکل کر وہ بدحواسی کے عالم میں گاڑی کی طرف لپکی۔ سامنے جو ڈبہ آیا اس کے دروازے کا ہینڈل پکڑ کر گھمایا۔ دروازے کے کھلتے ہی وہ اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے سوار ہو گئی۔ اس کے اندر قدم رکھتے ہی گاڑی نے رفتار پکڑنا شروع کر دی۔

وہ ڈبہ دیکھ کر چونک پڑی۔ پورا ڈبہ خالی پڑا تھا۔ بے حد صاف ستھرا تھا اور آئینے کی طرح چمک رہا تھا۔ فرسٹ کلاس ہونے کی وجہ سے شاید خالی تھا اور پھر اس گاڑی کی منزل چاند پور تھی اس نے کھڑکی کے پاس اپنا سامان رکھتے ہوئے سوچا منزل زیادہ دور نہیں ہے صرف دو ایک سٹیشن کے بعد چاند پور آ جائے گا۔ گاڑی جیسے جیسے منزل کے قریب ہوتی جاتی ہے ویسے ویسے گاڑی خالی ہوتی جاتی تھی۔

گاڑی تیز رفتاری سے سفر طے کرنے لگی تو اس نے اطمینان وسکون کا سانس لیا۔ اب ڈبے میں کسی کے ہونے کا خطرہ نہیں تھا۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے اس کے رخساروں اور بالوں سے کھیلنے لگے تو اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ گو ایک طرح سے اسے فرحت سی

محسوس ہو رہی تھی تو دوسری طرف اسے سینے میں پھانس گڑی محسوس ہو رہی تھی۔ اسے بار بار اپنی ماں کا خیال آ رہا تھا۔

وہ کتنی ہی دیر آنکھیں بند کیے بیٹھی رہی ایک دم سے اسے احساس ہوا کہ ڈبے میں کوئی کھڑا اسے دیکھ رہا ہے۔ اس نے یکلخت اپنی آنکھیں کھول دیں اسے ایک بجلی کا جھٹکا لگا۔ دروازے کے پاس دو بدمعاش کھڑے اسے خطرناک نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ اسے اس طرح دیکھ رہے تھے جیسے آسمان سے کوئی پری اتر آئی ہو۔ پھر وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرائے ایسی مسکراہٹ جو شکاری اپنے شکار کو نہتا دیکھ کر مسکراتا ہے۔ ایک بدمعاش نے جس کے چہرے پر چاقو کا گہرا نشان تھا اور جس کا چہرہ نشان کی وجہ سے بہت بھیانک لگ رہا تھا وہ اپنے ساتھی سے بولا۔ ''کتنی سندر ہے کسی پری کی طرح لگ رہی ہے۔''

''یہ سپنا ہے۔'' دوسرے بدمعاش نے اپنے ساتھی سے کہا۔ ''بلقیس بانو استانی کی بیٹی کالج میں پڑھتی ہے۔''

''اچھا۔ اچھا یہ وہی سپنا ہے۔'' پہلے بدمعاش نے اسے میٹھی نظروں سے گھورتے ہوئے سر ہلایا۔ ''لکشام میں' میں نے اس کے حسن کا چرچا سنا تھا۔ تم نے بھی شاید ایک دو مرتبہ اس کی تعریف کی تھی۔ جیسا سنا اسے ویسا ہی پایا مگر یہ اکیلی کہاں جا رہی ہے؟''

''کہیں بھی جائے اپنی بلا سے۔'' دوسرے بدمعاش نے مکروہ ہنسی سے کہا۔ ''اپنی قسمت دیکھو یار یہ چاند اپنی جھولی میں آ گیا۔''

''ہم نے خواب میں نہیں سوچا تھا کہ کوئی کالج کی لڑکی بھی ہاتھ لگ سکتی ہے۔ تو سچ کہتا ہے ہماری قسمت جاگ گئی ہے۔''

سپنا کا سارا وجود جیسے جھنجھنا اٹھا۔ اس نے اپنی زندگی میں پہلی بار ایسے بے ہودہ فقرے سنے تھے اور اس طرح بدمعاشوں سے واسطہ پڑا تھا۔ وہ اس سے پہلے کبھی ایسی صورتحال سے دوچار نہیں ہوئی تھی۔ اس پر ایک نئی افتاد آن پڑی تھی اس نے تو اس کے بارے میں خواب و خیال میں بھی نہیں سوچا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے کیا کر سکتی تھی۔ وہ نہتی تھی۔ اس کے پاس دفاع کرنے کیلئے کچھ بھی نہ تھا۔ وہ بھوکے بھیڑیوں کے درمیان کسی دہشت زدہ ہرنی کی طرح تھی اس کی نسوں میں خون سرد تھا۔ ان کی جلتی نگاہیں وہ اپنے جسم پر محسوس کر کے حوصلہ ہارتی جا رہی تھی۔ وہ دونوں بدمعاش کیا چاہتے ہیں ان کے بشرے اور آنکھوں سے صاف عیاں تھا۔ اس پر لرزہ سا طاری ہونے لگا۔

چند ثانیوں کے بعد اس نے اپنی قوت کو مجتمع کیا اور پھر شعلہ بار نگاہوں سے ان دونوں کو گھورتی ہوئی ہذیانی آواز میں بولی۔ ''کون ہو تم؟ میرے ڈبے میں کیوں آئے ہو؟ چلو نکلو۔''

''ہم تمہارے پرستار ہیں جان من!'' پہلے والے بدمعاش نے کسی فلمی ہیرو کے انداز میں ہنستے ہوئے کہا۔ ''ہم کس لئے آئے ہیں؟'' اس نے توقف کر کے اپنے ساتھی کی طرف شرارت سے دیکھا پھر سپنا کی طرف رخ کرتے ہوئے بولا۔ ''ابھی معلوم ہو جاتا ہے۔''

''ہم اپنے اس چاند کے ہمراہ چاند پور تک چلیں گے اور دل بھی بہلاتے جائیں گے۔'' دوسرے بدمعاش نے کسی عاشق کے انداز میں اپنے سینے پر ہاتھ رکھ لیا۔

ان دونوں بدمعاشوں کی بدنیتی اور گھناؤنے ارادوں اور ان کے خوفناک چہروں کی درندگی نے اس کے حواس جیسے معطل کر دیئے تھے۔ اس کے دماغ نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ وہ دونوں آپس میں باتیں کرنے لگے تو اسے اس لمحے ایسا لگا جیسے نہ کچھ سنائی دے رہا ہو نہ کچھ دکھائی دے رہا ہو۔ اس خیال سے بھی اس کی حالت غیر ہونے لگی کہ وہ دونوں کے قابو میں آ گئی تو کیسی شرمناک بات ہو گی۔ وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے گی۔ درندگی کا نشانہ بننے سے تو بہتر ہے کہ وہ کھڑکی سے کود کر اپنی جان دے دے۔ ذلت کی زندگی سے عزت کی موت بہتر ہے۔ پھر یک لخت اسے جیسے ہوش آ گیا۔ عزت بچانے اور ان بدمعاشوں کے ہاتھوں محفوظ رہنے کا ایک راستہ تھا۔ اس کے سارے بدن میں خوشی کی لہر دوڑ گئی اور حوصلہ سا پیدا ہو گیا۔ اس نے زنجیر کی طرف دیکھا اور اپنا ہاتھ بڑھا کر اس کے لٹو کو مضبوطی سے پکڑ کے نفرت اور غصے سے چیخ کر بولی۔ ''میں کہتی ہوں دفع ہو جاؤ میری نظروں کے سامنے سے ورنہ زنجیر کھینچ لوں گی۔''

وہ دونوں اس کی بات سن کر ہنسنے لگے۔ پہلے والے بدمعاش نے اپنے ساتھی سے کہا۔ ''یہ غصے میں کتنی پیاری لگ رہی ہے؟''

دوسرے بدمعاش نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔ وہ سپنا سے بولا۔ ''میری رانی! ٹرین کی زنجیر کھینچ کر کیا کرو گی؟ تم ذرا میرے دل کی زنجیر کھینچ کر دیکھو میں تمہارے پاس کھنچا چلا آتا ہوں۔''

''میں تم کو پولیس کے حوالے کر دوں گی۔'' سپنا کے لہجے میں تحکم تھا۔

''پولیس۔'' ان دونوں پر ہنسی کا دورہ پڑ گیا۔ ان میں سے دوسرا بدمعاش کہنے لگا۔

''رانی جی! ہم پولیس کے مقابلے میں پھر بھی شریف آدمی ہیں۔ آپ کو شاید پولیس کا تجربہ نہیں اس لئے ایسی بات کہہ رہی ہیں۔ وہ ہمیں تھانے لے جا کر چھوڑ دے گی مگر آپ کو نہیں۔ گھر سے بھاگنے کے الزام میں حوالات میں بند کر دے گی اور تین چار دن تک آپ کی آؤ بھگت کرنے کے بعد آپ کو اس شرط پر جانے دے گی کہ آپ ان کے خلاف ایک لفظ بھی کسی سے نہیں کہیں گی۔''

پولیس کے بارے میں اس نے جن خیالات کا اظہار کیا تھا وہ غلط نہ تھے۔ یہ سچ تھا کہ جرائم کی سرپرستی پولیس کر رہی تھی۔ پورے ملک میں ایک طرح سے پولیس راج تھا۔ وہ حقارت سے بولی۔ ''میں گھر سے بھاگ کر تھوڑی جا رہی ہوں میں تمہاری باتوں میں نہیں آنے کی۔ تم جاتے ہو کہ یا زنجیر کھینچوں۔''

''چشم زدن میں ان دونوں کے ہاتھوں میں خوفناک قسم کے چاقو تڑپ رہے تھے۔ پہلے بدمعاش نے چاقو لہراتے ہوئے سپنا کو گھورا۔ اس کی آنکھوں میں ایک سفاک چمک تھی۔ وہ سپنا کی طرف ایک قدم بڑھا اور خشونت سے بولا۔ ''تمہارے زنجیر کھینچنے سے پہلے یہ چاقو تمہارے سینے میں اتر جائے گا۔ سوچ لو۔''

سپنا لرز کے رہ گئی۔ اس کی آنکھوں سے خوف و ہراس جھانکنے لگا۔ اس نے اس بدمعاش کی دھمکی کی پروانہ کرتے ہوئے خوف سے سن ہو جانے والے ہاتھ سے زنجیر کھینچنے کی کوشش کی۔ وہ بدمعاش برقی سرعت سے اس کی طرف لپکا۔ سپنا زنجیر کھینچنے بھی نہ پائی تھی کہ اس نے اس کا ہاتھ پکڑ کے کھینچا اور دھکا دیا تو وہ اپنا توازن قائم نہ رکھ سکی۔ نشست پر دھپ سے جا گری اور اس کا سر دیوار سے ٹکرایا۔

سپنا کے سر پر معمولی سی چوٹ آئی تھی۔ وہ تو فوراً ہی سنبھل کر کھڑی ہو گئی۔ وہ ایک قدم پیچھے ہٹ کر دہشت زدہ لہجے میں بولی۔ ''کمینو! میری بات سنو تم رقم لوٹنے آئے ہو تو میں دینے کیلئے تیار ہوں مگر میری ایک شرط ہے تم رقم لے کر چلے جاؤ گے۔''

''تمہارے پاس کتنی رقم ہے رانی جی!'' دوسرے والے بدمعاش نے استہزائی انداز سے پوچھا۔

''پانچ ہزار ٹاکا!'' سپنا کے منہ سے بلا ارادہ نکل گیا۔

''سچ۔'' پہلے والے بدمعاش کا چہرہ کھل اٹھا اور اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ اس نے اپنے ساتھی کی طرف فاتحانہ نظروں سے دیکھا پھر اس کے ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔ ''آج کتنا زبردست شکار ملا ہے ہمارے تو وارے نیارے ہو گئے۔''

''کہاں ہیں پانچ ہزار ٹاکا؟'' دوسرے بدمعاش نے آگے بڑھ کر اپنا ہاتھ اس کے آگے پھیلایا۔

''پیچھے ہٹ کر کھڑے ہو۔'' وہ برہمی سے بولی۔

دوسرا بدمعاش کسی سعادت مند بچے کی طرح پہلے بدمعاش کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ ان دونوں کے ہونٹوں پر شریر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ وہ اسے اس طرح دیکھ رہے تھے جیسے وہ دنیا کی سب سے احمق ترین عورت ہے۔

''اس بات کی ضمانت ہے کہ تم رقم لینے کے بعد اپنے ارادوں سے باز آ جاؤ گے۔'' سپنا نے تیزی سے کہا لیکن اس کی آواز مرتعش ہو رہی تھی۔

''کیسے ارادوں سے؟'' پہلے بدمعاش نے تمسخر سے پوچھا۔ ''ہمارے ارادے تو بہت نیک ہیں۔''

''کیا میں نہیں جانتی کہ تمہارے ارادے کتنے نیک ہیں۔'' سپنا نے مٹھیاں بھینچ لیں۔ ''کیا تم نے مجھے بے قوف سمجھ رکھا ہے؟''

''تم نے جو رقم دینے کا ایک ارادہ ظاہر کیا ہے اسے جلدی سے پورا کرو تاکہ ہم اپنے ارادے پورے کر سکیں اور یہاں سے چلے جائیں۔''

سپنا کو ان کی باتوں پر اعتبار نہیں آ رہا تھا۔ اس کا ذہن بڑی تیزی سے ایسی تدبیر سوچنے لگا تھا جس سے نہ صرف اس کی رقم بلکہ عزت و آبرو بھی بچ جائے۔ وہ دل میں دعا کر رہی تھی کہ جلدی سے کوئی سٹیشن آ جائے۔ وہ انہیں تھوڑی دیر باتوں میں لگا کر رکھ سکتی تھی۔ وہ زیادہ دیر تک ایسا نہیں کر سکتی تھی۔ یوں بھی یہ بدمعاش بہت چالاک اور خطرناک دکھائی دے رہے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں خوفناک قسم کے چاقو دیکھ کر اس کی جان نکلی جا رہی تھی۔ تاہم اس نے اپنے حوصلے کو کسی نہ کسی طرح ابھی تک برقرار رکھا ہوا تھا۔ پھر ایک خیال اس کے ذہن میں بجلی کی طرح آیا۔ وہ اس نفسیاتی حربے کو آزما کر اپنے آپ کو ہر طرح سے بچا سکتی تھی۔ اس خیال کے آتے ہی اس نے اپنا دستی بیگ اٹھا لیا اور اسے سینے سے لگا کر بولی۔

''اس بیگ میں پانچ ہزار کی رقم کے علاوہ پچاس ہزار ٹاکا کے سونے کے زیورات بھی ہیں۔ تم ان زیورات کو مجھ سے نہیں چھینو گے بلکہ صرف رقم لو گے۔''

''سونے کے زیورات؟'' ان دونوں بدمعاشوں کی زبان سے بیک وقت نکلا۔ انہیں جیسے یقین نہیں آیا۔ ان دونوں نے حیرت و خوشی سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ پھر دوسرے بدمعاش نے اس کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ ''کیا تم گھر سے بھاگ کر جا رہی ہو؟''

''کام کی بات کرو۔'' وہ تلخی سے بولی۔ ''میں نے جو پوچھا ہے اس بات کا جواب دو۔''

''جواب یہ ہے رانی جی!'' پہلا بدمعاش اپنے چاقو کی دھار پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ ''ہم آپ کو صاف صاف بات بتا دینا چاہتے ہیں ہم اپنے کسی ارادے سے باز نہیں آئیں گے۔ ہم کوئی چیز نہیں چھوڑیں گے' نہ رقم' نہ زیور اور نہ تمہیں۔''

سپنا نے بغیر کسی تاخیر کے اپنا دستی بیگ کھڑکی سے باہر پھینک دیا پھر وہ حقارت سے بولی۔ ''اب تمہیں صرف ایک چیز مل سکتی ہے۔''

وہ ایک دم سے سناٹے میں آ گئے۔ پھر حواس باختہ ہو کر اس کی شکل دیکھنے لگے۔

پہلا بدمعاش بولا۔ ''یہ تم نے کیا کیا؟''

دوسرا بدمعاش اپنے ساتھی سے بولا۔ ''جلدی کرو اس کو چھوڑو' عورتوں کی کوئی کمی نہیں ہے لیکن اتنا مال پھر نہیں ملے گا۔''

پھر اس نے اپنے ساتھی کا بازو پکڑ کے کھینچا۔ ان دونوں نے بجلی کی سی تیزی سے چاقو بند کر کے جیب میں رکھا اور دروازے کی طرف لپکے پھر وہ دروازہ کھول کر یکے بعد دیگرے نیچے والے پاندان پر پہنچ کر اس طرح سے اتر گئے جیسے کوئی چلتی بس سے اتر جاتا ہے۔ اس نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا وہ صحیح سلامت اتر گئے تھے اور ایک طرف کھڑے ہو کر اپنے کپڑے جھاڑ رہے تھے۔ وہ ان کی اس مہارت پر دنگ رہ گئی تھی۔ اس نے سنا تھا کہ یہ چور رات کے وقت چلتی گاڑیوں سے مسافروں کا سامان چرا کر اتر جاتے ہیں لیکن اسے یقین نہیں آیا تھا لیکن اس حقیقت کو آج اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا۔

سپنا کو بڑا سکون اور فرحت سی ہو رہی تھی۔ خوشی کا احساس نشہ بن کر اس کی رگ رگ میں اترنے لگا۔ اسے اپنے چند جوڑوں کے جانے کا کوئی غم نہیں تھا۔ مسرت انگیز بات یہ تھی اس کی نفسیاتی تدبیر کارگر ثابت ہوئی تھی۔ وہ اس کے فریب میں آ گئے تھے۔ اگر وہ ذہانت سے کام نہ لیتی تو پھر اس کے پاس کچھ بھی نہ بچتا۔

پھر اسے ماں کی باتیں یاد آنے لگیں۔ اس کی ماں نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ ذہانت جرأت اور عزم و حوصلے سے نہ صرف حالات بلکہ بڑے سے بڑے خطرناک بدمعاش اور شیطانوں کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ اس نے جو آج جرأت کا مظاہرہ کیا تھا جو کامیابی اسے نصیب ہوئی تھی اس نے اس کے حوصلے بہت بلند کر دیئے تھے۔ وہ اپنے اندر ایک توانائی سی محسوس کر رہی تھی۔

گاڑی تھوڑی دیر کے بعد ایک چھوٹے سے سٹیشن پر رکی۔ یہ گاڑی عموماً کسی چھوٹے سٹیشن پر رکتی نہیں تھی۔ کس وجہ سے رکی تھی یہ بات اس کی سمجھ میں تھوڑی دیر کے بعد آ گئی تھی۔ اس ڈبے میں ایک بارات سوار ہوئی تھی۔ اس بارات کیلئے یہ گاڑی روکی گئی تھی۔ یہ بارات دلہن لے کر چاند پور جا رہی تھی۔ اس بارات میں دس مرد اور کوئی بیس بائیس بچے اور عورتیں تھیں۔ اس نے دلہن کو دیکھا تو اس کا دل خوش ہو گیا۔ وہ سترہ اٹھارہ برس کی سونی صورت کی تھی۔ وہ بڑی غمگین اور دل گرفتہ سی دکھائی دے رہی تھی۔ وہ اس کا سبب جانتی تھی۔ جب لڑکیاں اپنا میکہ چھوڑتی ہیں اور والدین سے جدا ہوتی ہیں تو اس طرح غمگین اور جذباتی ہو جاتی ہیں مگر جلد ہی دلہن کی اداسی کا سبب اس پر عیاں ہو گیا۔ دلہا عمر میں اس کے باپ سے بھی بڑا ہوگا۔ اس کے چہرے پر بڑھاپے کی جھریاں تھیں۔

سپنا کیلئے یہ کوئی حیرت کی بات نہ تھی۔ بنگلہ دیش ہی میں نہیں ساری دنیا میں ایسی بے جوڑ شادیاں ہوتی تھیں۔ یہ دولت اور مجبوریوں کے کھیل تھے۔ لڑکیوں کے غریب والدین معاشی بدحالی کی وجہ سے ان کی شادیاں امیر کبیر بوڑھے مردوں سے کر دیتے تھے۔

اس ڈبے میں بارات کے سوار ہونے کی وجہ سے اب وہ بالکل محفوظ ہو گئی تھی۔ وہ باراتی عورتوں سے گھل مل کر باتیں کرنے لگی تھی۔ یہ بارات کھلنا سے آئی تھی۔ چاند پور میں ایک دن رک کر دوسرے دن اسٹیمر سے کھلنا جانے والی تھی۔

سپنا چاند پور کے ریلوے سٹیشن پر بارات کے ساتھ اتری تو اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا اسے اب بھی عدم تحفظ کا بڑا احساس ہو رہا تھا۔ ایک انجانا خوف اس کے اعصاب کو شکستہ کر رہا تھا۔ وہ پلیٹ فارم سے نکل کر گھاٹ کی طرف بڑھی جہاں سے اسٹیمر اور لانچیں چھوٹے بڑے شہروں کو جاتی تھیں۔ اس وقت یہاں بڑی بھیڑ بھاڑ تھی۔ نفسانفسی کا عالم تھا۔ مسافروں سے زیادہ بھیک مانگنے والوں کا ہجوم تھا۔ کوئی بھکاری جوان لڑکی اور عورت ایسی نہ تھی جس کی گود میں ایک دو بچے نہ ہوں۔ اس کے پیچھے دو ایک بھکاری عورتیں لگ گئیں۔ اسے ان سے پیچھا چھڑانا مشکل ہو گیا۔ وہ اگر انہیں بھیک دیتی تو اسے بیس پچیس بھکاری عورتیں گھیر لیتیں اسی لیے وہ انہیں ڈانٹ کر بھگانے کی کوشش کر رہی تھی۔ ایک سپاہی نے آخر اس مصیبت سے نجات دلائی۔ اس نے ان عورتوں پر ڈنڈے برسا کر بھگا دیا۔

سپنا نے گھاٹ پر پہنچ کر باریسال جانے والے اسٹیمر اور لانچوں کے بارے میں انکوائری کاؤنٹر سے معلومات حاصل کیں۔ اسے بتایا گیا کہ تھوڑی دیر پہلے ہی ایک اسٹیمر جو ڈھاکہ سے آئے گا اور ڈیڑھ گھنٹے کے بعد سرساگر نامی لانچ باریسال کیلئے روانہ ہو گی۔ وہ

کاؤنٹر سے ہٹ کر سوچنے لگی کہ وہ ایک گھنٹہ کہاں گزارے؟ مردوں کی تیز نگاہیں اسے پریشان کر رہی تھیں۔ اسے تنہا پا کر وہ کچھ اور ڈھیٹ ہو رہے تھے۔ ایک دو مردوں نے اس کے قریب سے گزرتے ہوئے اسے دھکا بھی دیا تھا۔ اس نے سوچا کہ کیوں نہ وہ اپنا وقت کسی ریسٹورنٹ میں گزارے۔ اسے کچھ بھوک بھی محسوس ہونے لگی تھی۔

ایک قلی نے اسے بتایا کہ گھاٹ کے باہر میگھنا ریسٹورنٹ ہے جو ایک اعلیٰ درجے کا ریسٹورنٹ ہے۔ ایئر کنڈیشن ہے۔ اس کے کھانے بہت لذیذ ہوتے ہیں۔ اس کی ایک کپ چائے صرف بیس ٹاکا کی ہے۔ سپنا اس ریسٹورنٹ کی طرف بڑھی۔

سپنا چلتے چلتے ایک دم سے ٹھٹھک کر رک گئی۔ کوئی تیس پینتیس قدم پر جو ٹیلی فون بوتھ تھا اس کا دروازہ کھلا تو اس میں سے ایک دراز قد مرد نمودار ہوا جو عمدہ قسم کے سفاری سوٹ میں ملبوس تھا اور اس کی وجاہت میں اضافہ کر رہا تھا۔ اس مرد کو دیکھ کر اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اور وہ جہاں کھڑی تھی وہیں کھڑی رہ گئی۔

اگر وہ اس جگہ کے بجائے کسی کھلی اور ویران جگہ پر کھڑی ہوتی تو اس کی خوف و دہشت سے چیخ نکل جاتی۔ یہ وقار حسین تھا۔ ہو بہو وقار حسین جو اس کے تعاقب میں یہاں تک پہنچ گیا تھا۔ وہ وقار حسین کو پہچاننے میں کبھی غلطی نہیں کر سکتی تھی۔ وہی چہرہ' وہی مسکراہٹ' وہی قد و قامت' صرف اگرچہ ایک بار وہ وقار حسین سے ملی تھی لیکن اس کے دل کے نہاں خانے میں کشش ہو کر رہ گئی تھی۔ ویسے بھی وہ اس کے باپ کا دشمن تھا اور اس نے اپنے باپ کے قتل کا بدلہ لینے کا عہد کیا ہوا تھا۔ اس نے اتنی دور ہونے کے باوجود اسے پہچان لیا تھا۔

سپنا کو ایسا لگا جیسے وہ زمین میں گڑ گئی ہو۔ اس کے پیر پتھر کے ہو گئے ہوں۔ اس کا سارا جسم سن تھا۔ جامد و ساکت اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے دل کی حرکت بند ہو گئی ہو۔ بس وہ اسے پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھے جا رہی تھی۔ اتنی سکت بھی نہ رہی تھی کہ اپنی جگہ سے ہل سکے۔

☆......☆......☆

وقار حسین نے اسے ابھی تک نہیں دیکھا تھا۔ اس نے چاہا کہ وہ تیزی سے ہٹ جائے۔ کسی مرد، عورت یا قلی کی آڑ میں بیرونی دروازے کی طرف بڑھ جائے مگر اس کے قدم وہیں کے وہیں گڑے رہ گئے۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے اسے گاڑ دیا گیا ہو پھر اسے وقار حسین نے دیکھ لیا۔ اسے دیکھتے ہی وہ بری طرح چونکا اور اس کی طرف بڑھنے لگا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک تضحیک آمیز مسکراہٹ تھی جو اس سے کہہ رہی تھی آخر تم اپنی ماں کی طرح میرے جال میں آ گئیں نا؟ اب تم بچ کر کہاں جاؤ گی۔ ذرا گھوم کر چاروں طرف دیکھو موت تمہارے گرد اپنا حصار قائم کر چکی ہے تمہیں قتل کر کے میگھنا ندی میں پھینک دیا جائے گا اور یہاں تمہیں بچانے والا کوئی نہیں ہے۔

سپنا نے ایک لمحے کیلئے سوچا کہ کیوں نہ وہ چیخ کر لوگوں کو اکٹھا کر لے اور ان سے کہے کہ یہ شخص اس کی جان کا دشمن ہے وہ اسے اغوا کر کے لے جانا چاہتا ہے۔ لوگ اس کی التجا سن کر اس درندے پر ٹوٹ پڑیں گے مار مار کر اس کا بھرکس نکال دیں گے۔ کیا معلوم وہ مر جائے۔ اگر وہ نہیں مرے گا تو اس قابل نہیں رہے گا کہ ہفتوں بستر سے اٹھ سکے۔ یہ سب کچھ سوچتے ہوئے اس نے خوف و دہشت سے چیخ مارنا چاہی مگر اس کی قوت گویائی جیسے جواب دے گئی۔ اسے ایسا لگا جیسے اس کی زبان تالو سے چپک گئی ہو۔ وہ اس کے قریب پہنچ کر رک گیا۔

ذرا سی دیر کیلئے وہ سانس لینا بھول گئی۔ اس کا سر چکرا سا رہا تھا۔ دوسرے لمحے اسے ایسا لگا جیسے یہ شخص وقار حسین نہیں بلکہ اس نے اس کا بہروپ بھرا ہوا ہے اس نے سپنا سے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''میں نے تمہیں کہیں دیکھا ہے؟ تم ڈھاکہ یونیورسٹی میں پڑھتی ہو نا؟''

اس شخص کی آواز اور وقار حسین کی آواز میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ اس نے ایک لمحے کیلئے سوچا کہیں یہ وقار حسین کا جڑواں بھائی تو نہیں ہے۔ اتنی حیرت انگیز مماثلت تو

جڑواں بھائی میں ہی ہوسکتی ہے۔ اس کی بات سن کر سپنا کی جان میں جان آئی۔ اس کی زبان سے غیر ارادی طور پر نکل گیا۔ ''ہاں میں ڈھاکہ میں رہتی ہوں۔ یونیورسٹی میں پڑھتی ہوں۔''

''تم نے مجھے پہچانا؟'' اس نے پوچھا۔ ''سپنا نے بھی سر ہلایا تو وہ بولا۔ ''میرا نام وقار حسین ہے۔''

''آپ کا نام وقار حسین ہے تو میں کیا کروں۔'' اس نے بے اعتنائی سے کہا۔

''تم نے مجھے اشارہ کر کے کس لئے بلایا تھا؟'' وہ بولا۔

''میں نے تو آپ کو نہیں بلایا۔'' سپنا نے کہا۔ اس کا اعتماد تیزی سے بحال ہو رہا تھا۔

پھر وہ معذرت کر کے تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ وہ بے حد حیران اور پریشان تھی اور اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ شخص وقار حسین کا بہروپ بھر کے اور اپنا نام وقار حسین رکھ کر کس لئے گھوم رہا ہے۔ کہیں یہ شخص پاگل تو نہیں ہے یا اس کی کوئی چال ہے؟

وہ میگھنا ریسٹورنٹ کے وسیع و عریض ہال میں داخل ہوئی تو اس کے خوابناک ماحول نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ہال میں خوشگوار خنکی تھی۔ روی شنکر کی ٹھمری نرم اور دھیمی آواز میں گونج رہی تھی۔ ہال بھرا ہوا سا دکھائی دیتا تھا مگر ابھی بھی کچھ میزیں خالی پڑی تھیں۔ کونے والی میز کی طرف بڑھتے ہوئے اس نے بھری میزوں کی طرف دیکھا۔ ان میزوں پر بہت سارے جوڑے بیٹھے تھے۔ ان میں اکثریت مقامی کالج کے طالب علموں کی تھی۔

ویٹر مینو کارڈ لے کر پہنچا تو وہ اس سے بولی کہ دس منٹ کے بعد آ کر آرڈر لے جائے اس نے ایک گلاس پانی پیا تو اسے بڑا سکون سا ملا۔ چند لمحوں کے بعد وہ مینو دیکھنے لگی۔ اچانک اس نے بڑی پیاری سی خوشبو محسوس کی۔ اسے ایسا لگا جیسے اس کی میز کے پاس کوئی کھڑا مہک رہا تھا۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا ایک خوبصورت عورت جو چالیس بیالیس کی رہی ہو گی وہ اس کی طرف دزدیدہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ سپنا کو اپنی طرف متوجہ پا کر اس نے پوچھا۔ ''کیا میں یہاں بیٹھ سکتی ہوں؟''

''کیوں نہیں۔'' سپنا اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔ وہ عورت اسے بڑی باوقار، بردبار اور سنجیدہ دکھائی دی۔

وہ شکریہ کہہ کر کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔ ویٹر میز پر آیا تو اس نے اپنے لئے مرغ پلاؤ

کا آرڈر دیا۔ سپنا کی سمجھ میں ابھی تک کوئی ڈش نہیں آئی تھی۔ اس نے بھی اپنے لئے مرغ پلاؤ کا آرڈر دے دیا۔

ویٹر چلا گیا تو اس عورت نے سپنا سے پوچھا۔ ''آپ کہاں جا رہی ہیں؟''

''باریسال۔'' اس نے جواب دیا۔

''واقعی۔'' عورت کا چہرہ دمک اٹھا۔ ''میں بھی باریسال جا رہی ہوں۔''

''اچھا!'' سپنا ایک لمحے کیلئے وش ہو گئی۔ اس کا چہرہ بھی دمک اٹھا۔ اس نے سوچا اس کیلئے کتنا اچھا ہوا کہ ایک شائستہ قسم کی عورت ہمسفر ہو گئی ہے۔ نہ صرف اس کا سفر اچھی طرح سے بلکہ خیر و عافیت سے گزر جائے گا۔ دل کو ڈھارس بھی رہے گی اور پھر اس عورت کی وجہ سے اسے تحفظ بھی مل جائے گا۔ سفر میں اسے کوئی پریشانی اور ہراساں بھی نہیں کر سکے گا۔ چند لمحوں کے بعد وہ زیر لب مسکراتی ہوئی بولی۔ ''آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔ میں تو تھوڑی دیر پہلے سوچ رہی تھی کہ یہ سفر کتنا بور گزرے گا۔''

''آپ کہاں جا رہی ہیں اور کس کے پاس جا رہی ہیں۔'' عورت اسے پر خیال نظروں سے دیکھنے لگی۔

''کومیلا سے آ رہی ہوں۔'' سپنا نے جواب دیا۔ ''باریسال میں میری ایک آنٹی زلیخا رہتی ہیں ان کے پاس جا رہی ہوں۔''

''اب جبکہ ہم دونوں ہم سفر بن رہی ہیں تو آپس میں تعارف ہو جانا چاہیے۔'' عورت شگفتگی سے بولی۔ ''میرا نام نوری بیگم ہے میں ڈھاکہ میں رہتی ہوں۔ میرے شوہر بزنس مین ہیں۔ میں شوقیہ ایک بوتیک چلاتی ہوں۔ باریسال میں میری ایک چھوٹی بیٹی رہتی ہے وہ کچھ دنوں سے شدید علیل ہے میں اس کی عیادت کو جا رہی ہوں۔''

''میرا نام سپنا چودھری ہے۔ بی اے کے فائنل میں ہوں۔'' وہ کہنے لگی۔ ''میرے والد حیات نہیں ہیں۔ میری امی سکول ٹیچر ہیں۔'' ماں کا نام زبان پر آتے ہی اس کے دل پر ایک چوٹ سی لگی اسے ایک گہرے صدمے کا احساس ہونے لگا۔

ویٹر مرغ پلاؤ لے آیا تو عورت جو کچھ کہنے والی تھی وہ ویٹر کو دیکھ کر خاموش ہو گئی۔ اس کی خوشبو سے اندازہ ہو رہا تھا کہ مرغ پلاؤ بہت لذیذ ہو گا۔ ویٹر میز پر سلاد اور کھانا چن کر چلا گیا تو نوری بیگم مرغ پلاؤ کی پلیٹ اپنی طرف کھینچتے ہوئے بولی۔ ''اس ریسٹورنٹ کا مرغ پلاؤ پورے بنگلہ دیش میں مشہور ہے میں جب باریسال جاتی ہوں تو اس کا مرغ پلاؤ ضرور کھا کر جاتی ہوں۔''

سپنا نے ایک نوالہ لیا۔ نوری بیگم نے غلط نہیں کہا تھا پلاؤ واقعی بہت لذیذ تھا۔ اس نے زیادہ تر میزوں پر مرغ پلاؤ کی پلیٹیں ہی دیکھیں تھیں مگر وہ پوری رغبت سے نہیں کھا رہی تھی۔ اس لئے کہ اندر سے اس کا دل زخمی تھا۔ اس سے جیسے لہو رس رہا تھا۔ اسے ماں کی یاد آ رہی تھی۔ وحشت ناک خیالات کے عفریت اسے پھر سے ڈسنے لگے۔ تھوڑی دیر پہلے جو اسے بھوک محسوس ہوئی تھی اب وہ دم توڑنے لگی تھی۔ اس نے سوچا اسے زندہ رہنے کیلئے تو کھانا ہوگا۔ وہ لقمے زہر مار کر رہی تھی اگر یہ عورت اس کی میز پر نہ ہوتی تو وہ چند لقمے بھی حلق سے نہ اتار پاتی۔

''نہ صرف آپ کا نام بلکہ آپ بہت خوبصورت ہیں۔'' نوری بیگم نے اپنا ہاتھ روک کر اس کی طرف دزدیدہ نظروں سے دیکھا۔ ''گریجویشن کرنے کے بعد آپ کے کیا ارادے ہیں؟ شادی یا ملازمت؟''

وہ لجا سی گئی۔ پھر اس نے جواب دیا۔ ''میرا ارادہ ایم اے کرنے کا ہے مگر پھر میں لیکچرار شپ کیلئے کوشش کروں گی۔''

''لیکچرار شپ میں کیا رکھا ہے۔'' نوری بیگم بولی۔

''آپ فلم لائن یا ٹیلی ویژن میں کیوں نہیں چلی جاتی ہیں؟''

''فلم لائن میں؟'' وہ ہنس پڑی۔ ''مجھے اداکاری کہاں آتی ہے میں تو صرف ایک طالبہ ہوں۔''

''اداکاری کوئی ایسا مشکل فن نہیں ہے۔'' نوری بیگم کہنے لگی۔ ''آپ نے سکول اور کالج کے ڈراموں میں حصہ لیا ہوگا۔ آپ کو فلم لائن میں آپ کے حسن و جمال کی وجہ سے ہاتھوں ہاتھ لے لیا جائے گا۔ پھر آپ کو اداکاری کی تربیت بھی دے دی جائے گی۔ عزت' شہرت اور دولت آپ کے قدم چومے گی۔''

''مگر میرا رجحان فلم اور ٹیلی ویژن کی طرف بالکل نہیں ہے اگر مجھے شوق ہے تو صرف گانے اور مصوری سے ہے۔''

''لیکچرار شپ میں آپ کو کیا ملے گا؟'' نوری بیگم نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ''آپ کی ایک دن کی آمدنی تنخواہ سے دس گنا زیادہ ہوگی اور پھر یہ ملازمت اتنی آسانی سے ملتی بھی نہیں ہے۔''

سپنا نے ٹالنے کی غرض سے کہا۔ ''آپ کا بہت بہت شکریہ' میں آپ کے اس مخلصانہ مشورے پر غور کروں گی۔''

''میرا ایک اور مشورہ یہ ہے کہ آپ کسی طرح کلکتہ جا کر وہاں کی فلم انڈسٹری میں کوشش کریں۔'' نوری بیگم نے کہا۔ ''وہاں ایک فلم میں کام کرنے کا معاوضہ تین چار لاکھ ٹاکا سے کم نہیں ملتا جیسے ہی آپ کی کوئی فلم کامیاب ہو گی آپ کو دس بارہ لاکھ کی آفر ہونے لگے گی۔''

سپنا ایک لمحے کیلئے آسمان کی وسعتوں میں پرواز کرنے لگی۔ وہ اپنے آپ کو بھول گئی یہ تو بہت بڑی رقم تھی اس کے علاوہ عزت اور شہرت الگ تھی اسے یاد آیا کہ جب اداکارہ شبانہ ایک شادی کی تقریب میں شرکت کرنے ڈھاکہ سے کومیلا آئی تھی تو اسے دیکھنے کیلئے سارا شہر دوڑ پڑا تھا۔ ان میں جوان لڑکیاں' لڑکے ہی نہیں تھے بلکہ بوڑھے مرد اور عورتیں بھی موجود تھیں۔ پورے شہر میں اس کی آمد کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی تھی۔ ہر شخص اسے قریب سے دیکھنے' ہاتھ ملانے اور آٹوگراف لینے کیلئے بے چین اور بے تاب ہو رہا تھا۔ اس کی ایک جھلک کیلئے تڑپ رہا تھا۔ اسے شبانہ کی اس پذیرائی پر بڑا رشک آیا تھا۔ چند لمحوں کے بعد وہ حقیقت کی دنیا کی سنگلاخ زمین پر واپس آ گئی۔ اس کے ساتھ جس قسم کے واقعات پیش آ رہے تھے اس کے پیش نظر شوبز کی دنیا میں جانا ناممکن تھا۔

''میں کبھی کلکتہ گئی تو وہاں کی فلم انڈسٹری میں ضرور قسمت آزمائی کروں گی۔'' سپنا نے خوش دلی سے کہا۔

''کسی وجہ سے وہاں کامیابی نہ ہو تو حوصلہ مت ہارنا۔'' وہ بولی۔ ''ڈھاکہ کی فلم انڈسٹری آپ کو سر آنکھوں پر بٹھائے گی۔ ویسے ٹیلی ویژن اگرچہ چھوٹا سکرین کہلاتا ہے لیکن یہ آج فلم سے زیادہ کامیاب میڈیا ہے۔ میرا مشورہ تو یہ ہے کہ آپ پہلے ٹیلی ویژن کا رخ کریں۔''

''آپ کون سے اسٹیمر یا لانچ سے باریسال جا رہی ہیں۔'' سپنا نے موضوع بدلا۔ ''وہ کچھ اکتا سی گئی تھی۔

''میں اپنی ذاتی لانچ سے جا رہی ہوں۔'' نوری بیگم نے اسے گہری نظروں سے دیکھا۔ وہ کانٹے چمچ پلیٹ میں رکھ کر کہنے لگی۔ ''میرے شوہر کے تین اسٹیمر اور بیس اکیس لانچیں ہیں۔ ان میں کچھ مسافر بردار' کچھ مال بردار ہیں جس لانچ سے میں جا رہی ہوں وہ ہر وقت میری ذاتی استعمال میں رہتی ہے۔ بعض اوقات تو میں اسے خود چلاتی ہوں مگر آج مختصر سا عملہ بھی میرے ساتھ ہے کوئی حرج نہ ہو تو آپ میرے ساتھ چلیں۔''

سپنا کو اندازہ نہ تھا کہ یہ عورت اس قدر امیر کبیر ہے وہ اس کی شخصیت سے

مرعوب سی ہوگئی۔ احساس کمتری کا جذبہ غالب آ گیا تھا۔ وہ رسمی انداز سے بولی۔ ''میری وجہ سے آپ کو زحمت ہوگی اور آپ کے آرام میں مخل ہوں گی۔''

وہ عورت ایک دم سے ہنس پڑی۔ ''آپ خواہ مخواہ تکلف سے کام لے رہی ہیں۔ آپ کی کمپنی سے میرا سفر خوشگوار ہوگا اور جلدی کٹ جائے گا۔''

سپنا نے ہامی بھر لی تو وہ بولی۔ ''میں ٹیلیفون کر کے معلوم کروں کہ فیول وغیرہ لے لیا ہے یا نہیں۔ کتنی دیر کے بعد چلا جائے۔''

نوری بیگم اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی اور منیجر کے کاؤنٹر کی طرف بڑھ گئی۔ اس نے وہاں سے ٹیلی فون کر کے دس بارہ منٹ بات کی۔ سپنا دل میں خوش ہو رہی تھی کہ اس کی ایک اور مشکل حل ہوگئی وہ اس عورت کے ساتھ لانچ میں سفر بڑے سکون و اطمینان سے کر سکے گی۔ اسے تحفظ مل گیا تھا۔ یہ عورت اسے بہت پسند آئی تھی اس میں امیر کبیر عورتوں کی طرح نخوت اور تکبر نام کو نہ تھا۔ یہ سب کچھ اسے سپنے کی طرح لگ رہا تھا۔

ویٹر بل لے کر آیا اس کے منع کرنے کے باوجود نوری بیگم نے اس کا بل بھی خود ادا کیا۔ وہ دونوں ریسٹورنٹ سے نکلیں اور ٹرمینل کی طرف بڑھیں تو اس نے وہاں ایک بہت بڑے ہجوم اور پولیس کی بھاری نفری کو دیکھا۔ سڑک کے کنارے پولیس کی گاڑی کے پاس ایک ایمبولینس بھی کھڑی تھی۔ دو تین سپاہی سڑک پر خون میں لت پت پڑی لاش کو اٹھا کر اسٹریچر پر رکھ رہے تھے۔ لاش چادر سے ڈھکی ہوئی تھی۔ لاش کو اسٹریچر پر رکھتے وقت ہوا سے چادر مقتول کے چہرے سے ہٹ گئی۔ اس نے لاش کو چہرہ دیکھا تو وہ اچھل سی پڑی۔ یہ وقار حسین تھا۔ بہروپیا وقار حسین جو اس سے ایک گھنٹہ قبل ملا تھا۔ کسی نے اسے دن دہاڑے قتل کر دیا تھا۔ قریب سے گزرتے ہوئے شخص سے نوری بیگم نے پوچھا تھا کہ اس شخص کو کیسے قتل کیا گیا؟ اس شخص نے بتایا کہ نامعلوم بدمعاش نے اس کی پشت میں اس طرح سے چھرا گھونپا تھا کہ کسی شخص کے فرشتوں تک کو پتا نہیں چل سکا۔ شاید دیرینہ دشمنی کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔

سپنا' نوری بیگم کے ساتھ چلتی ہوئی حیرت سے سوچتی رہی کہ کہیں اس بہروپیئے کو اصل وقار حسین نے قتل تو نہیں کیا ہوگا۔ وہ شاید یہ بات برداشت نہ کر سکا ہوگا کہ کوئی اس کا بہروپ بھر کے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرے۔ یہ بہروپیا آخر کیا فائدہ اٹھانا چاہتا ہوگا۔

سپنا لانچ پر پہنچی تو اسے دیکھ کر حیرت اور خوشی کی انتہا نہ رہی۔ لانچ اس کے تصور سے کہیں خوبصورت' نہایت شاندار' جدید ترین اور نہایت آراستہ و پیراستہ تھی۔ اس پر کسی

شاہی لانچ کا دھوکہ ہو رہا تھا۔ اس کے تمام کمرے ایئرکنڈیشنڈ تھے۔ اس لانچ کا عملہ تین افراد پر مشتمل تھا۔ اس نے سوچا اسے عملے سے کیا لینا ہے۔

تھوڑی دیر بعد لانچ روانہ ہو گئی۔ وہ نوری بیگم کے ساتھ عرشے پر بیٹھ کر نظارہ کرنے لگی۔ لانچ بڑی تیز رفتاری سے پانی کا سینہ چیرتی ہوئی چلی جا رہی تھی۔ نوری بیگم اس کے حسن و جمال اور شوبزنس کے موضوع پر اس سے باتیں کرنے لگی مگر وہ اس وقت ذہنی طور پر حاضر نہ تھی۔ اس کا ذہن کہیں اور تھا۔ وہ اپنی ماں کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ نوری بیگم نے اس سے ابھی تک اس کے سامان کے بارے میں نہیں پوچھا تھا۔ اس نے اس کا جواب بھی سوچ رکھا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد نوری بیگم اس سے بولی۔ ''مس سپنا! نیچے چلیے۔ ایک دو گھنٹے آرام کر لیں۔''

وہ نوری بیگم کے ساتھ نیچے والے کمرے میں سونے کی غرض سے آئی۔ وہ بستر پر لیٹی تھی کہ دروازے پر کسی نے دستک دی تو نوری بیگم نے تیز لہجے میں پوچھا۔ ''کون ہے؟'' جواب میں عملے کے آدمی کی آواز سنائی دی۔ ''بیگم صاحبہ! میں سردار ہوں شربت لے کر آیا ہوں۔''

''ایک منٹ۔'' نوری بیگم بولی اور بستر پر اٹھ بیٹھی پھر کھڑے ہو کر اس نے اپنا لباس، اس کا پہلو اور شکنیں درست کیں۔ سپنا نے بھی ان کی تقلید کی۔ چند ثانیوں کے بعد وہ بلند آواز سے بولیں۔ ''آ جاؤ۔''

سردار دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں ایک خوبصورت سی ٹرے تھی۔ اس میں شربت کے دو گلاس رکھے تھے۔ اس نے بڑے مودبانہ انداز میں سلام کیا۔ ٹرے میز پر رکھ کر اس نے ایک گلاس اٹھا کر پہلے سپنا کو پیش کیا۔ دوسرا گلاس نوری بیگم کو پھر وہ ٹرے لے کر باہر نکل گیا اور دروازہ بھی کھینچ کر بند کرتا گیا۔ نوری بیگم اس سے بولی۔ ''میں دوپہر کو قیلولہ کرنے سے پہلے کوئی نہ کوئی جوس یا شربت ضرور پیتی ہوں۔''

یہ اناناس کا شربت تھا۔ بڑا میٹھا اور فرحت بخش تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس پر سرور سا چھانے لگا پھر وہ نیند کی آغوش میں چلی گئی۔

☆......☆......☆

ڈاکٹر احمد جعفر اپنے بیڈروم میں بید کی آرام دہ کرسی میں آنکھیں بند کیے نیم دراز تھا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ اس کی نس نس میں خوف ابلنے لگا تھا۔ اس کا موڈ سخت آف تھا۔ اس کی حسین و جمیل اور نوجوان سیکرٹری تابندہ اس کے سر میں تیل کی مالش کر رہی تھی۔ وہ

بار بار دیوار گیر گھڑی میں وقت دیکھتی جا رہی تھی۔ رات کے بارہ بجنے میں دس منٹ باقی تھے وہ باس کے غصے سے واقف تھی اس لئے لرز بھی رہی تھی کہ کہیں اس کا عتاب اس پر نازل نہ ہو۔ باس جس ٹیلیفون کے انتظار میں خار کھا رہا تھا وہ مقررہ وقت پر نہیں آیا تھا اس لئے باس کا پارہ چڑھا ہوا تھا۔

دفعتہً ٹیلیفون کی گھنٹی بجی تو تابندہ کا چہرہ دمک اٹھا۔ اس نے بجلی کی سی تیزی سے اپنے تیل کے ہاتھ تولیے سے صاف کیے۔ دوسری گھنٹی پر اس نے ریسیور اٹھا لیا دوسری طرف سے اس نے نام سن کر ریسیور باس کی طرف بڑھا دیا۔ ''شمسو کا ٹیلیفون ہے۔''

''سر! میں چاند پور سے شمسو بول رہا ہوں۔'' شمسو کے لہجے میں سرشاری ٹپک رہی تھی۔ ''وہ ایک بہت بڑی خوشخبری ہے۔''

''کیسی خوش خبری۔'' ڈاکٹر احمد جعفر غرایا۔ اس کی کنپٹیاں گرم ہونے لگیں۔ ''یہ تم نے اس قدر دیر سے ٹیلیفون کس لئے کیا۔''

''میں نے آج ٹھیک تین بجے چاند پور ٹرمینل پر وقار حسین کو چھرا گھونپ کر ہلاک کر دیا۔'' وہ باس کو غصے میں پا کر سہم سا گیا۔ ''سر! ٹیلیفون اس لئے میں وقت پر نہیں کر سکا کہ وقار حسین کی لاش ہسپتال سے غائب کرنے میں دیر ہوگئی پھر اس کی لاش کو اچھی طرح سے جلا کر راکھ کر دیا ہے آپ کے حکم کے مطابق اس کی جلی ہوئی لاش کی راکھ خیرو کے ذریعے روانہ کر دی ہے۔''

''الو کے بچے! وہ وقار حسین نہیں تھا۔'' ڈاکٹر احمد جعفر طیش میں آ کر دھاڑا۔ ''تمہارا باپ تھا وہ ہاشم بیگ تھا اس نے وقار حسین کے ساتھیوں کو تلاش کرنے کیلئے بہروپ بھرا تھا تاکہ وہ انہیں موت کی نیند سلا دے۔ تم نے اپنے ہی آدمی کو نشانہ بنا دیا۔''

''سر!'' اس کے لہجے سے شدید حیرت اور تاسف جھلک رہا تھا۔ ''مجھے پہلے ہی بتا دیا ہوتا تو اس کی نوبت نہ آتی۔''

''نریش کی غفلت اور حماقت کی وجہ سے ایسا ہوا ہے۔'' ڈاکٹر احمد جعفر نے برافروختہ ہوتے ہوئے کہا۔

''اس کا بھی وہی حشر کرو جو ہاشم بیگ کا کیا گیا ہے۔ ہمیں ایسے بے وقوف آدمی کی کوئی ضرورت نہیں ہے اور نہ ہی اس کی غلطی قابل معافی ہے۔ ہمارا ایک بہترین آدمی موت کے منہ میں چلا گیا ہے کیا تم نے پتا چلایا کہ وقار حسین کومیلا میں کیا کر رہا تھا۔''

''وہ رقیہ خانم کو تلاش کر رہا تھا اور اس کی سہیلی بلقیس بانو کے گھر کل رات پہنچا

تھا۔ اس نے شاید بلقیس بانو سے جو ایک سکول میں استانی ہے رقیہ خانم کا پتا معلوم کرنے کی کوشش کی تھی۔

"وقار حسین نے بیس برس کے بعد آ کر اس کی سہیلی کا پتا معلوم کر لیا اور یہ کام تم نہیں کر سکے؟ لعنت ہے تم پر۔ ڈوب مرو۔" وہ غصیلے لہجے میں بولا۔

"کل میں نے دو آدمیوں کے ہمراہ اس عورت کے گھر پر دھاوا بولا تھا۔ وہ گھر میں نہیں تھی۔ ہم نے اس کے گھر کی ایک ایک چیز الٹ پلٹ کر دیکھ لی شاید رقیہ خانم کا پتا مل جائے۔ ہمیں ایسی کوئی چیز نہیں ملی جس سے رقیہ خانم کا نام و نشان مل سکے۔"

"تم نے بلقیس بانو کو اغوا کیوں نہیں کر لیا؟" ڈاکٹر احمد جعفر بگڑ گیا۔

"ماں بیٹی پراسرار طور پر غائب ہو گئی ہیں۔" وہ بولا۔ مجید نے مجھے یہ رپورٹ کومیلا سے ٹیلیفون پر مغرب کے وقت دی تھی۔ مجید کومیلا ہی میں ہے وہ کل دوپہر تک وہاں رہے گا۔"

"ایک ہفتے کے اندر اندر وقار حسین، بلقیس بانو اور رقیہ خانم کی سر بریدہ مسخ شدہ لاشیں کسی سڑک، نالے یا چوراہے پر پڑی ہونی چاہئیں۔" ڈاکٹر احمد جعفر بے [illegible] اور سفاک لہجے میں بولا۔ "اور پھر ان تینوں کے سر میری خدمت میں پیش کیے جائیں تاکہ میں ان کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے اپنے کتوں کو کھلا سکوں۔ تم یہ بات بہت اچھی طرح جانتے ہو کہ میرے نزدیک ناکامی سے بری چیز کوئی نہیں اور میں ایسے کاموں میں ناکام ہونے والوں کو زندہ دفن کر دیتا ہوں۔ کامیاب ہونے والوں کو منہ مانگا انعام دیتا ہوں۔ میں سر کی قیمت دس ہزار ٹا کا مقرر کر رہا ہوں۔ کیا یہ مناسب انعام نہیں ہے؟"

"سر! میں اپنی طرف سے پوری پوری کوشش کروں گا کہ ان تینوں کو ایک ہفتے سے قبل زندہ یا مردہ پیش کروں۔" شمسو نے بڑے یقین اور اعتماد کے لہجے میں کہا۔ "سر! آپ نے بلقیس بانو کی بیٹی کے بارے میں کوئی حکم صادر نہیں فرمایا اسے بخش دیا جائے؟"

"نہیں شمسو نہیں۔" ڈاکٹر احمد جعفر نے اشارے سے اپنی حسین و جمیل سیکرٹری کو اپنے پاس بلا کر بٹھا لیا۔ وہ کہنے لگا۔ "کیا تم نہیں جانتے کہ سانپ کا بچہ سنپولیا ہوتا ہے۔ ہم اسے اپنے زہر سے ماریں گے۔ بائی دی وے اس کی بیٹی کیسی ہے؟ اس کا نام کیا ہے؟ کیا وہ تابندہ سے بھی حسین ہے؟"

"اس کی بیٹی کی صورت تو میں نے بھی نہیں دیکھی ہے سر! وہ کہنے لگا لیکن میں نے اس کی بڑی تعریف سنی ہے اس کے حسن و جمال کا چرچا صرف کومیلا شہر ہی نہیں بلکہ

لکشام اور چٹا گانگ تک میں اس کے چہرے کے نقش و نگار میں جو تیکھا پن اور جاذبیت ہے وہ کسی اور صورتوں میں دکھائی نہیں دیتی ہے۔ وہ سحر بنگال ہے وہ شعلہ مجسم ہے اس کا نام سپنا ہے۔''

''کیا تم شاعری کر رہے ہو یا اس کے حسن و شباب کی تعریف؟'' ڈاکٹر احمد جعفر ایک دم سے ہنس پڑا۔

''سر! جو میں نے سنا وہ عرض کر دیا میں نے تو یہاں تک سنا ہے کہ اس کے حصول کیلئے کالج کے لڑکوں میں خون خرابے تک ہوئے ہیں۔''

''وہ تو بڑا نادر اور نایاب نگینہ معلوم ہوتا ہے۔'' ڈاکٹر احمد جعفر نے چشم تصور میں سپنا کا ایک پیکر تراشا۔''میں شروع ہی سے ایسے آب دار نگینوں کا قدر دان رہا ہوں تم اسے ڈھونڈ لاؤ گے تو اس کے بھی دس ہزار ٹاکا دوں گا مگر ایک بات یاد رکھنا اس پر کوئی خراش نہ آنے پائے۔''

شمسو نے ٹیلیفون رکھ دیا۔ اس کا نفرت غصے اور شکست کے احساس سے برا حال تھا۔ اسے ہاشم بیگ کو قتل کرنے کا بڑا دکھ ہو رہا تھا۔ وہ اس کے ساتھ پورے بیس برس سے لوگوں کو صفحہ ہستی سے مٹا رہا تھا۔ وہ ہاشم بیگ کو خود اس گروہ میں لایا تھا۔ ہاشم بیگ نے ایسا بہروپ بھرا تھا کہ وہ دھوکا کھا گیا تھا۔ وہ تھا غضب کا اداکار۔ ایک دو فلموں میں کام کر چکا تھا۔ سٹیج ڈراموں میں بھی کام کرتا رہتا تھا اور خون کی ہولی بھی کھیلتا تھا۔ اس کے دو چہرے تھے۔ ایک چہرہ فنکار کا تھا۔ دوسرا ایک خون آشام بھیڑیئے کا۔ وہ اس سے اکثر کہتا تھا۔ ''شمسو! تم نے مجھ سے زیادہ تعداد میں قتل کیے ہیں۔ میں چاہتا ہوں اس میدان میں تمہیں بہت پیچھے چھوڑ دوں۔'' وہ اپنی یہ حسرت اپنے دل میں لئے چلا گیا تھا۔

اس کی موت کے اس صدمے نے اس کے ذہن کو بہت متاثر کیا تھا۔ اس نے دل میں عہد کر لیا تھا کہ وہ وقار حسین کو ایسی سفا کی اور بے رحمی سے قتل کرے گا اس کی مثال تاریخ میں نہیں ملے گی۔ وہ وقار حسین کو کسی درخت' ستون یا کھمبے سے مضبوطی سے باندھ دے گا۔ اس چھرے کی نوک سے جس سے اس نے اپنے دوست اور ساتھی ہاشم بیگ کو قتل کیا اس کی نوک سے وقار حسین کے جسم میں شگاف ڈالے گا۔ اس کے جسم پر کاری زخم لگائے گا اس پر نمک مرچ چھڑ کے گا پھر اس کی آنکھیں نکال کر سر تن سے جدا کر دے گا۔ کاش! اسے وقار حسین جلدی ہاتھ لگ جائے تا کہ وہ اپنی انتقام کی پیاس بجھا سکے۔

☆......☆......☆

شمسو نور پور کے گھاٹ پر اترا تو سہ پہر ڈھل رہی تھی۔ بیس برس پہلے اس نے وقار حسین کو اس گاؤں میں کئی بار دیکھا تھا۔ یہ تب کی بات تھی جب وقار حسین اس گروہ میں شامل تھا اس کے ایک ساتھی کا خیال یہ تھا کہ دس کروڑ کی مالیت کا سونا شاید اسی گاؤں میں کسی خفیہ جگہ پر محفوظ ہے۔ وقار حسین نے بھی اپنے اس شک کا اظہار کیا تھا۔ اس نے آخری مرتبہ رقیہ خانم کے ساتھ وقار حسین کو اسی گاؤں میں دیکھا تھا۔ اسے یقین تھا کہ وقار حسین اسی گاؤں میں روپوش ہوگا۔ وہ کومیلا سے یہاں آ گیا ہوگا۔ شاید یہاں رقیہ خانم بھی ہو۔ اسے پہلے کبھی نور پور کا خیال نہیں آیا تھا۔ اگر آ جاتا تو رقیہ خانم تو اس کے ہاتھ لگ جاتی جس کے پاس ڈائری تھی۔ اس نے کئی مرتبہ سوچا تھا کہ ڈائری اس کے ہاتھ لگ جائے تو وہ ڈائری میں موجود نقشے کی مدد سے سارا سونا حاصل کر کے انڈیا جا سکتا ہے۔ انڈیا بہت بڑا ملک ہے وہ کہیں بھی رہ کر شاہانہ زندگی گزار سکتا ہے اس کا باس ساری زندگی اس کا کھوج نہیں لگا سکے گا۔ اسے امید تھی کہ وہ نہ صرف وقار حسین اور رقیہ خانم کو تلاش کر لے گا بلکہ ڈائری بھی حاصل کر لے گا۔ جب اسے ڈائری مل جائے گی تو پھر سونا بھی مل جائے گا۔

شمسو نے کھیتوں سے گزرتے ہوئے سوچا کہ شاید وقار حسین نے کوئی بہروپ بھر رکھا ہوتا کہ اسے کوئی پہچان نہ سکے لیکن اس کیلئے یہ فکر کی بات نہ تھی۔ وقار حسین کو تلاش کرنا اور پہچاننا زیادہ مشکل نہ تھا۔ اس لئے کہ وہ کسی امریکی ہیرو کی طرح دراز قد اور چاق و چوبند تھا۔ ایسا دراز قد شخص تو دور ہی سے نظر آ جاتا ہے۔ اس کی طرح لمبے چوڑے آدمی اس ملک میں شاذ و نادر ہی دکھائی دیتے تھے۔

شمسو نے ایک تالاب کے پاس سے گزرتے ہوئے ایک بوڑھے شخص کو دیکھا جو ایک درخت کے نیچے بیٹھا ستا رہا تھا۔ وہ کمزور اور لاغر جسم کا مالک تھا۔ ایک لمحے کیلئے ان دونوں کی نظریں ملیں۔ شمسو نے اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دی اور بے نیازی سے آگے بڑھ گیا وہ شخص اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ کوئی دس بارہ گز کا فاصلہ طے کرنے کے بعد شمسو نے ایک شناسا آواز کو اپنا نام لے کر پکارتے سنا تو وہ ٹھٹھک کے رک گیا۔

دوسرے لمحے برقی سرعت سے وہ بوڑھے کی طرف گھوم گیا پھر وہ دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھتے رہے۔ شمسو نے اس بوڑھے شخص کو پہچاننے کی کوشش کی جس کے چہرے پر بے شمار جھریاں پڑی تھیں۔ اس کی آنکھوں سے ایک عجیب مسکراہٹ جھانک رہی تھی۔

''کون ہو تم؟'' شمسو نے غراتے ہوئے اپنی جیب سے چاقو نکال لیا۔

بوڑھا مسکرا دیا۔ شمسو کے ہاتھ میں کھلا چاقو اور اس کے چہرے پر سفاکی دیکھ کر ذرا برابر بھی نہیں گھبرایا اور نہ پریشان ہوا۔ اس نے بڑے پرسکون لہجے میں کہا۔ ''تم نے مجھے نہیں پہچانا لیکن میں نے تمہیں اٹھارہ انیس برس کے بعد بھی پہچان لیا۔ میرا نام ربانی ہے۔''

''ربانی......'' شمسو نے اپنی یادداشت کے پٹ کھولے تو اسے یاد آ گیا کبھی وہ اس گروہ میں ہوتا تھا اسے کسی بیماری کی وجہ سے چھٹی دے دی گئی تھی۔ ربانی ہی نے اسے چاقو اور پستول چلانا سکھایا تھا۔ ''تم ابھی تک زندہ ہو'' وہ تحیر زدہ لہجے میں بولا۔

''ہاں!'' وہ ہنسا۔ ''تمہیں مجھے زندہ دیکھ کر حیرت ہو رہی ہے مگر مجھے خوش ہو رہی ہے اس لئے کہ تم میرے شاگرد رہ چکے ہو۔''

''اچھا یہ بتاؤ کہ تم نے وقار حسین اور رقیہ خانم کو کہیں دیکھا ہے؟ تم مجھے ان کا پتا بتا سکتے ہو۔''

''تم وقار حسین اور رقیہ خانم کی تلاش میں یہاں آئے ہو جو چکمہ دے کر نکل گئے ہیں۔ دس شیطانوں کو ان کی تلاش ہے۔'' بوڑھا معنی خیز انداز میں مسکرایا۔

''ہاں تم نے صحیح اندازہ لگایا میں ان دونوں کو موت کے گھاٹ اتارنے نکلا ہوں۔'' وہ سفاک لہجے میں بولا۔

''میں تمہیں وقار حسین کے ٹھکانے کا پتا بتا سکتا ہوں لیکن ایک شرط ہے۔'' بوڑھے نے کہا۔

''کیسی شرط؟'' شمسو نے تعجب سے پوچھا۔

''میں اس کا معاوضہ پانچ ہزار ٹاکا لوں گا۔'' بوڑھے نے خالص کاروباری لہجے میں جواب دیا۔ ''اس لئے کہ آج کل میری ضروریات بہت بڑھ گئی ہیں۔ دوائیاں اتنی مہنگی ہو گئی ہیں کہ قوت خرید سے باہر ہیں۔''

''پانچ ہزار ٹاکا......'' شمسو نے ایک لمحے کیلئے سوچا پھر اس نے بوڑھے کے قریب ہو کر اس کا گریبان پکڑ لیا اور گلے پر چاقو رکھ دیا۔ بوڑھے کو اس کی آنکھوں میں ایک سفاک چمک دکھائی دی۔ وہ سہم سا گیا۔ شمسو نے وحشیانہ لہجے میں کہا۔ ''اب تو تمہارا باپ بھی بتائے گا جلدی سے بتاؤ وہ کہاں ہے؟''

''تم میرے احسانات کا یہ بدلہ دے رہے ہو؟'' بوڑھے نے بے جان لہجے میں کہا۔ ''تم سے مجھے ایسی امید نہ تھی۔''

''بدمعاشوں کا آپس میں نہ کوئی رشتہ ہوتا ہے نہ دوستی' نہ کوئی کسی پر کوئی احسان

کرتا ہے۔ ماضی کو میں بھی بھول گیا ہوں تم بھی بھول جاؤ حال اور مستقبل کی طرف دیکھو مجھے اپنا مستقبل بنانا اور زندہ رہنا ہے اس لئے مجھے وقار حسین کی تلاش ہے اگر تم نے مجھے اس کا پتا نہیں بتایا تو میں اس چاقو سے تمہاری گردن الگ کر کے اس پیڑ کے نیچے پھینک دوں گا۔ بولو تمہیں کیا چاہیے؟ زندگی یا موت؟''

''بوڑھے نے چند لمحے سوچا اور شمسو کو پرخیال نظروں سے دیکھتے ہوئے ایک سرد آہ بھری۔ ''چلو۔''

بوڑھا' شمسو کو اپنے ہمراہ لے کر ایک پگڈنڈی پر چلنے لگا۔ راستے میں ان دونوں نے کوئی بات نہیں کی۔ کوئی دس بارہ منٹ چلنے کے بعد وہ اسے ایک مکان پر لے کر پہنچا جو آبادی سے دور تھا۔ بوڑھے نے اسے اشارے سے بتایا کہ وقار حسین اس مکان میں رہتا ہے۔ شمسو نے اسے اشارہ کیا کہ وہ دروازے پر دستک دے۔ بوڑھا دروازے پر دستک دینے لگا تو وہ تیزی سے ہٹ کر ایک طرف کھڑا ہو گیا اور جیب سے پستول نکال کر چاقو کو جیب میں رکھ لیا۔

وقفے وقفے سے دس منٹ تک دروازے پر دستک دینے کے باوجود دروازہ نہیں کھلا تو شمسو نے نفرت اور غصے سے دروازے پر ایک زور کی لات ماری دروازہ چوکھٹ سمیت فرش پر آ رہا پھر اس نے بوڑھے کا گریبان پکڑ کے اسے زور سے مکان کے اندر دھکا دیا۔ بوڑھا اپنا توازن قائم نہ رکھ سکا۔ وہ فرش پر ٹوٹے ہوئے دروازے کی طرح گرا اور اس کے منہ سے بے اختیار ایک کراہ نکل گئی۔

شمسو اس کے سر پر پستول تان کر کھڑا ہو گیا وہ سخت مشتعل ہو رہا تھا اس کی رگوں میں خون ابلنے لگا تھا۔ بوڑھا سنبھل کر اٹھنے کی کوشش کرنے لگا تو اس نے بوڑھے کے جھکے ہوئے کندھے پر بڑے زور کی ایک لات رسید کی۔ وہ الٹ کر فرش پر منہ کے بل لیٹ گیا۔ شمسو نے اس کے پاس جا کر اس کی گردن پر اپنا پیر رکھ دیا پھر وہ پیر سے بوڑھے کی گردن دباتے ہوئے غصے سے بولا۔ ''بوڑھے! تو نے کیا مجھے احمق سمجھ رکھا ہے تو پانچ ہزار کی رقم کیلئے مجھے دھوکا دے رہا ہے' تیرا کیا خیال ہے تو مجھ سے رقم لئے بغیر وقار حسین کے اصل ٹھکانے کا پتا نہیں بتائے گا؟''

''وقار حسین کا یہی گھر ہے۔'' بوڑھے نے گھٹی گھٹی آواز سے کہا۔ وہ درد سے کراہنے لگا تھا۔

''تو جھوٹ بک رہا ہے۔'' شمسو اور غضبناک ہو گیا۔ ''تو اچھی طرح جانتا ہے کہ

میں نے کبھی چار پانچ سال کے بچوں پر رحم نہیں کھایا پھر ایک بوڑھے پر کیسے رحم کھا سکتا ہوں مگر چونکہ ماضی میں تیرا میرا ساتھ رہ چکا ہے اس لئے میں تجھے قتل کرنا نہیں چاہتا تو ویسے بھی چند دنوں کا مہمان دکھائی دیتا ہے اسی لئے میں تجھے اس شرط پر طبعی موت مرنے کا موقع دے سکتا ہوں کہ تو سچ سے کام لے۔''

شمسو نے اس کی گردن سے اپنا پیر ہٹا کر جوتے کی نوک سے بوڑھے کو سیدھا کیا۔ بوڑھا کراہتے ہوئے کہنے لگا وقار حسین کچھ دنوں پہلے یہاں آیا تھا اور اس نے سیمان سوداگر سے یہ مکان دو تین مہینے کیلئے کرائے پر لیا ہے۔ مکان لینے کے دوسرے تیسرے دن اس کی چابی مجھے دے کر کہیں چلا گیا تھا کل رات وہ واپس آیا تھا اس سے صبح میری ملاقات ہوئی تھی اس نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ ایک دن اس گاؤں میں روپوش رہے گا کیونکہ دشمن اس کے تعاقب میں ہے اور وہ اسے قتل کرنے کے درپے ہے۔ وہ گاؤں ہی میں ہوگا۔''

''وہ اس وقت کہاں اور کس جگہ ہوگا یہ تو جانتا ہے مجھے ابھی اور اسی وقت لے کر چل خبیث!'' پھر اس نے بوڑھے کی پسلی میں جوتے کی نوک سے ضرب لگائی۔ ''یہ گاؤں ہے ڈھاکہ شہر نہیں ہے جو کہیں سیر و تفریح کیلئے گیا ہوگا۔''

''مجھ سے قسم لے لو کہ میں نہیں جانتا وہ اس وقت کہاں اور کس جگہ پر ہوگا۔''

شمسو نے پستول جیب میں رکھ کر چاقو نکال لیا اسے ایک جھٹکے سے کھول کر بوڑھے پر جھک گیا اسے منہ کے بل گرا کے اس کی گدی پر چاقو کی دھار رکھ دی۔ ''میرے سامنے تو پتھر بھی بولتے ہیں اور مردے بھی' اب بتاتے ہو یا میں تمہیں ذبح کرنا شروع کر دوں؟''

''تم مجھے ذبح ہی کر دو۔'' بوڑھے نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

شمسو نے چاقو کی دھار سے اس کی گردن پر خراش ڈال دی۔ بوڑھا درد کی شدت سے تڑپ اٹھا۔ خراش سے خون نکلنے لگا وہ آہستہ آہستہ اس پر چاقو پھیرنے لگا لیکن اس بات کا خیال رکھا کہ گردن نہ کٹ جائے گہرا زخم نہ آ جائے۔ ''مجھے نہیں معلوم......؟'' بوڑھا گڑگڑانے لگا شاید درد کی لہریں اس کے جسم کو چاقو کی نوک کی طرح کاٹنے لگیں۔ ''تم مجھے جلدی سے ذبح کر دو مجھے اذیت نہ دو۔''

''بس کرو...... ذلیل کتے۔'' کسی نے شمسو کے عقب سے اسے غضبناک لہجے میں للکارا۔ شمسو ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا تو وقار حسین سامنے کھڑا تھا۔ اس کے دائیں ہاتھ میں ایک خوفناک قسم کا ریوالور تھا' بائیں ہاتھ میں وہ ایک سیاہ رنگ کا

؛ می پرس لئے کھڑا تھا۔ اس کی آنکھیں دہک رہی تھیں۔ شمسو کے ہاتھ سے چاقو چھوٹ کر زمین پر گر پڑا۔ وہ اسے اٹھانے کیلئے تیزی سے جھکا تو وقار حسین کے ریوالور نے ایک شعلہ اگل دیا گولی چاقو پر لگی۔ چاقو اس سے کئی فٹ دور کھسکتا چلا گیا۔

''تمہیں میری تلاش تھی نا۔'' وقار حسین نے اسے گھورا۔ ''میں نے تمہارے بارے میں ٹھیک سنا تھا کہ تم درندے کی طرح بے رحم ہو تمہیں ایک بوڑھے پر رحم نہیں آیا ایک ایسے شخص پر جس کے تم پر احسانات بھی ہیں۔ کیا احسانات کا صلہ اس طرح دیا جاتا ہے؟''

''ہاں مجھے تمہاری تلاش تھی۔'' شمسو بے خوفی سے بولا۔ ''اچھا ہوا تم مل گئے تمہارے لئے باس کا ایک پیغام ہے اس نے تمہیں اس شرط پر معافی دینے کا اعلان کیا ہے کہ تم اور رقیہ خانم دوبارہ اس گروہ میں شامل ہو جاؤ اور ڈائری اس کے حوالے کر دو۔''

''اس گروہ میں کبھی کسی کی غلطی معاف نہیں کی گئی۔'' وقار حسین بولا۔ ''تم مجھے فریب دے رہے ہو؟''

''نہیں، میں سچ کہہ رہا ہوں۔'' شمسو کو اپنی آواز کھوکھلی سی لگ رہی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اسے صرف ایک لمحے کی مہلت مل جائے تا کہ وہ اپنا پستول نکال سکے۔ ''تم میری بات کی تصدیق ٹیلیفون کر کے کر سکتے ہو۔''

''نہیں مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔'' وقار حسین نے سر ہلایا۔ ''تمہیں میری اور رقیہ خانم کی اس لئے تلاش ہے کہ وہ ڈائری حاصل کی جائے جس سے دس شیطانوں کے چہرے بے نقاب ہو سکتے ہیں اور دس کروڑ ٹاکا کے سونے کا راز معلوم ہو سکے اس بیگ میں وہ ڈائری ہے اس نے توقف کر کے وہ بیگ نما پرس اس کی طرف اچھال دیا۔ ''یہ ڈائری لے جا کر اپنے باس کو دے دو اور اس سے کہو کہ وہ میرا اور رقیہ خانم کا پیچھا چھوڑ دے۔''

شمسو نے اس پرس کو فرش پر گرنے نہیں دیا۔ اس نے لپک کر گیند کی طرح کیچ کر لیا اسے جیسے یقین نہیں آیا۔ ایک لمحے کیلئے وہ ششدر سا رہ گیا۔ اس کا چہرہ دمک اٹھا اس نے خواب کی سی حالت میں اس پرس کو دیکھا پھر اس سے بولا۔ ''تم نے اپنی شکست تسلیم کر لی۔''

''ہاں۔'' وقار حسین نے سر ہلایا۔ ''پہلے تم اس پرس میں سے ڈائری نکال کر اسے دیکھ لو اپنی تسلی کر لو۔''

''اس کی کیا ضرورت ہے۔'' وہ سرشاری سے بولا۔ ''مجھے تم پر اعتبار آ گیا ہے تم نے ڈائری واپس کر کے اپنی زندگی کی سب سے بڑی عقلمندی کی ہے۔''

''دراصل مجھے رسید کی ضرورت ہے تا کہ سند رہے اور بوقت ضرورت کام آئے

مجھے تمہارا اعتبار نہیں ہے۔'' وقار حسین کے ہاتھ میں بدستور ریوالور تھا اور اس کی انگلی لبلبی پر رکھی ہوئی تھی۔ شمسو نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پرس کی زپ کھولی اور اندر ہاتھ ڈال دیا۔ دوسرے لمحے اس نے ایک دلخراش چیخ ماری اور ایک جھٹکے سے ہاتھ باہر نکالا تو اس کے ہاتھ پر دو تین خوفناک قسم کے بچھو چمٹے ہوئے تھے۔ ان بچھوؤں نے اسے کاٹ لیا تھا اس نے پرس فرش پر پھینک کر بائیں ہاتھ سے بچھوؤں کو پکڑنے کی کوشش کی تو اس بچھو نے اسے ایک اور ڈنک مارا۔ وہ درد اور خوف سے تڑپنے لگا۔ اس کے زخموں سے خون رسنے لگا تھا۔ چند لمحوں تک وہ اذیت سے تڑپتا رہا پھر اس نے فرش پر سے چاقو اٹھا کر اس کی نوک سے بچھوؤں کو فرش، پر گرا دیا اور اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے چاقو وقار حسین پر کھینچ مارا۔ وقار حسین چوکنا اور ہوشیار تھا وہ برقی سرعت سے ایک طرف ہو گیا۔ چاقو اس کے کان کے پاس سے سنسناتا ہوا گزر گیا۔

دوسرے لمحے شمسو نے اپنا ہاتھ جیب میں ڈالنے کی کوشش کی تو بیک وقت دو فائر ہوئے۔ ایک گولی شمسو کی ٹانگ پر لگی، دوسری گولی اس کے شانے پر لگی تو وہ الٹ کر فرش پر گر پڑا۔ اس کے زخموں سے لہو ابلنے لگا۔ درد کسی خنجر کی طرح اس کے پورے جسم کو کاٹنے لگا۔ اس کی چیخیں نکل گئیں۔ وہ مغلظات بکنے لگا۔ وقار حسین نے فرش پر سے چاقو اٹھا لیا اور اس کے قریب جا کر کھڑا ہوا اور اپنی پوری قوت سے ایک لات اس کی پسلی پر ماری وہ کسی زخمی پرندے کی طرح پھڑ پھڑانے لگا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''تم اس وقت کیسا محسوس کر رہے ہو۔'' وقار حسین نے اس کے سینے پر اپنا پیر رکھ دیا۔ ''تمہیں کسی کو تشدد، بربریت اور درندگی کا نشانہ بناتے ہوئے بڑا لطف آتا تھا؟''

''اب خود پر بیت رہی ہے تو بتاؤ لطف آ رہا ہے۔''

شمسو نے جواب نہیں دیا وہ اس وقت نہ بات کرنے کے قابل تھا اور نہ زندگی کی بھیک مانگنے کے۔ بوڑھا وقار حسین کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ اس سے بولا۔ ''سرکار! یہ چاقو مجھے دے دیں تاکہ میں اس کا لطف دوبالا کر سکوں ویسے اس کی قبر تیار ہے۔''

☆......☆......☆

سپنا بیدار ہوئی تو بعد کے واقعات اس کے ذہن میں واضح نہیں تھے۔ اس کی یادداشت کسی بھیانک خواب کی طرح دھندلا گئی تھی۔ وہ اپنے آپ کو مدہوشی کی حالت میں محسوس کر رہی تھی، اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کوئی عجیب و غریب خواب دیکھتی رہی ہو۔ اس کا وجود متحرک تھا وہ بول رہی تھی، دیکھ رہی تھی لیکن سب کچھ بے معنی تھا۔ اسے کچھ نہیں

معلوم تھا کہ وہ کیا بول رہی ہے؟ سن رہی ہے۔ اس کے کمرے میں کچھ لوگ بیٹھے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد اس نے محسوس کیا کہ اس کے کمرے میں صرف لڑکیاں ہیں وہ کھلکھلا کر ہنس رہی ہیں۔ کسی بات پر قہقہے لگا رہی ہیں۔ ہلکی ہلکی موسیقی کی دھن پر گنگنا رہی ہیں' ناچ رہی ہیں' بل کھا کھا کر تھرک رہی ہیں' کسی کا چہرہ صاف نہیں تھا' دھندلا تھا اس کا ذہن بھی جیسے سن ہو کر رہ گیا تھا پھر اس نے محسوس کیا کہ تمام آوازیں پس منظر میں چلی گئی ہیں۔ اس کا ذہن تاریکی میں ڈوبتا جا رہا تھا۔

سپنا بیدار ہوئی تو اس نے دیکھا کمرے کی کھڑکیوں کے پردوں پر صبح کی نرم دھوپ پڑ رہی ہے۔ چڑیاں چہچہا رہی ہیں۔ وہ بستر پر لیٹی لیٹی چھت کو دیکھنے لگی پھر ایک دم سے اسے احساس ہوا کہ یہ کمرہ لانچ کا نہیں ہے کوئی یہ ایک خواب گاہ ہے۔ وہ لمبے چوڑے پلنگ اور بے حد آرام دہ اور گداز بستر پر لیٹی ہوئی ہے۔ وہ ایک دم سے ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھی وہ کہاں آ گئی ہے؟ یہ کس کا گھر ہے؟

اس نے بستر سے نکل کر حیرت بھری نظروں سے کمرے کو دیکھا۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ یاد نہیں آ رہا تھا اسے یہاں کون لایا ہے؟ وہ کس طرح اور کیسے پہنچی ہے؟ کہیں یہ زلیخا آنٹی کا گھر تو نہیں ہے؟ وہ ششدر سی کھڑی تھی کہ کمرے کا دروازہ کھلا۔ ایک تیس برس کی عورت جو سفید لباس میں تھی وہ ایک ٹرے لئے اندر داخل ہوئی۔ وہ ملازمہ لگ رہی تھی۔ عورت نے سر کے اشارے سے اسے سلام کیا تو سپنا نے پوچھا۔ ''میں کہاں ہوں؟ یہ کس کا گھر ہے؟''

''آپ کلکتہ میں ہیں۔'' اس عورت نے پرتپاک انداز سے جواب دیا۔ ''یہ شکنتلا دیوی کا گھر ہے۔''

☆......☆......☆

''کیا کہا......؟ میں کلکتہ میں ہوں؟'' سپنا اس طرح سے اچھل پڑی جیسے اسے کوئی برقی جھٹکا لگا ہو۔ وہ ایک لمحے کیلئے دم بخود رہ گئی۔ اسے اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا۔ وہ حیرت سے پھٹی نظروں سے عورت کو دیکھنے لگی۔ وہ ٹرے میز پر رکھ رہی تھی۔ وہ اس کی طرف گھومی تو سپنا نے اس سے پوچھا۔ ''آپ سچ کہہ رہی ہیں؟''

''اس میں جھوٹ بولنے کی کیا بات ہے؟'' عورت نے جواب دیا۔

''مگر میں......کلکتہ کیسے آ گئی؟'' سپنا کی حیرت دوچند ہو گئی۔ ''میں تو باریسال لانچ سے جا رہی تھی۔''

''بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ آدمی رخت سفر باندھتا ہے کسی اور منزل کیلئے پہنچ کہیں اور جاتا ہے۔'' عورت کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ پھیل گئی۔ ''ایسا خصوصاً حسین اور جوان لڑکیوں کے ساتھ ہوتا ہے۔''

سپنا کا ذہن ماؤٹ ہو رہا تھا اس لئے اس نے عورت کی بات پر دھیان نہیں دیا۔ وہ بے حد حیران اور پریشان تھی کہ ایسا کیسے ہو سکتا ہے اس کے ذہن پر کچھ بھی واضح نہ تھا۔ اسے صرف اتنا یاد تھا کہ وہ نوری بیگم کی لانچ میں اس کے ہمراہ باریسال جا رہی تھی اور اس نے جوس پیا تھا اس کے بعد کیا ہوا کچھ یاد نہیں آ رہا تھا۔ اس نے چند لمحوں کے بعد منتشر لہجے میں پوچھا۔ ''نوری بیگم کہاں ہیں؟ یہ شکنتلا دیوی کون ہیں؟''

''نوری کہاں ہیں میں نہیں جانتی۔'' عورت کہنے لگی۔ ''یہ بات تو شکنتلا دیوی بھی نہیں بتا سکتی ہیں وہ شاید نئے شکار کی تلاش میں جا چکی ہیں۔ وہ شکار لاتی ہیں اور شکنتلا دیوی کے ہاتھ بیچ کر چلی جاتی ہیں۔ شکنتلا دیوی اس گھر کی مالکن ہیں۔''

''کیا؟'' سپنا پر بجلی سی آ گری۔ اس کا دل بہت تیزی سے دھڑکنے لگا۔ ایک لمحے کیلئے اس کے دماغ اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا۔ اس کی کچھ سمجھ میں آیا......

کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ وہ بستر پر دھپ سے بیٹھ گئی۔ پھر اس سے جیسے کچھ بھی پوشیدہ نہیں رہا۔ اس کی سمجھ میں اب بہت کچھ آ گیا تھا۔ سنسنی خیز ناولوں اور فلموں کے مناظر اس کی نظروں کے سامنے گھومنے لگے۔ بڑی سیدھی سی بات تھی۔ نوری بیگم ایک شکاری عورت تھی۔ اس کا شکار کیا تھا اور اسے کلکتہ لاکر ایک ایسی عورت کے ہاتھ بیچ دیا تھا جس کے ہاں حسن و شباب کے خریدار آتے ہیں اس کیلئے صدمے سے زیادہ حیرت کی بات یہ تھی کہ اسے کلکتہ تک کیسے لایا گیا؟ کیا بیہوشی کی حالت میں؟

''سپنا بیگم!'' عورت نے اس سے سرد اور سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''رونے اور سوچنے کیلئے بہت وقت پڑا ہے آپ بیڈ ٹی لے لیں...... پھر غسل کر لیں...... باتھ میں آپ کے کپڑے موجود ہیں۔ جلدی سے تیار ہو جائیں شکنتلا دیوی ناشتے کی میز پر آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔''

عورت رکی نہیں کمرے سے نکلکر اس نے بے آواز دروازہ بند کیا۔ سپنا کا دل اس نئی افتاد پر بھر آیا۔ اسے یہ سب کچھ کسی بھیانک خواب کی طرح لگ رہا تھا۔ اسے جیسے اب بھی یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ کلکتہ میں ہے۔ اس نے سوچا...... وہ یقین کرے یا نہ کرے لیکن یہ حقیقت ہے کہ وہ کلکتہ میں ہے اور ایک شکاری کے جال میں پھنس چکی ہے۔ اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے سوا اب کوئی چارہ نہیں تھا۔

اب اسے کیا کرنا چاہیے؟ اس نے ٹرے میں سے چائے کی پیالی اٹھالی۔ چائے بہت عمدہ تھی۔ وہ سوچنے لگی رونے سے کچھ حاصل نہ ہوگا صرف دل کی بھڑاس نکل سکتی ہے اسے پہلے تو حالات سے سمجھوتا کرلینا ہوگا پھر یہاں سے نکلنے کی کوئی تدبیر کرنا ہوگی۔ ذہانت' جرأت اور عزم وحوصلے سے وہ سمندر کا سینہ بھی چیر سکتی ہے۔

سپنا نے جلدی سے چائے ختم کی۔ ایک کپ چائے نے اس کی توانائی جیسے بحال کر دی تھی۔ وہ ایک عزم وحوصلے سے اٹھی اور غسل خانے میں داخل ہوگئی۔ اندر سے اس نے دروازہ بند کرلیا۔ اس نے دیکھا غسل خانہ نہ صرف بہت بڑا ہے بلکہ بے حد شاندار ہے۔ وہ تصور بھی نہیں کرسکتی تھی کہ غسل خانے اتنے خوبصورت ہوتے ہیں۔ ایک کونے میں نہانے کا ٹب تھا۔ شاور تھا' دیوار گیر بڑا سا آئینہ تھا وہاں مختلف قسم کے شیمپو بھی تھے۔ سفید ٹرکش تولیہ اور عمدہ قسم کے صابن کی ٹکیہ بھی موجود تھی۔

اس نے خوب اچھی طرح اور بڑے اطمینان سے غسل کیا۔ اس نے نہانے میں

آدھے گھنٹے سے زائد وقت صرف کیا۔ ایسا لگا تھا کہ اس نے جیسے مہینوں سے غسل نہیں کیا ہو۔ نہانے کے بعد ٹرکش تولیا سے بدن پونچھنے کے بعد اسے بڑی فرحت اور تازگی محسوس ہوئی۔ خوشبو اس کے انگ انگ سے پھوٹ رہی تھی۔ صابن کے جھاگ سے اس کی تمام تھکن اور کسل مندی دور ہو چکی تھی۔ اس کا بدن ہی نہیں اس کا جی بھی ہلکا ہو گیا تھا۔

غسل خانے سے باہر آنے کے بعد سپنا سنگھار میز کے بڑے آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر بالوں میں کنگھی کرنے لگی۔ تھوڑی دیر کے بعد اس عورت نے جو چائے لے کر آئی تھی کمرے کا دروازہ کھول کر اندر جھانکا پھر جیسے اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ اس کا خیال تھا کہ سپنا رو رہی ہو گی۔ اس نے ابھی تک غسل نہیں کیا ہو گا جو لڑکیاں اغوا کر کے یہاں لائی جاتی تھی انہیں قابو کرنا بہت مشکل ہوتا تھا۔ کوئی لڑکی زخمی شیرنی کی طرح غضب ناک ہو جاتی تھی، کوئی زہریلی ناگن بن جاتی تھی۔ کمزور دل کی لڑکیاں رونے لگتی تھیں اور خودکشی کرنے کی کوشش کرتی تھیں۔ یہاں تو معاملہ برعکس تھا۔ یہ پہلی لڑکی تھی جو بالکل نہ روئی تھی اس کی آنکھوں سے ایک آنسو بھی نہیں نکلا تھا۔ وہ غم زدہ اور پریشان بھی نہیں لگ رہی تھی اسے قابو میں کرنے کیلئے کسی تدبیر کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اس عورت نے سکون و اطمینان کا گہرا سانس لیا۔ اسے سپنا کو راہ راست پر لانے کیلئے مامور کیا گیا تھا۔ دوسرے لمحے اس کے دل کے کسی کونے میں شک کی لہر اٹھی۔ کہیں یہ لڑکی اسی بازار کی تو نہیں ہے؟ اگر یہ کوئی شریف لڑکی ہوتی تو اس طرح اپنے آپ کو یہاں کے سانچے میں نہ ڈھالتی۔

وہ عورت کمرے میں داخل ہوئی تو سپنا نے اپنی گردن گھمائی۔ عورت نے پوچھا۔ آپ تیار ہیں؟''

''ہاں۔'' سپنا نے سر ہلایا پھر بولی۔ ''آپ کا نام کیا ہے؟''

''میرا نام جیونتی ہے۔'' وہ بولی پھر اسے گہری نظروں سے دیکھنے لگی۔ ''آپ بہت حسین ہیں۔''

''کاش! میں حسین نہ ہوتی۔'' سپنا ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''ایک بدصورت لڑکی ہوتی۔''

''حسن تو عورت کیلئے بہت بڑی دولت ہے۔''

جیونتی نے تعجب سے کہا۔ ''دنیا میں شاید ہی کوئی عورت ایسی ہو گی جو حسین ہونے کی تمنا نہ کرتی ہو۔''

''حسن دولت نہیں ایک عذاب ہوتا ہے۔'' سپنا بولی۔ ''اگر میں بدصورت ہوتی تو مجھے یہاں کبھی نہ لایا جاتا۔''

''چلئے'' جیونتی نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔ وہ کمرے سے نکل کر اس سے آہستگی سے بولی۔ ''آپ حسین ہی نہیں سمجھدار اور حقیقت پسند بھی ہیں۔ جب کہ یہ بات ہر لڑکی میں نہیں ہوتی ہے۔''

سپنا نے اس کے ہمراہ راہ داری سے گزرتے ہوئے کئی کمرے دیکھے جو نہایت آراستہ و پیراستہ تھے مگر اسے ان کمروں میں کوئی دکھائی نہیں دیا۔ اس نے اندازہ لگایا کہ یہ ایک بہت بڑی کوٹھی ہے اس نے کھانے کے کمرے میں داخل ہونے سے پہلے دو تین عورتوں کو دیکھا جو وضع قطع اور چہرے مہرے سے بے حد خطرناک اور ظالم دکھائی دے رہی تھیں۔

ناشتے کی میز پر شکنتلا دیوی دو حسین اور نوجوان لڑکیوں کے ساتھ بیٹھی اس کے انتظار میں اخبار پڑھ رہی تھی۔ شکنتلا دیوی اس کے تصور کے برعکس تھی۔ وہ ایک شفیق عورت دکھائی دے رہی تھی۔ اس کی عمر پچاس برس سے زیادہ لگ رہی تھی۔ وہ صحتمند اور بھرے بدن کی تھی۔ جوانی میں بہت حسین اور غیر معمولی پرکشش رہی ہوگی۔ اس کے آثار آج بھی واضح اور نمایاں تھے۔ وہ سفید ساڑھی میں ملبوس کسی دیوی کی طرح لگ رہی تھی۔ وہ سپنا کو نارمل دیکھ کر کھل اٹھی۔

''آؤ بیٹی!'' شکنتلا دیوی نے اسے بڑے پیار سے مخاطب کیا۔ سپنا میز کے قریب پہنچی تو اس کا ہاتھ پکڑ کے برابر والی کرسی پر بٹھا لیا۔ پھر اس نے جیونتی سے ناشتہ لانے کیلئے کہا۔ وہ چلی گئی تو سپنا سے بولی۔ ''میرا نام شکنتلا ہے۔ یہ دونوں لڑکیاں بھی میری بیٹیوں کی طرح ہیں ان میں ایک کا نام ورشنا اور دوسری کا نام روپا ہے۔ یہ دونوں آپس میں سہیلیاں ہیں۔''

ورشنا اور روپا نے اسے نمسکار کیا اور اس سے بڑی گرمجوشی سے ہاتھ ملایا۔ سپنا نے بھی جواباً بڑی گرمجوشی کا مظاہرہ کیا۔ یہ دونوں لڑکیاں بھی اس کی طرح بدنصیب تھیں اس نے ان کے بشروں سے اندازہ کیا تھا کہ وہ دل شکستہ سی ہیں۔

سپنا ان لڑکیوں سے ہاتھ ملا کر اپنی کرسی پر بیٹھ گئی تو شکنتلا دیوی اس سے بولی۔ ''تمہارے ذہن میں بہت سارے سوالات اٹھ رہے ہوں گے۔ تم بہت حیران اور پریشان ہوگی تم اطمینان سے ناشتہ کرلو پھر میں تمہارے ہر سوال کا جواب دوں گی۔ ویسے مجھے حیرت

اس بات پر ہے کہ تم ان تمام لڑکیوں سے یکسر مختلف نکلی ہو جو اب تک یہاں لائی گئی ہیں۔ مجھے ایسی لڑکیاں بہت پسند ہیں۔ میں نہ صرف ان کی بہت قدر کرتی ہوں بلکہ ان سے ہر ممکن تعاون بھی کرتی ہوں۔''

سپنا کو شکنتلا دیوی عجیب سی عورت لگی پھر اسے احساس سا ہوا کہ قربانی کے جانور کے ساتھ عموماً اچھی طرح سے پیش آیا جاتا ہے اور اس کا ہر طرح سے خیال رکھا جاتا ہے۔ یہ عورت میٹھی چھری ہے ایسی عورتیں بظاہر بہت اچھی ہوتی ہیں لیکن باطنی طور پر خودغرض، مکار اور بے حد خطرناک ہوتی ہیں۔ کسی کو شیشے میں اتار لینا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہوتا تھا۔ ایسی عورتوں سے دور، چوکنا اور ہوشیار رہنے کیلئے اس کی ماں اسے ہمیشہ تاکید کرتی تھی۔ اس لئے کہ اس کی ماں کو ایسی عورتوں سے دو مرتبہ تلخ تجربہ ہو چکا تھا۔ ایسی عورتیں محلے میں رہتی تھیں۔ ان سے سارا محلّہ تنگ اور عاجز تھا۔ آج وہ ویسی ہی ایک کے جال میں بہت بری طرح پھنس چکی تھی۔ نوری بیگم بھی ایک شاطر عورت نکلی تھی۔ جس نے اسے فریب دے کر یہاں پہنچا دیا تھا۔ ماں نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ وقت کا ہر لمحہ ناقابل اعتبار ہے کسی پر اندھا بھروسہ نہیں کرنا۔ اس سے غلطی ہو چکی تھی جس کا خمیازہ اب اسے بھگتنا تھا۔

جیونتی اور ایک عورت نے میز پر ناشتہ چننا شروع کیا۔ بڑا ہی پرتکلف ناشتہ تھا۔ بڑا اہتمام کیا گیا تھا۔ حلوہ پوری، آلو کی بھجیا، آملٹ، پراٹھے، دودھ، دہی اور بالائی کے علاوہ اس کیلئے فرائی قیمہ بھی تھا۔ جیونتی گرم گرم اور بڑی بڑی پوریاں تل کر لاتی جا رہی تھی۔ شکنتلا دیوی نے ناشتے کی میز پر ان دونوں لڑکیوں کے مقابلے میں اس کا بڑا خیال رکھا تھا۔ اس لئے کہ ابھی وہ نئی پنچھی جو تھی۔

سپنا کی بھوک ایک دم سے چمک اٹھی تھی۔ پوری اور پراٹھوں کی پلیٹوں سے اشتہا انگیز بھاپ اٹھ رہی تھی۔ وہ کھانے پر غیر محسوس انداز سے جیسے ٹوٹ پڑی تھی۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کئی دنوں کی بھوکی ہو۔ اسے کبھی اپنے گھر میں ایسا پرتکلف ناشتہ میسر نہیں آیا تھا۔ اس نے کوئی تکلف نہیں کیا۔ بھوک کے سامنے اس نے ہتھیار ڈال دیئے تھے۔ وہ خوب سیر ہو کر اٹھی تھی۔

پیٹ بھر گیا تو اسے خاصی آسودگی محسوس ہوئی بھرا ہوا پیٹ آسودگی بخشتا ہے۔ اس نے اپنے اندر ایک نئی توانائی اور ولولہ محسوس کیا۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ ساری دنیا سے لڑ سکتی ہے۔ ناشتے سے فراغت پانے کے بعد شکنتلا دیوی اسے اپنے بیڈ روم میں لے آئی جو

بہت خوبصورت اور شاندار تھا۔ اس نے جیونتی سے کہا کہ وہ چائے اس کے بیڈ روم میں پہنچا دے۔

شکنتلا دیوی نے چائے پیتے ہوئے اسے گہری نظروں سے دیکھا۔ ''تمہیں اس بات کا بخوبی اندازہ ہو گیا ہو گا کہ تم کہاں ہو؟''

''جی ہاں۔'' وہ تلخی سے بولی۔ ''میں نے خواب و خیال میں بھی نہیں سوچا تھا کہ کسی غلط جگہ پھنس جاؤں گی۔''

''اس کے باوجود تم نے بڑے صبر و تحمل اور بردباری کا مظاہرہ کیا ہے جیسے یہ حادثہ تمہارے لیے نیا نہیں ہے؟''

''میں اب حادثوں سے گزرنے کی عادی ہو گئی ہوں۔ اس لئے میں نے اس کا اثر نہیں لیا ہے لیکن میں اتنا جانتی ہوں کہ میں یہاں سے بھی بخیر و خوبی نکل جاؤں گی۔ مجھ پر کوئی آنچ نہیں آنے پائے گی۔''

''یہ تمہارا محض خیال ہے۔'' شکنتلا دیوی زیرِ لب مسکرائی۔ ''یہاں چڑیا بھی پر نہیں مار سکتی۔ بالفرض محال تم یہاں سے کسی نہ کسی طرح بچ کر نکل بھی گئیں تو اپنے پیروں پر کلہاڑی مارو گی۔ میں تمہاری تصویر پولیس کو دے دوں گی۔ پولیس تمہیں تلاش کر کے غیر قانونی طور پر ہندوستان میں داخل ہونے کے الزام میں گرفتار کر لے گی۔ تم یہاں کی پولیس سے واقف نہیں ہو یہ لوگ حسین اور جوان عورت کو دیکھ کر گدھ بن جاتے ہیں۔ ان کیلئے قانون نہیں ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ تم شاید نہیں چاہو گی پولیس اور جیل کے جہنم میں عذاب سہتے سہتے مر جاؤ۔''

''نہیں۔'' وہ لرز اٹھی اور اس کے سارے جسم میں سرد لہر اتر گئی۔ وہ سنبھل کر بولی۔ ''میں پولیس کو چکمہ دے کر نکل جاؤں گی۔''

''یہ اتنا آسان نہیں ہے۔'' شکنتلا دیوی نپے تلے لہجے میں کہنے لگی۔ ''اس لئے کہ یہ شہر اور یہاں کے لوگ تمہارے لیے اجنبی ہیں تم پولیس سے بچ جاؤ گی تو یہاں کے بدمعاشوں سے بچ نہ سکو گی۔ یہاں قدم قدم پر بھیڑیئے پھرتے ہیں۔''

سپنا نے اس کی باتوں کی تہہ میں پہنچ کر کہا۔ ''آپ جو چاہتی ہیں اس کے لیے میں کسی قیمت پر تیار نہیں ہوں۔ میں مر جاؤں گی مگر اپنی عزت نیلام ہونے نہیں دوں گی۔''

''جو لڑکی یہاں آتی ہے وہ اسی طرح کے مکالمے بولتی ہے۔'' شکنتلا دیوی نے

اسے پر خیال نظروں سے دیکھا۔ ''کسی لڑکی یا عورت کو راہ راست پر لانا کچھ زیادہ مشکل نہیں۔ عورت بڑی کمزور اور نازک سی شے ہوتی ہے اس پر مرد کے مقابلے میں تشدد کے طریقے زیادہ کارگر ثابت ہوتے ہیں مگر میں اس کی قائل نہیں ہوں۔ میں نے تمہیں نوری بیگم سے کسی فائدے کے پیش نظر خریدا ہے۔ میں یہ چاہوں گی مجھے تمہاری اچھی قیمت ملے۔ اس لئے ضد سے تمہیں کچھ حاصل نہ ہوگا۔''

''چلئے...... آپ بھی مجھے آزما کر دیکھ لیجئے۔'' وہ مضبوط لہجے میں بولی۔

''تم چونکہ ابھی نادان اور ناتجربہ کار ہو اس لیے یہ بات کہہ رہی ہو۔'' شکنتلا دیوی نے اسے اس طرح دیکھا جیسے وہ کوئی بہت چھوٹی سی بچی ہو۔ ''میں نے کبھی ایسی احمقانہ باتوں کو اہمیت نہیں دی۔ اس لئے کہ سرکش لڑکیوں کو ایک منٹ میں ٹھیک کرنا جانتی ہوں۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب تم دونوں صورتوں میں سے کسی ایک صورت کو بھی قبول نہ کرو۔''

''کون سی صورت؟'' سپنا نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''میں تمہیں دو صورتیں بتا رہی ہوں۔'' شکنتلا دیوی اس کے چہرے پر اپنی نگاہیں مرکوز کر کے کہنے لگی۔ ''ایک صورت تو یہ ہے کہ تم معاملہ فہمی کا ثبوت دو اور میری مرضی کے مطابق اپنی زندگی گزار دو تو میں تمہیں یہاں شہزادیوں کی طرح رکھوں گی۔ تمہیں ہر قسم کی سہولت حاصل ہوگی۔

دوسری صورت یہ ہے کہ میں مہینے میں ایک مرتبہ تم جیسی لڑکیوں کا نیلام کرتی ہوں۔ اس نیلام میں دولت مند لوگ آتے ہیں۔ ان میں بعض لوگ نیلام میں خریدی ہوئی لڑکیوں کو اپنی بیوی بھی بنا لیتے ہیں یا جب ان کا جی بھر جاتا ہے تو وہ میرے یا کسی اور کے ہاتھ بیچ دیتے ہیں پھر وہ بکتی رہتی ہیں تمہیں ان میں سے کون سی صورت پسند ہے؟''

سپنا نے کچھ دیر تک سوچنے کے بعد بمشکل کہا۔ ''نیلام کی۔''

''وہ کس لئے؟''

''اس لئے کہ مجھے فرار ہونے اور اپنی عزت و آبرو بچانے کا موقع آسانی سے مل جائے گا۔'' سپنا نے جواب دیا۔

''تمہارا کیا خیال ہے جس نے تمہیں خریدا ہوگا تم اس کے چنگل سے آسانی سے نکل جاؤ گی؟ یہ تمہارا وہم ہے۔ یہ لوگ بڑے سفاک اور خطرناک ہوتے ہیں جرائم پیشہ ہوتے ہیں۔ تم اپنے ارادوں میں کبھی کامیاب نہ ہوسکو گی۔''

''کوشش کر کے دیکھنے میں حرج کیا ہے۔'' اس نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''میرے پاس عزم و حوصلہ ہی نہیں جرأت اور ذہانت بھی ہے۔ آخر وہ کب اور کس دن کام آئے گی؟ اور پھر مجھے خدا کی ذات پر بھروسہ ہے کہ وہ میری مدد کرے گا۔''

''دولڑکیوں نے ایسی ہی کوشش کی تھی مگر وہ کامیاب نہ ہوسکیں۔ ان کا عبرتناک انجام ہوا تھا۔'' شکنتلا دیوی نے اسے جیسے ڈرایا۔

''مجھے موت سے زیادہ اپنی عزت و آبرو کی فکر ہے۔ کوئی دیوار میرا راستہ نہیں روک سکتی۔ میں یہ جانتی ہوں کہ بالآخر جیت میری ہی ہوگی۔ آپ بھی سنیں گی کہ میں اپنے خریدار کو چکمہ دے کر نکلنے میں کامیاب ہوگئی۔'' سپنا نے بڑے اعتماد سے کہا۔

''ایک ہفتہ کی بات ہے۔'' شکنتلا نے کہا۔ ''ویسے مجھے امید نہیں ہے مگر میں تمہاری کامیابی کی خواہشمند ہوں۔''

☆......☆......☆

شمسو کی لاش کو گہرے گڑھے میں دفن کرنے کے بعد بوڑھے اور وقار حسین نے زمین کی سطح ہموار کر دی تاکہ کسی کو شبہ نہ ہو۔ وہ گھر لوٹے تو دن ڈوب چکا تھا۔ چاروں طرف اندھیرا پھیل رہا تھا۔ وقار حسین نے بوڑھے کی گردن کا زخم دیکھا وہ زیادہ گہرا نہیں تھا۔ اس نے زخم صاف کر کے اس پر دیسی مرہم لگا دیا اور بوڑھے کو بستر پر لٹا دیا۔

چند لمحوں کے بعد بوڑھے نے کہا۔ ''اگر آپ کو پانچ سات منٹ کی اور دیر ہو جاتی تو وہ یقیناً مجھے ذبح کر چکا ہوتا۔''

''مجھے ان بچھوؤں کو پکڑنے میں دیر ہوگئی تھی۔'' وقار حسین نے جواب دیا۔ ''تمہیں کچھ ہو جاتا تو میں تمہارے بچوں کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہتا۔''

''مجھے اندازہ نہ تھا کہ وہ کسی بات کا لحاظ نہیں کرے گا اور شقی القلبی پر اتر آئے گا۔'' بوڑھے نے کہا۔ ''میری دعا ہے کہ رقیہ خانم اور اس ڈائری کا پتا چل جائے تاکہ ان شیطانوں کا خاتمہ ہو جائے۔ دس کروڑ ٹاکا کا سونا جو تھا اسے شیطانوں نے آپس میں دس بارہ برس پہلے ہی ہندوستان لے جا کر فروخت کر دیا اور اس کی رقم آپس میں بانٹ لی تھی۔ اب اس کا وجود ہی نہیں رہا ہے۔ یہ غلط تاثر دیا جا رہا ہے کہ سونا نامعلوم مقام پر محفوظ ہے۔ سونا میں نے ہی تو دو شیطانوں کی نگرانی میں ہندوستان پہنچایا تھا۔''

''مجھے سونے کی نہیں صرف ڈائری کی تلاش ہے۔'' وقار حسین کہنے لگا۔ اس لئے

کہ میں صرف دو شیطانوں کے بارے میں جانتا ہوں جب کہ اس ڈائری میں پورے دس شیطانوں کے اصل نام و پتے شامل ہیں۔ جب تک یہ ڈائری ہاتھ نہیں لگ جاتی اس وقت تک ان کا صفایا نہیں ہوسکتا۔ رقیہ خانم ملے نہ ملے ڈائری مل جائے تا کہ میں ان شیطانوں کو ختم کر کے سکون سے مرسکوں۔''

''آپ پہلے ان دو شیطانوں سے کیوں نہیں نمٹ لیتے؟ اس طرح ان کی تعداد کم ہو جائے گی۔''

''شمسو کو راستے سے ہٹانے کے بعد اب راستہ کسی قدر صاف ہو گیا ہے۔'' وقار حسین بولا۔ ''راستے میں ایک دو پتھر اور ہیں پہلے انہیں ہٹانا ضروری ہے ورنہ میں اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوسکوں گا۔''

''آپ میری بات مانیں تو میں آپ کو ایک مشورہ دوں۔'' بوڑھے نے کہا۔ ''آپ یہاں سے کچھ دنوں کیلئے کلکتہ چلے جائیں دشمن آپ کو نہ پا کر سمجھے گا کہ آپ دوبارہ ملک سے واپس چلے گئے ہیں پھر آپ واپس آ کر رقیہ خانم کی تلاش شروع کر دیں۔''

''نہیں' میں اس ملک کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا۔'' وقار حسین نے کمرے میں اضطراب سے ٹہلتے ہوئے کہا۔ ''میں اس بے وقوف عورت کو ضرور تلاش کروں گا جس کی وجہ سے مجھے اتنی پریشانی اٹھانی پڑ رہی ہے۔ دشمن اس کے تعاقب میں ہے وہ یہ بات اچھی طرح جانتی ہے کہ ان شیطانوں نے کتنے معصوم لوگوں کو عذاب دے کر قتل کیا ہے جن پر شک تھا کہ وہ رقیہ خانم کو جانتے ہیں۔ میں نے ان شکاری کتوں کو پہچان لیا ہے ان میں شمسو بھی تھا۔''

''وہ نادان یہ سمجھ کر کہیں روپوش ہوگئی ہے کہ دشمن اس کی گرد کو بھی نہ پہنچ سکے۔''

''رقیہ خانم کو آپ سے اتنی نفرت کس لیے ہوگئی ہے؟ جبکہ وہ آپ سے بہت محبت کرتی تھی؟''

''اسے یہ غلط فہمی ہوگئی کہ میں نے اس کے باپ کو بڑی بے رحمی سے قتل کیا ہے۔'' وقار حسین کہنے لگا۔ ''حالانکہ اس کے باپ کو شیطانوں کے پالتو کتوں نے مارا تھا۔ اس کے بدن پر خنجر سے اتنے شگاف ڈالے تھے کہ خون کا آخری قطرہ تک بہہ گیا تھا۔ اس کا جرم یہ تھا کہ اس نے ایک شیطان کے پاس سے ڈائری چرالی تھی۔ اس نے مجھے ٹیلی فون کر کے بلایا تھا کہ میں جتنا جلدی ہو سکے اس کے پاس آ کر ڈائری لے جاؤں اس نے میرے آنے سے خطرات کے پیش نظر یہ ڈائری اپنی بیٹی کو دیدی کہ وہ اسے کسی محفوظ جگہ چھپا کر

آئے۔ جس وقت وہ ڈائری کسی جگہ رکھ کر آئی تو اس کے باپ کو قتل کیا جا چکا تھا اور میں وہ خنجر اٹھا کر دیکھ رہا تھا جس سے اسے قتل کیا گیا تھا۔ پھر اسے غلط فہمی ہو گئی کہ میں نے اس کے باپ کو قتل کیا ہے اور اسے بھی قتل کر دوں گا۔ وہ پھر فرار ہو گئی پھر اس کے بعد سے وہ مجھے نہیں ملی۔ کچھ دنوں پہلے وہ مجھے کومیلا میں دکھائی دی تھی۔ میں رات کے وقت اس کے گھر پر پہنچا۔ شاید وہ گھر پر اکیلی تھی تنہا زندگی گزار رہی تھی۔ اس نے اپنے آپ کو رقیہ خانم تسلیم کرنے سے انکار کر دیا وہ اپنے آپ کو بلقیس بانو کہتی رہی۔ اس نے یہ تک گوارا نہیں کیا کہ دروازہ کھول کر میرے سامنے آتی۔ اس نے مجھے پہچاننے سے انکار کر دیا۔ میری کوئی بات نہیں سنی۔ میں دوسرے دن صبح اس کے گھر جانے کیلئے نکلا تو میں نے شمسو کو دیکھا۔ جب میں اس کے گھر پہنچا تو وہ گھر پر نہیں تھی۔ دشمن اس کے گھر کو اندر سے تباہ کر گئے تھے۔ وہ اب یہ سمجھتی ہے کہ میں شیطانوں کا مہرہ ہوں...... میرے پاس اس کا کیا علاج ہے؟''

''میں بھی رقیہ خانم کی تلاش میں نکلتا ہوں۔'' بوڑھے نے کہا۔ ''ان شکاری کتوں کی بھی خبر لیتا ہوں آپ آج سے مجھے بھی اپنے مشن میں شریک سمجھیں۔ رقیہ خانم مل گئی تو میں اسے سمجھانے کی کوشش کروں گا۔ وہ میری کسی بات کو رد نہیں کرے گی۔ میں نے اسے بیٹی بنایا تھا۔''

''نہیں' اب تم بہت بوڑھے اور کمزور ہو چکے ہو۔ تمہیں آرام کی سخت ضرورت ہے۔ میں یہ مشن تنہا انجام دے لوں گا۔''

''ان بوڑھی ہڈیوں میں گو طاقت نہیں ہے لیکن یہ ہاتھ آج بھی اتنی پھرتی' تیزی اور چابکدستی سے چاقو اور پستول چلا سکتے ہیں کہ دشمن تصور بھی نہیں کر سکتا ہے۔ میں جب ان شیطانوں کا مہرہ تھا تب میں نے ان کے اشاروں پر بڑے جرم کیے۔ آج میں اس کی تلافی کرنا چاہتا ہوں۔''

☆......☆......☆

سپنا کو شکنتلا دیوی کے ہاں رہتے ہوئے دو دن گزر گئے تھے۔ وہ جیسے سونے کے پنجرے میں قید تھی۔ بڑے آرام و سکون سے تھی۔ کسی بات کی تکلیف نہ تھی۔ اس کے ہر طرح کے آرام کا خیال رکھا جا رہا تھا۔ ان دو دنوں میں اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ دو مہینوں سے رہ رہی ہو۔ اس نے یہاں سے فرار ہونے کی کوئی تدبیر نہیں کی۔ البتہ وہ سوچ رہی تھی کہ وہ اپنے خریدار سے کس طرح سے نجات پا سکتی ہے۔

شکنتلا دیوی کے ہاں پندرہ سولہ حسین وجمیل لڑکیاں تھیں۔ چھ سات لڑکیاں صبح دس گیارہ بجے آ جاتی تھیں۔ جو ہر قسم کے رقص کی تربیت حاصل کرتی تھیں۔ شام ہوتے ہی پندرہ سولہ لڑکیاں جمع ہو جاتی تھیں۔ بعض خریدار انہیں اپنے ساتھ لے جاتے یا پھر کسی کمرے میں صبح تک رہتے۔ رقص سرود کی محفل رات بارہ بجے تک جمی رہتی۔ شکنتلا دیوی نے اسے نشست گاہ میں دن ڈھلے کے بعد آنے سے منع کیا تھا تاکہ اس پر کسی کی نظر نہ پڑ سکے۔ ایک روز وہ غلطی سے نشست گاہ کے دروازے کے پاس سے گزری تو ایک خریدار کی نظر اس پر پڑ گئی۔ اس مرد نے چالیس ہزار روپے تک کی پیشکش کر ڈالی مگر شکنتلا دیوی نے صاف انکار کر دیا۔ اس نے اس سے کہا کہ وہ سنیچر کے دن رات دس بجے آ کر نیلام میں بولی دے کر اسے خریدنے کی کوشش کرے۔

ورشنا اور روپا ہفتے میں ایک دن کیلئے اپنے گھر جمشید پور جاتی تھیں۔ انہوں نے اپنے گھر اور محلے والوں کو بتایا ہوا تھا کہ وہ کلکتہ میں ایک ریڈی میڈ گارمنٹس فیکٹری میں ملازمت کرتی ہیں۔ ان دونوں کی کہانیاں بڑی دردناک اور اذیت ناک تھیں۔ ورشنا بائیس تیئیس برس کی تھی اس کی دو برس پہلے شادی ہوئی تھی۔ شادی کے تین مہینے کے بعد اس کی ساس اور دو نندوں نے مل کر اسے جلانے کی کوشش کی تھی کیونکہ وہ مطلوبہ جہیز نہیں لائی تھی۔ وہ کسی نہ کسی طرح وہاں سے بچ کر نکلنے میں کامیاب ہو گئی تھی پھر اس پر چوری کا الزام عائد کر کے گرفتار کرا دیا گیا۔ حوالات اور جیل میں پولیس نے اس کے ساتھ جو سلوک کیا وہ ایک الگ قصہ غم ہے جب وہ عدم ثبوت کی بنا پر ایک برس تک پولیس کے تشدد کا نشانہ بننے کے بعد رہا ہوئی تو وہ کلکتہ آ گئی۔ اس کی ملاقات شکنتلا دیوی سے ہو گئی۔ اب وہ اپنے بوڑھے والدین کی کفالت کرتی ہے اور اپنے دو بھائیوں کو پڑھا رہی ہے۔ روپا کی کہانی ذرا مختلف تھی۔ ایک امیر کبیر آدمی کے بیٹے اور اس کے چار ساتھیوں نے روپا کو اغوا کر کے اسے ایک مہینے تک حبس بیجا میں رکھا تھا پھر ایک روز وہاں سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئی پھر اس نے پولیس میں رپورٹ درج کرائی تو ملزمان گرفتار کرنے کے بجائے اسے بھی چوری کے الزام میں حوالات میں ڈال دیا گیا۔ جیونتی کے پاس اس کی ماں روتی دھوتی گئی تو شکنتلا دیوی نے اپنے اثر ورسوخ سے رہا کرا دیا۔ اس طرح روپا شکنتلا دیوی کی بساط کا مہرہ بن گئی تھی۔

یہاں سے فرار ہونے کیلئے ورشا اور روپا کی دوستی بہت ضروری تھی۔ اس نے دو دن کی محبت اور رفاقت سے دونوں کا دل جیت لیا تھا۔ دو دنوں میں وہ ایک دوسرے کے اس

قدر قریب آ گئی تھیں جیسے برسوں سے جان پہچان ہو۔ اس نے ابھی انہیں اعتماد میں نہیں لیا تھا اسے ایسی جلدی بھی نہیں تھی۔ وہ جانتی تھی کہ یہ دونوں یہاں سے فرار کرانے میں کوئی مدد نہیں کریں گی۔ وہ صرف یہ چاہتی تھی کہ کسی طرح سے پرکاش آنند کو خبر ہو جائے کہ وہ شکنتلا دیوی کی قید میں ہے۔ پرکاش آنند اسے یہاں سے پولیس کی مدد سے نکال لے جائے۔ اس میں ایک قباحت تھی شکنتلا دیوی اسے غیر قانونی طور پر ہندوستان میں داخل ہونے کے الزام میں گرفتار کرا سکتی تھی۔

اس نے غیر محسوس انداز سے یہاں کا جائزہ لیا۔ گیٹ پر ایک مسلح چوکیدار ہر وقت پہرہ دیتا رہتا تھا۔ اس کے علاوہ جو دو بوڑھی عورتیں جیونتی کے کام میں ہاتھ بٹاتی تھیں وہ بھی ایک طرح سے محافظ تھیں اور جوڈو کراٹے کی ماہر تھیں۔ جرائم پیشہ تھیں۔ چھ چھ برس کی جیل کاٹی ہوئی تھیں۔ وہ ہر وقت اس پر کڑی نظر رکھتی تھیں۔ اس کے علاوہ حسن و شباب کے خریداروں میں اعلیٰ افسر ہی نہیں پولیس کے اعلیٰ افسران بھی ہوتے تھے۔ ان کے ایک ٹیلی فون پر لڑکیوں کو ان کے پاس بھیج دیا جاتا تھا یا پھر وہ رات کو یہاں رک جاتے تھے۔ اس اڈے کی وجہ سے شکنتلا دیوی کا بڑا اثر و رسوخ تھا۔ ایک مرتبہ جیونتی کا چھوٹا بھائی کالج کی ایک طالبہ کو اغوا کر کے دو دن تک حبس بیجا میں رکھ کر تاوان وصول کرنے کے الزام میں پکڑا گیا تو شکنتلا نے صرف ایک ٹیلی فون کیا تو اسے اسی وقت رہا کر دیا گیا تھا۔

سپنا یہ چاہتی تھی اس کے نیلام ہونے کی نوبت نہیں آئے۔ اس منحوس دن سے پہلے یہاں سے کسی نہ کسی طرح فرار ہو جانے میں کامیاب ہو جائے۔ اس نے ورشا اور روپا کو اعتماد میں لینے کی کوشش کی تو انہوں نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔ انہوں نے اس سے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ کسی قیمت پر احسان فراموشی کر کے شکنتلا دیوی کی دشمنی مول نہیں لے سکتی ہیں۔ البتہ انہوں نے اس سے وعدہ کیا کہ جس روز اس کا نیلام ہو گا اس روز وہ اسے ایک پستول لا کر دیں گی جس وقت خریدار اسے اپنے ہمراہ لے کر جائے گا تب وہ اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرے۔ سپنا کو ان کی بات ماننے کے سوا چارہ بھی نہیں تھا۔

جس روز نیلام ہونے والا تھا اس روز صبح گیارہ بجے چار لڑکیاں کہیں سے لائی گئیں۔ ان کی عمریں چودہ برس سے بیس برس تک تھیں۔ وہ حسین تھیں۔ انہیں اغوا کر کے نہیں بلکہ سبز باغ دکھا کر لایا گیا تھا۔ رات نو بجے مہمانوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہوا۔ ان کی خاطر تواضع کیلئے شراب کا اہتمام کیا گیا تھا۔ نیلام کا بندوبست نشست گاہ میں کیا گیا تھا۔

نیلام کے فرائض شکنتلا دیوی انجام دے رہی تھی۔ کوئی چالیس کے قریب حسن و شباب کے خریدار موجود تھے۔ سب سے پہلے چودہ برس کی ایک لڑکی نیلام کیلئے پیش کی گئی۔ اس کی بولی ایک ہزار روپے سے شروع ہو کر بیس ہزار روپے پر ختم ہوئی۔ ایک ساٹھ برس کے مارواڑی نے اسے خرید لیا تھا۔ اس طرح مختلف لڑکیوں کا نیلام ہوتا رہا۔

سپنا کو سب سے آخر میں پیش کیا گیا تھا۔ شکنتلا دیوی نے اس کا سنگھار کر کے اسے دلہن بنا دیا تھا۔ عروسی جوڑا پہنایا تھا۔ سپنا نے آئینے میں اپنے آپ کو دیکھا تو دیکھتی رہ گئی تھی اسے اندازہ نہ تھا کہ وہ دلہن کے روپ میں ایک قیامت بن جائے گی۔ اس کا حسن جہاں سوز آنکھوں کو خیرہ کرنے والا تھا مگر اس کے دل کو کوئی خوشی نہیں ہوئی تھی۔ یہ حسن آج اس کیلئے ایک وبال بن گیا تھا۔

ورشنا اور روپا نے اسے بتایا تھا جب کسی لڑکی کو نیلام کے لیے پیش کیا جاتا ہے تو آنکھ بند کر کے اس کی بولی نہیں دی جاتی بلکہ بولی لگانے سے پہلے بولی لگانے والے اسے اس طرح دیکھتے' پرکھتے اور جانچتے ہیں جس طرح قربانی کا جانور خریدنے سے پہلے دیکھا جاتا ہے اور پھر شکنتلا دیوی بھی زیادہ سے زیادہ بولی کیلئے اس کی اس طرح نمائش کرتی ہے کہ خریدار تڑپ اٹھے۔ ایک عورت کی اس سے بڑی توہین اور تذلیل سپنا کے نزدیک کوئی نہیں تھی۔ اسے بھی تضحیک سے دوچار ہونا تھا۔ اس لئے جس وقت اسے شکنتلا دیوی نشست گاہ کی طرف لے کر بڑھی تو اس کا دل بہت تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے اچھل کر باہر آ جائے گا۔ صرف اس کی پیشانی ہی عرق آلود نہیں ہو گئی تھی بلکہ سارا بدن بھیگ گیا تھا۔ اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے جیسے اسے مقتل کی طرف لے جایا جا رہا ہو۔ اس کے حواس منتشر تھے اور ہوش چھنتا جا رہا تھا۔ وہ ایسا محسوس کر رہی تھی کہ جسم میں خون ہی نہیں رہا ہو اور جیسے آخری قطرہ تک نچوڑ لیا گیا ہو۔ وہ بہت نحیف اور کمزور ہو گئی ہو اسے شکنتلا دیوی اور جیونتی نے سہارا نہیں دیا ہوتا تو وہ چند قدم چلنے کے بعد گر پڑتی۔

جب وہ نشست گاہ میں داخل ہوئی تو اس نے دیکھا حسن و شباب کے سوداگر شراب سے شغل کر رہے ہیں۔ ورشنا اور روپا ساقی کے فرائض انجام دے رہی تھیں۔ جن لڑکیوں کا نیلا ہو چکا تھا وہ اپنے اپنے آقاؤں کے ساتھ بیٹھی ہوئی چہک رہی تھیں اور ان کے آقا بھی خوش تھے۔ فضا میں ایک شور سا گونج رہا تھا کسی بات پر بھونڈے قہقہے لگ رہے تھے۔ سپنا مہکتی ہوئی داخل ہوئی تو شور اور قہقہے دم توڑتے گئے اور ساری محفل پر سناٹا چھا گیا۔

چند لمحوں کے بعد پوری محفل میں ایک اضطراب سا پیدا ہوا اور ایک کونے سے دوسرے کونے تک بھن بھناہٹ ہونے لگی جیسے ان لوگوں نے اپنی زندگی میں ایسا شعلہ مجسم کبھی نہ دیکھا ہو۔ مردوں نے ایک دوسرے کے کہنیاں ماریں اور آنکھوں میں اس کے حسن کی داد دینے لگے۔ وہ ان کے دلوں پر بجلی بن کر گری تھی۔ اس کی لمبی گھنیری زلفیں، غزالی آنکھیں اور پرشکوہ سراپا قیامت ڈھا رہا تھا۔ وہ ذلت کے احساس سے گڑی جا رہی تھی۔ اس میں اتنی تاب نہ تھی کہ وہ ان بھیڑیوں کی طرف دیکھ سکے۔ اسے دیکھنے والوں نے اس کی ادا سمجھا۔ سپنا انہیں اور حسین دکھائی دینے لگی تھی۔

ان میں سے ایک شخص شراب کے نشے میں جھومتا ہوا اٹھا اور سپنا کی طرف بڑھنے لگا تو شکنتلا دیوی نے اس کا راستہ روک لیا۔ ''کہاں چلے''

''میں راج کماری کو دیکھ تو لوں کہ'' وہ لڑکھڑاتی زبان سے بولا۔

''یہ اصلی ہیرا ہے اسے میں کسی کو بھی ہاتھ لگانے نہیں دوں گی۔'' شکنتلا دیوی نے تیزی سے کہا۔

جب وہ شخص نشست پر براجمان ہو گیا تو شکنتلا دیوی اس کے پاس کھڑی ہو گئی۔

''نیلام شروع ہوتا ہے۔ بولی دینا شروع کریں۔''

''بیس ہزار روپے۔'' ایک پولیس افسر نے جو سادہ لباس میں تھا اس نے بولی کا آغاز کیا۔

''پچیس ہزار...... تیس ہزار...... بتیس ہزار...... چالیس ہزار...... سپنا دیکھ رہی تھی، سن رہی تھی ہر کوئی پرجوش انداز سے ایک دوسرے سے بڑھ کر بولیاں دے رہا تھا۔ وہ اس کے حصول کیلئے پاگل ہو رہے تھے۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی کبھی کبھی نگاہ اٹھا کر ان ہوس پرستوں کی طرف دیکھ لیتی تھی جن کے چہرے مکروہ تھے۔ وہ شیطانوں کی طرح چیخ رہے تھے۔

سپنا کی نظر دائیں جانب والے صوفوں پر بیٹھے ہوئے مردوں کے درمیان بیٹھے ایک نوجوان پر پڑی جو بڑا خوش پوش اور سمارٹ دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے اس نوجوان مرد کے چہرے پر اضطراب کی جھلملاہٹ دیکھی۔ اس نے یہ بھی محسوس کیا کہ اس نوجوان مرد کی آنکھوں میں حیرانی اور تجسس ضرور ہے مگر وہ ہوس پرست نہیں ہے جو محفل میں موجود خبیثوں کی آنکھوں میں ہے۔ وہ ان سب سے ایک علیحدہ شخص معلوم ہوتا تھا۔ اس نے اب تک کوئی

بولی نہیں دی تھی۔ وہ خاموش سا بیٹھا سب کی بولیاں سن رہا تھا اور اسے ایک ٹک دیکھ رہا تھا۔ سپنا نے ایک لمحے کیلئے سوچا یہ شخص کون ہے کس لئے آیا ہے؟ نیلام میں حصہ کیوں نہیں لے رہا؟

سپنا نے اس کی طرف دوسری مرتبہ دیکھا تو اس کا دل بے اختیار دھڑک اٹھا تھا۔ وہ اسے کسی اچھے گھرانے کا فرد دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے ایک لمحے کیلئے دل میں سوچا کہ کاش یہ شخص اسے خرید کر لے جائے۔ ایسا شخص اس کی قسمت کا مالک بن جائے تو وہ اسے قبول کر لے گی مگر اسے ایسا لگ رہا تھا یہ نوجوان نیلام دیکھنے آیا ہے۔ حصہ لینے نہیں۔

بولی ایک لاکھ بیس ہزار تک پہنچ کر رکی۔ جس شخص نے سب سے زیادہ بولی دی تھی سپنا نے اس شخص کو دیکھا اس کے بدن پر ایک جھرجھری سی آ گئی وہ ایک پچاس برس کا موٹا' بھدا اور بے ڈول شخص تھا۔ اس کا قد چھ فٹ سے زیادہ ہی ہوگا وہ کسی دیوزاد کی طرح لگ رہا تھا اور اسے اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے گھور رہا تھا۔ اس کے چہرے اور ہونٹوں پر فتح مندی کی مسکراہٹ گہری ہونے لگی تھی۔

جب اس نے ایک لاکھ بیس ہزار روپے کہا تو سب کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ کوئی اس کے مقابلے پر نہیں آیا تو شکنتلا دیوی نے چاروں طرف بیٹھے ہوئے سوداگروں پر ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالی پھر اس نے بلند آواز میں کہا۔ ''ایک لاکھ بیس ہزار ایک' ایک لاکھ بیس ہزار......'' اس نوجوان نے اپنی جگہ سے اٹھ کر کہا۔ ''ایک لاکھ تیس ہزار روپے......''

سپنا نے اسے بڑھ کر بولی دیتے ہوئے سنا تو خوشی سے اس کی آنکھیں چھلک پڑیں۔ اسے جیسے یقین نہیں آیا۔ اس موٹے شخص نے نوجوان کو تیر آلود نظروں سے گھورا۔ اس کا جیسے بس نہیں چل رہا تھا ورنہ وہ اسے گولی مار دیتا پھر وہ غرا کر بولا۔ ''ایک لاکھ چالیس ہزار۔''

وہ نوجوان بھی خم ٹھونک کر میدان میں آ گیا تھا۔ وہ زیر لب مسکرایا۔ اس موٹے شخص کی طرف فاتحانہ نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''ایک لاکھ ساٹھ ہزار روپے۔''

وہ موٹا شخص آپے سے باہر ہو کر کچھ کہنے والا تھا اس کے ساتھی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر بٹھا لیا اور سرگوشی کے انداز میں بولا۔ ''کیا تمہاری عقل ماری گئی ہے۔ جیون لعل جو تو اس لڑکی کیلئے پاگل ہو رہا ہے۔ ہندوستان میں کیا ایسی ناریوں کی کوئی کمی ہے۔ دس دس ہزار میں اس سے کہیں حسین لڑکیاں مل جائیں گی۔ چالیس ہزار روپے میں اداکارائیں آ جاتی ہیں۔

لگتا ہے کہ اس کا باپ ابھی ابھی مرا ہے اس لئے وہ اپنی دولت لٹا رہا ہے۔“

کسی نے اس نوجوان سے بڑھ کر بولی نہیں دی۔ سپنا دل میں بہت خوش ہو رہی تھی کہ اللہ نے اس کی سن لی۔ اس کی دلی مراد بر آئی۔ دوسری طرف شکنتلا دیوی بھی بہت خوش تھی کہ سپنا نے اس کے وارے نیارے کر دیئے تھے۔ آج تک کوئی لڑکی اتنی قیمت میں فروخت نہیں ہوئی تھی۔ زیادہ سے زیادہ پچاس ساٹھ ہزار روپے تک بکتے تھے۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے لکشمی دیوی اس کے گھر اتر آئی ہو۔

تھوڑی دیر کے بعد سب چلے گئے۔ نشست گاہ میں اس کے علاوہ شکنتلا دیوی، وہ نوجوان اور روپا تھی۔ ورشنا اس نوجوان کیلئے شربت لانے گئی ہوئی تھی۔ اس لئے کہ وہ شراب نہیں پیتا تھا۔ سپنا نے دیکھا تھا اس نے واقعی شراب چکھی تک نہیں تھی۔

اس نوجوان نے اپنی جیب سے رقم نکال کر شکنتلا دیوی کے آگے ڈال دی۔ ”یہ پچیس ہزار روپے ہیں۔ میں کل گیارہ بجے دن بینک سے رقم نکلوا کر لاؤں گا بقایا رقم ادا کر کے سپنا بیگم کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ آپ انہیں تیار رکھئے گا۔“

شکنتلا دیوی کو بڑی مایوسی ہوئی اور اسے ناگوار سا بھی لگا۔ ”یہ اصول کے خلاف ہے جمال صاحب! آپ کو پوری رقم ادا کرنا چاہیے۔“

”دراصل میں یہاں رقص دیکھنے آیا تھا۔“ اس نے کہا۔ ”آپ کے چوکیدار نے بتایا کہ محفل نہیں جمے گی بلکہ حسین و جمیل لڑکیوں کا نیلام ہوگا۔ میں نیلام دیکھنے کیلئے رک گیا تو اس موہنی صورت نے دل پر ایسا جادو کیا کہ مجھے اس چاند کو خریدنا پڑا' کہئے تو چیک عنایت کر دوں۔“

”اگر آپ کل بارہ بجے تک رقم نہیں لے کر آئے تو نہ سپنا بیگم آپ کے ساتھ جائے گی اور نہ یہ ایڈوانس رقم واپس ملے گی۔“ وہ کاروباری لہجے میں بولی۔

”آپ فرمائیں تو صبح نو بجے حاضر ہو جاؤں؟“ جمال اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے سپنا کو دزدیدہ نظروں سے دیکھا۔

”جیسی آپ کی مرضی......“ شکنتلا دیوی بولی۔

☆......☆......☆

سپنا گہری نیند میں غرق سندر سا سپنا دیکھ رہی تھی کہ کسی نے اسے بری طرح جھنجھوڑ کے جگا دیا۔ اس نے بیدار ہو کر دیکھا تو اس کی چیخ نکل گئی اور وہ دہشت زدہ نظروں

سے دیکھنے لگی۔ اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ ایک ڈاکو جس کا چہرہ ڈھاٹے میں چھپا ہوا تھا وہ اس پر بندوق تانے کھڑا تھا۔ اس کی لال لال آنکھیں چمک رہی تھیں۔ ان میں سے سفا کی جھانک رہی تھی۔ وہ لمبا تڑنگا اور مضبوط جسم کا مالک تھا۔ وہ کسی سانپ کی طرح پھنکارا۔ ''بستر سے نکلو۔'' سپنا کے جسم پر لرزہ طاری ہو گیا۔ وہ بمشکل بستر سے نکلی تو اس کا خوف و دہشت سے برا حال ہو رہا تھا۔ اس کا دل حلق میں دھڑک رہا تھا۔ وہ اس سے تحکمانہ لہجے میں بولا۔ ''فوراً کمرے سے نکلو۔'' اس نے بستر سے نکل کر لباس اور ساڑھی کا پہلو درست کیا تو اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ دروازے کی طرف بڑھی تو اس سے چلا نہیں جا رہا تھا۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی نے اس کے پیروں کی ساری طاقت سلب کر لی ہو۔

☆.......☆.......☆

ڈاکو سپنا کو اپنے ہمراہ لے کر شکنتلا دیوی کے کمرے میں پہنچا تو اس نے دیکھا کہ وہاں پہلے سے دو مسلح ڈاکو موجود ہیں۔ ان کے چہرے بھی ڈھاٹوں میں چھپے ہوئے تھے۔ صرف سرخ آنکھیں دکھائی دے رہی تھیں۔ ایک ڈاکو کے ہاتھ میں خوفناک قسم کا ریوالور تھا۔ دوسرے ڈاکو کے ہاتھ میں ایک تیز دھار والا چھرا تھا جو اس ریوالور سے بھی کہیں خوفناک لگ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر سپنا کے سارے بدن میں ایک سرد لہر خنجر کی طرح کاٹتی ہوئی اتر گئی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ یہ لوگ ڈکیتی کے ارادے سے آئے ہیں۔ کہیں انہوں نے مال کے ساتھ اسلحے کے زور پر اسے بھی لوٹ لیا تو وہ کیا کرے گی۔ وہ اسے کسی قیمت پر نہیں بخشیں گے کیونکہ وہ گھر میں موجود عورتوں میں غیر معمولی طور پر پرکشش ہے۔ اس خیال کے آتے ہی اس کی حالت غیر ہونے لگی۔

پلنگ پر جیوتی، ورشا، روپا اور دونوں دربان بے دست و پا پڑے تھے۔ ان کی مشکیں کسی ہوئی تھیں اور ان کی حالت مردوں سے بدتر ہو رہی تھی۔ ان کے منہ میں کپڑے بھی ٹھونس دیئے گئے تھے کہ وہ چیخ و پکار نہ کر سکیں۔ شکنتلا دیوی سنگھار میز کے پاس کھڑی تھر تھر کانپ رہی تھی۔ چہرہ سفید پڑا ہوا تھا۔ سپنا کو جو ڈاکو اس کمرے میں لے کر آیا تھا وہ ان کا سردار لگ رہا تھا۔ اس نے کمرے میں داخل ہوتے ہی سپنا کو حکم دیا تھا کہ وہ الماری کے پاس جا کر خاموشی سے کھڑی ہو جائے۔ سپنا خاموشی سے پلنگ اور الماری کے درمیان کھڑی ہو گئی۔

ڈاکوؤں کے سردار نے شکنتلا دیوی کے سامنے جا کر اپنا ہاتھ پھیلایا۔ ”تجوری کی چابیاں چاہئیں؟“

”چابیاں؟“ شکنتلا دیوی کے حلق میں گولہ سا اٹک گیا۔ ”وہ کس لئے؟“

”اس لئے کہ تم نے جو مال اس میں محفوظ کر رکھا ہے اسے نکال کر لے جانا

ہے۔" اس نے استہزائی انداز سے کہا۔

"نہیں، میں چابیاں نہیں دوں گی۔" شکنتلا دیوی دہشت سے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی۔ "اس میں میری برسوں کی کمائی ہے۔"

"تمہارا کیا خیال ہے تم چابی نہیں دو گی تو ہم یہاں سے چلے جائیں گے؟" وہ ہنسا۔ "اس میں تمہاری کون سی حلال کی کمائی ہے۔ سنو اس کا لہجہ تحکم آمیز ہو گیا۔ اس نے شکنتلا دیوی کے اور قریب ہو کر بندوق کی نال اس کی گردن کے نیچے رکھ دی۔ "ہم یہاں تمہاری ساری کمائی لوٹ کر لے جانے کیلئے آئے ہیں تم سے پریم جتانے کے لیے نہیں، ویسے اس میں کوئی شک نہیں کہ تم آج بھی خاصی پرکشش ہو۔"

"تم..... تم ایسا کرو ان دونوں لڑکیوں کو اپنے ساتھ لے جاؤ۔" شکنتلا دیوی نے سہم کر ورشنا اور روپا کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ حسین لڑکیاں بھی بہت بڑی دولت ہیں۔ یہ میرے لیے سونے کی کان ہیں۔"

"میں نے تمہیں مشورہ دینے کیلئے نہیں بلکہ چابیاں دینے کیلئے کہا ہے۔" وہ بھڑک اٹھا اور اس نے غصے میں آ کر ایک زوردار تھپڑ شکنتلا دیوی کے منہ پر رسید کر دیا۔ اس کا سر سنگھار میز کے آئینے سے بری طرح ٹکرایا۔ اس نے کراہ کر اپنا سر پکڑ لیا اور اس پر لرزہ طاری ہو گیا۔

وہ دھاڑا۔ "جلدی سے چابیاں دو، نہیں تو گولیاں تمہارے حلق کے آر پار کر دوں گا۔"

شکنتلا دیوی لڑکھڑاتی ہوئی الماری کے پاس پہنچی ایک تھپڑ نے اس کا دماغ درست کر دیا تھا۔ الماری کی دراز سے چابیاں نکال کر اس کی طرف بڑھائیں۔ اب اس نے تجوری کا منہ کھولا تو سپنا نے دیکھا تجوری میں نہ صرف بہت سارے نوٹوں کی گڈیاں ہیں بلکہ سونے کے زیورات بھی ہیں۔ چھرے والے ڈاکو نے الماری کے اوپر سے چھوٹا سا اٹیچی کیس اتارا۔ اس میں جتنی نوٹوں کی گڈیاں اور سونے کے زیورات تھے وہ اٹیچی میں بھر لیے۔ شکنتلا کی حالت بڑی غیر ہو رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا وہ غش کھا جائے گی۔ پھر اس بدمعاش نے شکنتلا کی الماری سے دس بارہ بہت ہی قیمتی جوڑے نکال کر انہیں بھی اٹیچی کیس میں ٹھونس لیا۔

"اچھا اب ہم جا رہے ہیں؟" بدمعاشوں کے سردار نے شکنتلا دیوی سے کہا۔ اس نے سپنا کی طرف اشارہ کیا۔ "اس حسن کے مجسمے کو بھی ساتھ لے جا رہے ہیں۔ ویسے تمہاری

خدمت میں ایک بات عرض کرتا ہوں کہ مال و دولت اور اس لڑکی کی بازیابی کیلئے پولیس سے رجوع نہیں کرنا کیونکہ پولیس کے تعاون سے ہم نے واردات کی ہے۔ پولس کا اس میں پچیس فیصد حصہ ہے۔ ہم بڑی دور جا رہے ہیں۔ کوئی ہماری گرد بھی نہیں پا سکتا۔''

''سپنا کو ساتھ مت لے جاؤ' اسے چھوڑ دو' بھلے ان دو لڑکیوں کو لے جاؤ۔'' شکنتلا دیوی ہذیانی انداز سے چیخنے لگی۔

''اس انمول ہیرے کو کیوں نہیں لے جائیں؟'' وہ حیرت آمیز لہجے میں بول کر ہنسا۔

''اس لئے کہ میں اس کا سودا کر چکی ہوں۔ ایڈوانس بھی لے چکی ہوں۔ وہ کل اسے لینے آنے والا ہے۔'' شکنتلا دیوی گڑگڑا کے بولی۔

''تم سپنا کے بدلے میں ان دونوں لڑکیوں کو اس کے ہمراہ بھیج دینا جو بقول تمہارے سونے کی کان ہیں۔'' اس نے تضحیک آمیز انداز سے مشورہ دیا۔

''نہیں' نہیں میں کسی قیمت پر تم لوگوں کو سپنا کو لے جانے نہیں دوں گی۔'' شکنتلا دیوی نے ایک لپک کر سپنا کا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے اپنی پوری طاقت سے اپنی طرف کھینچ کر باہر لے جانے کی کوشش کی تو پستول والے ڈاکو نے تیزی سے آگے بڑھ کر سپنا کا ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھڑا دیا۔ وہ بلک کر بولی۔ ''میں نے اس کی بہت بڑی قیمت ادا کی ہے۔''

''تم اچھی طرح سے کان کھول کر سن لو ہم سپنا کو کسی قیمت پر چھوڑ کر نہیں جائیں گے اس لئے کہ سپنا ہمارا سپنا ہے۔ یہ چاند' ہیرا' نگینہ تمہارے مال و دولت کے مقابلے میں کہیں قیمتی ہے۔ دیوی جی ایمانداری کی بات یہ ہے کہ ہم نے اس کے حسن و جمال کی تعریف سنی تو سوچا کہ نیک کام میں دیر نہیں کرنا چاہیے۔ اس لئے ہم نے فوری طور پر منصوبہ بنایا اور چلے آئے۔ یہاں آ کر ہم نے ایک تیر سے دو شکار کئے۔ ہمارا نصیب دیکھئے دونوں شکار تگڑے ہاتھ لگے۔''

''سور' پاجی' کمینے۔'' شکنتلا دیوی ایک دم سے بھڑک اٹھی۔ اس کی آنکھیں شعلے برسانے لگیں۔ وہ نفرت اور غصے سے پھٹ پڑی۔ ''تم شاید مجھے نہیں جانتے کہ میں کون ہوں۔ میں شکنتلا دیوی ہوں میں تم سب کو پھانسی کے تختے پر چڑھا دوں گی۔ اس شہر کی پولیس اور بڑے بڑے بدمعاش میری مٹھی میں ہیں۔ میں سپنا اور سارا مال ایک گھنٹے میں برآمد کرا لوں گی۔''

''شکنتلا دیوی ہماری نرمی اور شرافت سے فائدہ اٹھا رہی ہے۔'' اس نے چھرے والے ڈاکو کو اشارہ کیا۔ ''ذرا اس کی چونچ تو بند کر دو۔''

چھرے والے ڈاکو نے شکنتلا دیوی کی الماری کھول کر اس میں سے ایک سفید سوتی ساڑھی نکال کر سردار کی طرف پھینک دی۔ اس نے اپنی بندوق ریوالور والے بدمعاش کے ہاتھ میں تھما دی پھر اس نے شکنتلا دیوی کے دونوں ہاتھ پیچھے لے جا کر ساڑھی کے پلو سے باندھ دیئے۔ دوسرے پلو کو اس کے منہ پر کس دیا۔ پھر اسے پلنگ پر بٹھا دیا۔

ریوالور والے ڈاکو نے بندوق سردار کے حوالے کرنے کے بعد اٹیچی اٹھا لی پھر چھرے والے ڈاکو نے سپنا سے بڑی نرمی اور شائستگی سے چلنے کیلئے کہا تو اس نے حکم کی تعمیل کی۔ سپنا نے دیکھ اور محسوس کر لیا تھا کہ انکار اور ضد سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ وہ ان سے مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔ وہ تعداد میں تین تھے اور مسلح بھی تھے۔ چھرا دیکھ کر تو اس کی جان نکلی جا رہی تھی۔ وہ بڑی خاموشی اور قربانی کے جانور کی طرح ان کے ساتھ چلنے لگی۔ وہ ان کے ہمراہ نشست گاہ میں آئی تو اس نے دیکھا مسلح چوکیدار کی مشکیں کسی ہوئی تھیں اور وہ بیہوش پڑا تھا۔ جیسے اس کے سر پر ضرب لگا کر اسے بیہوش کر دیا گیا ہو۔ اس کی بندوق بھی فرش پر اس کے پاس ہی پڑی تھی۔ سردار نے اس کی بندوق اٹھا لی۔ پھر اس نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ وہ برآمدہ میں آئی تو دیکھا کہ گیٹ کھلا ہوا ہے اور ایک گاڑی باہر کھڑی ہوئی ہے۔

سردار نے اپنی جیب سے چابیاں نکال کر ڈگی کھولی تو ریوالور والے ڈاکو نے جلدی سے اس میں اٹیچی رکھ دی۔ سردار نے دونوں بندوقیں بھی اس کے ساتھ ہی رکھ دیں اور ڈگی بند کر دی اور سٹیئرنگ پر جا بیٹھا۔ ریوالور والا بدمعاش اگلی نشست پر جا بیٹھا۔ پچھلی نشست پر چھرے والا بدمعاش سپنا کو لے کر بیٹھ گیا اور چھرے کی نوک اس نے سپنا کی پسلی پر رکھ دی تو وہ خوف اور دہشت سے کانپنے لگی۔

چھرے والے ڈاکو نے اس سے بڑی نرمی سے کہا۔

''شریمتی جی! آپ خاموشی اور شرافت سے بیٹھی رہیں۔ پولیس یا پولیس کی گاڑی کو دیکھ کر شور مچایا تو یہ چھرا آپ کے کومل جسم میں اتر جائے گا۔ پولیس نے ہمیں گرفتار کر لیا تو ہمارا کچھ نہیں بگڑے گا۔ ہم اسے لوٹے ہوئے مال میں سے نصف حصہ دے کر اپنے آپ کو بچا لیں گے لیکن آپ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھیں گی۔ پھر ہمیں آپ کی سر کٹی لاش کو گنگا

میں پھینک کر اسے نجس کرنا پڑے گا۔" اس کا لہجہ ایک دم سے سفاک ہو گیا تھا۔ اس نے چھرے کی نوک سپنا کے جسم سے ہٹا لی۔

سردار نے گاڑی کا انجن سٹارٹ کرتے ہوئے عقبی آئینے میں پچھلی نشست کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ "شنکر! کیا بجا ہے؟"

اس نے اپنی دستی گھڑی میں وقت دیکھتے ہوئے کہا۔ "تین بج کر بائیس منٹ ہو رہے ہیں۔"

سردار گاڑی کا گیئر بدلتے ہوئے سرشاری سے بولا۔ "گویا بائیس منٹ میں ہم نے آپریشن مکمل کیا ہے۔"

"یس سر!" شنکر نے اس انداز سے کہا کہ وہ تینوں ہنس پڑے۔

سپنا کو اس ایک ہفتے کے اندر ایک لمحے کیلئے کوٹھی سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں ملی تھی۔ اسے برآمدے اور لان تک جانے نہیں دیا گیا تھا۔ اس کی حالت ایک قیدی کی سی رہی تھی لیکن اسے اے کلاس کے قیدیوں کی طرح گھر کے اندر سہولتیں حاصل تھیں۔ اس وقت وہ کھلی فضا میں سانس لے رہی تھی اور اس شہر کو دیکھ رہی تھی جو سنسان اور ویران پڑا ہوا تھا۔ رات کی تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ کہیں کسی سڑک کے چوراہے پر روشنی ہو رہی تھی۔ بتیوں کے سائے میں پیلاہٹ چھائی ہوئی تھی۔ اس کا دماغ ماؤف ہو رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ آج کی رات اس کیلئے بڑی ہولناک تھی۔ قیامت کی طرح' اسے ہر چیز پینڈولم کی طرح جھولتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ وحشت ناک خیالات کے زہریلے ناگ پھنکار رہے تھے۔ وہ سوچ رہی تھی کہ ان شیطانوں سے وہ کیسے نمٹ سکے گی۔ انہوں نے اسے اس کے حسن و جمال کا تذکرہ سن کر اغوا کیا تھا۔ ان کے ارادے کیا تھے یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہ تھی۔ اس نے سوچا کہ ان درندوں کے ہاتھوں سے بچنے کی ایک ہی صورت ہے وہ خودکشی کر کے اپنی عزت و آبرو کو بچا سکتی تھی۔

راستے میں ایک دو پولیس کی گشتی گاڑیاں سپنا کو نظر آئی تھیں۔ ان گاڑیوں نے اس کی گاڑی کو روکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس نے سوچا تھا کہ ان کے روکنے سے کیا ہوتا۔ بالفرض محال پولیس اس کی گاڑی کو روک لیتی۔ ان تینوں ڈاکوؤں کو گرفتار کر کے تھانے لے جاتی۔ اس سے کیا ہوتا۔ یہ اس کے حق میں اور برا ہوتا۔ اس سے پوچھ گچھ کی جاتی۔ پولیس اس کے بیان پر اعتبار نہیں کرتی۔ اسے حوالات میں غیر قانونی طور پر ہندوستان میں داخل

ہونے کے الزام میں بند کر دیا جاتا۔ صرف اس پر اکتفا نہیں کیا جاتا۔ پولیس کے بارے میں اخبارات میں پڑھ کر وہ ان سے متنفر ہو چکی تھی۔ اسے اب ان پر بھروسہ نہیں رہا تھا۔ پولیس اور ان درندوں میں ذرہ برابر بھی فرق نہیں تھا۔

ایک گھنٹے کی مسافت طے کرنے کے بعد گاڑی ایک ایسے مکان کے سامنے جا کر رکی جو ایک ویرانے میں تھا۔ ریوالور والے ڈاکو نے دروازے پر وقفے وقفے سے تین مرتبہ دستک دی۔ تھوڑی دیر کے بعد دروازہ کھلا۔ دروازے پر ایک ادھیڑ عمر کی عورت آنکھیں ملتی ہوئی کھڑی تھی۔ انہیں دیکھ کر اس کا چہرہ دمک اٹھا۔ اس نے مسرت آمیز لہجے میں پوچھا۔

''خیریت رہی؟''

''ہاں۔'' سردار نے اپنا سر ہلایا۔ ''سب خیریت رہی۔ ہم صرف دولت ہی نہیں اس چاند کو بھی لے آئے ہیں۔''

عورت دروازے سے نکل کر سپنا کے پاس آئی۔ اس نے ملگجے اندھیرے میں سپنا کو دیکھا۔ وہ سپنا کو دیکھتی رہ گئی۔ اس کا چہرہ چاند کی طرح دمک رہا تھا۔ وہ اسے نکھری نکھری سی لگ رہی تھی۔ وہ حیرت آمیز مسرت سے جیسے چیخ پڑی۔ ''بڑی سندر ہے۔''

''تم اس کی سندرتا اندر جا کر دیکھنا۔'' سردار مسکرا کر بولا۔ ''پورے کلکتہ میں شاید ہی ایسا کوئی چاند کا ٹکڑا ہو۔''

''آؤ بیٹی! اندر چلو۔'' اس عورت نے بڑی اپنائیت سے اس کی بانہہ پکڑ لی۔ سپنا کو اس کے لہجے میں بڑی محبت اور ایک عجیب سی مٹھاس کا احساس ہوا۔ اس کا دل بھر آیا۔ اس نے سوچا کہیں اس عورت نے بھی تو شکنتلا جیسا بہروپ نہیں بنا رکھا ہے؟

وہ عورت اسے اس طرح سے گھر کے اندر لے کر داخل ہوئی جیسے سپنا برسوں کے بعد سسرال سے میکے آئی ہو۔ سپنا نے دیکھا یہ تین چار کمروں کا گھر تھا۔ نشست گاہ میں ایک صوفہ سیٹ' تین چار کرسیاں اور بڑی سی تپائی تھی۔ ایک کونے میں کھانے کی میز تھی۔ اس کے گرد چھ کرسیاں تھیں۔ عورت نے اسے روشنی میں دیکھا اور بولی۔ ''میں نے اپنی زندگی میں تم جیسی حسین لڑکی شاذ و نادر ہی دیکھی ہو۔''

''مجھ جیسی بدنصیب لڑکی بھی کبھی دیکھی ہے آپ نے؟'' سپنا نے بڑے دکھ اور کرب سے کہا۔

''تمہاری بدنصیبی کے دن اب ختم ہو گئے۔'' عورت نے دلاسا دیتے ہوئے اس کا

ہاتھ پکڑ کر اسے صوفے پر بٹھا دیا۔ ''تم آرام سے بیٹھو میں تمہارے لئے پانی لاتی ہوں۔ تم بہت زیادہ پریشان ہو رہی ہو۔''

اس نے اپنے دل میں عورت کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''مکار عورت! تم مجھے فریب نہ دو اب مجھے عورت ذات پر بھروسہ نہیں رہا ہے۔ میں تم جیسی عورتوں کے اصل چہرے پہچاننے لگی ہوں۔''

عورت نے صحن میں کھلنے والا دروازہ کھولا تو سپنا نے دیکھا باہر بہت بڑا صحن ہے۔ دروازہ کھلتے ہی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے اندر آنے لگے۔ وہ صحن کی طرف دیکھ رہی تھی کہ اس نے آہٹیں سنیں۔ وہ تینوں ڈاکو کمرے کی طرف آ رہے تھے۔ چند لمحوں کے بعد وہ تینوں اندر داخل ہوئے۔ ریوالور والا ڈاکو سب سے آگے تھا اور اس کے ایک ہاتھ میں اٹیچی اور دوسرے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ اس کے پیچھے پیچھے سردار اور چھرے والا ڈاکو تھا۔ چھرے والے ڈاکو نے اپنا چھرا میز پر رکھ دیا۔ سردار نے بھی بندوقیں میز پر رکھ دیں پھر وہ تینوں اپنے اپنے ڈھاٹے کھولنے لگے تو وہ نفرت انگیز تجسس سے انہیں دیکھنے لگی۔

سپنا ریوالور والے ڈاکو کا چہرہ دیکھ کر حیرت آمیز مسرت سے اچھل پڑی۔ اسے جیسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی اور ششدر ہو کر بولی۔ ''جمال صاحب! آپ؟''

''جی' خاکسار۔'' جمال مسکراتا ہوا اس کی طرف بڑھا۔ ''یہ دونوں میرے دوست ہیں۔ یہ جو صاحب ہمارے سردار بنے ہوئے تھے ان کا نام انیل بسواس ہے اور جن کے ہاتھ میں خوفناک قسم کا چھرا تھا وہ شنکر داس ہیں۔'' عورت پانی کا گلاس لئے اندر داخل ہوئی تو وہ ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''آپ شنکر داس کی ماتا جی ہیں بلکہ ہم سب کی ہیں۔ انہی کے مشورے پر ہم نے یہ کارنامہ انجام دیا ہے۔''

''میرا نام شانتی ہے بیٹی!'' عورت نے سپنا کے پاس آ کر پانی کا گلاس بڑھا دیا۔ ''لو پی لو۔ میں تم سب کیلئے چائے بناتی ہوں۔''

وہ تینوں صوفے اور کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ شانتی چائے بنانے چلی گئی۔ سپنا پانی پینے کے بعد بولی۔ ''مجھے یقین نہیں آ رہا ہے۔ یہ سب کسی عجیب وغریب سپنے کی طرح لگ رہا ہے۔ آپ لوگوں نے مجھے اس خبیث عورت کے چنگل سے نجات دلا کر جو احسان کیا ہے میں اسے ساری زندگی بھلا نہ سکوں گی اور نہ شکریہ ادا کرنے کیلئے میرے پاس الفاظ ہیں۔''

''ہم نے اپنا فرض ادا کیا ہے۔'' شنکر داس نے کہا۔ ''اس میں احسان اور شکریے کی کوئی بات نہیں۔''

''انہیں جہاں فرض ادا کرنا ہے یہ وہاں اپنا فرض ادا نہیں کرتے ہیں۔'' جمال نے مسکراتے ہوئے ان دونوں کی طرف دیکھا۔ ''اس لئے کہ یہ دونوں پولیس میں ملازمت کرتے ہیں۔ اگر یہ فرض شناس بن گئے تو انہیں پولیس افسر کون کہے گا۔''

سپنا کا چہرہ ایک لمحے کیلئے متغیر ہو گیا۔ اس کے دل میں خوف دامن گیر ہوا کہ کہیں وہ اس کیلئے پریشانی کا سبب نہ بنیں۔ اس نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے پوچھا۔ ''آپ لوگوں نے میری مدد کس لئے کی؟''

''اس لئے کہ آپ بہت حسین بلکہ حسن کا انمول شاہکار ہیں۔'' جمال نے شوخی سے کہا۔ ''آپ کیلئے تو جان بھی دی جا سکتی ہے۔''

سپنا سرخ ہو گئی۔ شنکر داس زیر لب مسکرا دیا اور کہنے لگا۔ ''اصل بات یہ ہے کہ شریمتی جی! مجھے اطلاع ملی تھی کہ ایک عورت جس کا نام نوری بیگم ہے وہ ایک حسین و جمیل لڑکی کو اغوا کر کے بیہوشی کی حالت میں شکنتلا دیوی کے ہاتھوں پندرہ ہزار روپے میں فروخت کر گئی ہے اور شکنتلا دیوی اس کا نیلام کرنے والی ہے۔ آپ کو شکنتلا دیوی کے چنگل سے قانونی طور پر نجات دلانا ممکن نہیں تھا۔ اس لئے کہ اسے اعلیٰ سرکاری اور پولیس کے افسران کی سرپرستی حاصل ہے۔ پھر ہم نے ایک منصوبہ بنایا۔ اس منصوبے کے تحت ہم آپ کو یہاں سے بڑی خوبصورتی سے نکال لائے۔ ہمیں ڈکیتی کی واردات کرنا پڑی اس جیسی خبیث اور خطرناک عورت پورے کلکتہ میں کوئی نہیں۔ وہ میٹھی چھری ہے۔''

''رقم گن کر تو دیکھو کتنی ہے۔'' انیل بسواس بولا۔

''میں چاہتا ہوں کہ رقم اور زیورات کو آپس میں مساوی تقسیم کر لیا جائے۔''

''مجھے اللہ نے اتنا دیا ہے کہ کسی چیز کی کمی نہیں ہے۔'' جمال نے کہا۔ ''میرے پچیس ہزار مجھے دے دو اور اسے تم دونوں آپس میں بانٹ لو۔ میرا حصہ دینا ہی چاہتے ہو تو ماتا جی کو دیدو۔ میں مس سپنا کو اپنے ساتھ بنگلہ دیش لے جا رہا ہوں تاکہ انہیں ان کے گھر بخیر و خوبی پہنچا دوں۔''

''میرا کوئی گھر نہیں ہے۔'' سپنا بڑے کرب اور دکھ سے بولی تو اس کی آواز بھرا گئی۔

جمال اور ان دونوں نے چونک کر حیرت سے سپنا کی شکل دیکھی۔ جمال نے تعجب سے پوچھا۔ ''یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟ یہ کیسے ہوسکتا ہے؟''

''اس دنیا میں کیا کچھ نہیں ہوسکتا جمال صاحب!'' اس نے دل گرفتہ لہجے میں جواب دیا۔ ایک لمبی گہری سانس لی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے۔ ''میرا گھر تھا مگر اسے درندوں نے اجاڑ دیا۔ میری ماں کا کچھ پتا نہیں کہ وہ زندہ ہے یا مرگئی ہے۔ شاید اسے قتل کردیا گیا۔''

شانتی چائے لے آئی۔ سپنا نے انہیں بے کم و کاست اپنی دردناک کہانی سنائی۔ جب وہ کہانی سنا چکی تو جمال نے اسے تسلی دی۔ ''فکر کی کوئی بات نہیں، میں بنگلہ دیش میں رہتا ہوں۔ یہاں سیر و تفریح کیلئے آیا تھا۔ آپ میرے گھر میں رہ سکتی ہیں۔ وہاں میری ماں، بھائی اور بہنیں بھی ہیں۔ خدمت کیلئے نوکر چاکروں کی کوئی کمی نہیں ہے۔ آپ میرے ہاں بڑے سکون و آرام سے رہیں گی اور پھر میں آپ کی والدہ کی تلاش میں نہ صرف آپ کی ہر طرح سے مدد کروں گا بلکہ اس کیلئے انسپکٹر رشید چودھری کی خدمات بھی حاصل کروں گا' جو میرے بچپن کا دوست اور ہم جماعت بھی رہ چکا ہے۔ وہ نہ صرف ذہین اور باصلاحیت ہے بلکہ نیک دیانت دار اور فرض شناس ہے۔ مجرم اس کے نام سے خوف کھاتے ہیں۔ اس نے بڑے بڑے خطرناک مجرموں کو کیفر کردار تک پہنچایا ہے۔ اس کے علاوہ میرے ایک انکل ہیں جو میرے والد کے گہرے دوستوں میں سے ہیں۔ اگر ان سے ملاقات ہوگئی تو آپ کی مشکل اور آسان ہوجائے گی۔''

''آپ نے کبھی ان دس شیطانوں کے بارے میں سنا ہے جو انسان نہیں خون آشام بھیڑیے ہیں؟''

''مجھے انکل نے ان کے بارے میں بتایا تھا کہ وہ اس ملک کے سیاہ سفید کے مالک ہیں اور قانون اور انسانیت کو بیس اکیس برس سے پائمال کررہے ہیں۔ اگر یہ سلسلہ کچھ برس اور جاری رہا تو پھر وہ اپنے ملک کو بیچ کھائیں گے۔''

''کیا آپ کا دوست پولیس انسپکٹر رشید چودھری ان شیطانوں سے ٹکر لے سکے گا؟'' سپنا نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''کیوں نہیں۔'' جمال نے جواب۔ ''پولیس کا اور کام ہی کیا ہوتا ہے؟''

''یہ کام ایک پولیس انسپکٹر کے بس کی بات نہیں ہے۔'' سپنا کہنے لگی۔ ''اس لئے

کہ صرف پولیس ہی نہیں اعلیٰ سرکاری حکام بھی ان کے سامنے کٹھ پتلی بنے ہوئے ہیں۔ وہ دشمن کو قتل کر کے زندہ جلا دیتے ہیں تا کہ ان کا نام ونشان نہ مل سکے۔ میں آپ کے ساتھ ضرور چلوں گی تا کہ نہ صرف ماں کو تلاش کرسکوں بلکہ ان سے انتقام لے سکوں۔ یہ شیطان میرے باپ کے قاتل بھی ہیں۔ اگر انسپکٹر نے میرا ساتھ دیا تو میں ان سے ٹکر لوں گی۔ ایک ایک شیطان کو نیست و نابود کر دوں گی۔''

''اتنے بڑے دشمن سے ٹکر لینا اتنا آسان نہیں ہے جیسا آپ سوچ رہی ہیں۔'' شنکر داس نے کہا۔ ''ہم نے بھی ان کے بارے میں بہت کچھ سنا ہے۔ میرا مشورہ تو یہ ہے کہ آپ قدم قدم پر جمال اور انسپکٹر کی رہنمائی ضرور حاصل کریں۔ ان سے تنہا مقابلہ کرنا آپ کے بس کی بات نہیں ہے۔''

''میں نے اپنی ماں سے بدلہ لینے کا وعدہ کیا اور انتقام کو ایک مقدس فریضہ سمجھ کر قبول کیا ہے۔'' سپنا کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ ''اب تو میں انتقام کے اندھے جنون میں مبتلا ہو گئی ہوں۔ اب مجھے دہرا انتقام لینا ہے۔''

''دو دن آرام کرنے کے بعد ہم بنگلہ دیش روانہ ہو جائیں گے۔'' جمال نے کہا۔

''میں چاہتا ہوں کہ آپ کا ہندوستانی پاسپورٹ بنا لیا جائے۔ آپ ہوائی جہاز سے ڈھاکہ پہنچ کر سنار گاؤں شیرٹن ہوٹل میں ٹھہریں۔ میرا انتظار کریں۔''

''آپ میرے ساتھ کیوں نہیں چلتے ہیں؟'' سپنا نے خوف زدہ لہجے میں پوچھا۔ ''کہیں ایسا نہ ہو کہ دشمن وہاں میری تلاش میں ہو۔ میں دشمن کو جانتی ہوں وہ کسی شکاری کی طرح جال پھیلائے وقت کا انتظار کر رہا ہو گا۔''

''میں غیر قانونی طور پر سیر و تفریح کیلئے آیا ہوا ہوں۔'' جمال نے جواب دیا۔ ''میرا پاسپورٹ گھر پر رکھا ہوا ہے۔ میں اکثر پاسپورٹ اور ویزا کے بغیر آتا ہوں۔ اتنے جھنجھٹ میں نہیں پڑتا ہوں۔ اگر آپ کو ہوائی جہاز سے جانے میں کوئی خطرہ ہو تو آپ میرے ساتھ چلیں لیکن آپ کو لمبی مسافت پیدل طے کرنا ہو گی۔ ہم دونوں ملکوں کی سرحد غیر قانونی طور پر عبور کریں گے۔ اس میں گرفتاری کا خطرہ ہے مگر اس کی کوئی پرواہ نہیں۔ میں روپے کی طاقت سے بچا لوں گا۔''

''میں ہندوستانی پاسپورٹ سے نہیں جا سکتی ہوں اور نہ ہی یہاں ٹھہر سکتی ہوں۔'' سپنا نے اپنا خدشہ ظاہر کیا۔

''کیوں نہیں جا سکتی ہیں؟'' انیل بسواس بولا۔ ''دو تین سو روپے خرچ کرنے سے اصلی پاسپورٹ بن جاتا ہے۔ آپ بلا خوف وخطر یہاں جتنے دن چاہیں ٹھہر سکتی ہیں۔''

''اس لئے کہ شکنتلا دیوی نے میری کوئی دس بارہ تصویریں اپنے کیمرے میں کھینچی تھیں۔'' سپنا بولی۔ ''وہ کل ان تصویروں کو پولیس افسران کو دے دے گی تا کہ مجھے برآمد کیا جا سکے۔ ایسی صورت میں میرا پاسپورٹ بنانا اور ہوائی جہاز سے جانا کیا خطرے سے خالی نہیں ہے؟''

''ہے تو......'' شنکر داس نے اپنا سر ہلایا۔

''میں آپ کے ساتھ چلوں گی چاہے ایک ہفتہ پیدل ہی چلنا کیوں نہ پڑے۔'' سپنا بڑے حوصلے سے بولی۔

سپنا صبح سات بجے جمال کے ہمراہ سیالدہ ریلوے سٹیشن بن گاؤں جانے کیلئے پہنچی تو اس کا دل بہت تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ وہ بوڑھی عورت کے روپ میں تھی۔ اس نے آئینے میں اپنے آپ کو دیکھا تو وہ ششدر رہ گئی تھی۔ وہ خود اپنے آپ کو پہچان نہیں پا رہی تھی۔ شنکر داس کے دوست ایشور لال نے سپنا کا یہ میک اپ بھرا تھا۔ وہ ایک فلم پروڈکشن میں میک اپ مین تھا۔ شنکر داس اسے رات تین بجے فلم سٹوڈیو سے لے آیا تھا اور پورے دو گھنٹے تک عرق ریزی کی تھی۔ پھر بھی وہ بے حد خوف زدہ اور پریشان ہو رہی تھی جبکہ شنکر داس نے بہت دلاسا دیا اور بہت دیر تک سمجھاتا ہی رہا تھا کہ اس پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔ وہ پھر بھی اس لئے دہشت زدہ سی ہو رہی تھی کہ انیل بسواس نے اسے بتایا تھا کہ شکنتلا دیوی نے پولیس افسران کو اس کی تصویریں دکھاتے ہوئے کہا تھا کہ اس نے یہ لڑکی ان کی تفریح طبع کیلئے بنگلہ دیش کی عورت سے خریدی تھی۔ ڈکیتی کی واردات کرنے والے اس لڑکی کو بھی لے گئے ہیں۔ پولیس افسران نے اس کی تصویریں دیکھیں تو ان کی رال ٹپک پڑی تھی۔ اس لئے پورے شہر کی پولیس حرکت میں آ گئی تھی اور اسے بڑی سرگرمی سے تلاش کیا جا رہا تھا۔

سپنا نے ریلوے سٹیشن کی عمارت کے باہر اور اندر کچھ سپاہیوں کو دیکھا جو ریلوے سٹیشن کے اندر جانے والی لڑکیوں کو گھور گھور کر دیکھ رہے تھے۔ جو حسین و جوان لڑکی ٹیکسی یا رکشہ سے اترتی تو وہ مشکوک نظروں سے دیکھنے لگتے۔ اس نے دو ایک سپاہیوں کو دیکھا وہ اپنی جیب سے تصویر نکال کر ایک نظر دیکھتے پھر اسے واپس اپنی جیب میں رکھ کر عورتوں کو تکنے

لگتے۔

جمال بھی یہ سب کچھ بڑی دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ وہ ایک سپاہی کے پاس جا کر کھڑا ہوا تو سپنا کے دل کی دھڑکن بگڑنے لگی۔ اس نے غیر محسوس انداز سے سپنا کے کہنی ماری' جمال نے اس کی طرف دیکھا تو وہ پھنسی پھنسی آواز سے بولی۔ ''کہیں گاڑی نہ نکل جائے۔''

جمال مسکرا کر پولیس کے سپاہی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس نے پوچھا۔ ''کیا آپ کو کسی کی تلاش ہے؟''

''ہاں!'' اس نے سر ہلایا۔ ''ایک حسین اور نوجوان لڑکی اور ان تین بدمعاشوں کی جو اس لڑکی کو اغوا کر کے لے گئے ہیں۔''

''مگر اخبار میں تو ایسی کوئی خبر نہیں چھپی ہے کہ کسی حسین و جمیل لڑکی کو تین بدمعاشوں نے اغوا کر لیا ہے۔'' جمال بولا۔

''بہت سی خبریں ایسی ہوتی ہیں جو کبھی نہیں چھپتی ہیں۔'' سپاہی نے منہ بنایا۔ ''شکنتلا دیوی کا تم نے نام سنا ہے؟ کوئی دو تین دن پہلے اس کے ہاں ڈکیتی کی واردات ہوئی جس میں سات لاکھ کی رقم اور دو لاکھ روپے کے سونے کے زیورات کے علاوہ ڈکیت ایک لڑکی کو بھی لے گئے۔''

''کہیں آپ کو اس لڑکی کی تلاش تو نہیں ہے؟'' جمال نے شرارت کے انداز میں سپنا کی طرف اشارہ کیا تو اس کی پیشانی عرق آلود ہو گئی۔

''جاؤ' اپنا کام کرو۔'' سپاہی بگڑ گیا۔ وہ سپنا پر ایک نظر ڈال کر بولا۔ ''تمہیں ماتا جی سے مذاق کرتے ہوئے شرم نہیں آتی۔''

سپنا' جمال کو پیچھے چھوڑ کر آگے بڑھ گئی۔ جمال لپک کر اس کے پاس پہنچا تو سپنا نروس ہو رہی تھی۔ وہ اسے دیکھ کر اپنی پیشانی سے پسینہ پونچھنے لگی۔ پھر بولی۔ ''میری جان ہی تو نکل گئی تھی۔ خدا کیلئے ایسا سنگین مذاق تو نہ کریں۔''

''میں مذاق نہیں کر رہا تھا بلکہ آپ کو یہ بتا رہا تھا کہ اس روپ میں آپ کی امی بھی آپ کو پہچان نہیں سکتی ہیں۔''

جمال نے کہا۔ ''لہٰذا آپ کو خوف زدہ اور پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ آپ پورے اعتماد اور ہمت کے ساتھ چلیں۔''

جس وقت جمال ٹکٹ گھر کے سامنے ٹکٹ لے رہا تھا تب معاً اس کی نظر ریلوے سٹیشن کی عمارت کے باہر پڑی تو اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ اس نے شکنتلا دیوی' ورشنا اور جیونتی کو گاڑی سے اترتے دیکھا۔ اس کے سارے بدن پر جیسے چیونٹیاں رینگنے لگیں۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کرے۔ وہ جانتی تھی کہ اسے ان چاروں میں سے کوئی بھی پہچان نہیں سکے گا۔ اس نے سوچا کہ وہ لپک کر جمال کو خبردار کر دے۔ وہ ابھی کوئی فیصلہ نہیں کر پائی تھی کہ اس نے ان چاروں کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا۔ وہ چاروں طرف کسی شکار کی طرح نظریں دوڑاتی ہوئی تیز تیز قدم اٹھا رہی تھیں۔ وہ چاروں اس کے سامنے آ کر رک گئیں تو اسے لگا کہ وہ غش کھا جائے گی۔ شکنتلا دیوی نے اسے پرخیال نظروں سے دیکھا اور اپنے پرس کی زپ کھولنے لگی تو وہ ذرا سی دیر کیلئے سانس لینا بھول گئی۔ اسے لگا شکنتلا دیوی اپنے پرس سے پستول نکال رہی ہے۔ اس نے اپنے پرس سے سپنا کی تصویر نکال کر نظروں کے سامنے کر دی۔

''آپ نے اس لڑکی کو تو نہیں دیکھا؟'' شکنتلا دیوی نے بڑی شائستگی سے پوچھا۔

''نہیں۔'' اس نے اپنی آواز بدل کر کہا۔ اس کے پیروں تلے زمین نکلی جا رہی تھی۔

شکنتلا دیوی کے چہرے پر مایوسی کی لہر دوڑ گئی۔ اس وقت ایک ادھیڑ عمر کی عورت سپنا کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ اس نے کہا۔ ''کتنی ساری لڑکیاں اور عورتیں یہاں سے گزر رہی ہیں ایسے میں کسی ایک لڑکی کا چہرہ ذہن میں رکھنا بہت مشکل ہوتا ہے۔''

شکنتلا دیوی نے اس عورت کو سپنا ہی تصویر دکھاتے ہوئے کہا۔ ''میں جس لڑکی کو تلاش کر رہی ہوں وہ بہت حسین ہے۔ اسے کوئی ایک بار بھی دیکھ لے تو وہ بھلا نہیں سکتا۔''

اس عورت نے تجسس سے شکنتلا دیوی کے ہاتھ سے تصویر لے لی اور اسے چند لمحوں تک ناقدانہ نظروں سے دیکھتی رہی پھر وہ تصویر اسے واپس کرتی ہوئی تعریفی لہجے میں بولی۔ ''واقعی لڑکی بہت سندر ہے۔ اسے ہزاروں میں آسانی سے پہچانا جا سکتا ہے۔ پر یہ لڑکی ہے کون؟''

''یہ لڑکی میری بھتیجی ہے۔'' شکنتلا دیوی نے تصویر پرس میں رکھتے ہوئے جواب دیا۔ ''اسے دو دن پہلے تین ڈاکوؤں نے رات کے وقت اغوا کر لیا تھا۔ نصف گھنٹے پہلے کسی نے مجھے ٹیلی فون پر اطلاع دی کہ وہ تینوں ڈاکو اس لڑکی کو لے کر بنگلہ دیش فرار ہو رہے ہیں

اور بن گاؤں جانے کیلئے سیالدہ ریلوے سٹیشن پہنچ رہے ہیں اس لئے ہم اس لڑکی اور ڈاکوؤں کو تلاش کر رہی ہیں۔"

"یہ کیسے ممکن ہے۔" عورت نے کہا۔ "کیا لڑکی شور مچا کر ہنگامہ نہیں کھڑا کر دے گی۔؟ کسی نے آپ کو جھوٹی اطلاع دی ہے یا پھر ان ڈکوؤں نے آپ کے ساتھ مذاق کیا ہوگا؟"

"آج کل ایسے انجکشن آتے ہیں جس کے لگانے سے آدمی کی یادداشت دو تین دنوں کیلئے چلی جاتی ہے۔" شکنتلا دیوی نے کہا۔ "اسے بھی ایسا ہی انجکشن لگایا گیا ہوگا؟ آج کل ایسے کیس بہت ہو رہے ہیں۔"

"آپ نے اس کے اغوا کی رپورٹ پولیس والوں کو نہیں دی؟ یہ کام تو ان کا ہے۔"

"میں نے فوراً ہی رپورٹ درج کرا دی تھی۔ پولیس کا کہنا ہے کہ وہ لڑکی اور ڈاکو کلکتہ شہر ہی میں ہیں۔ چاروں طرف ناکہ بندی کی ہوئی ہے۔ وہ یہاں سے نکل کر جا نہیں سکتے ہیں مگر مجھے پولیس پر بھروسہ نہیں رہا ہے۔ بس وہ باتیں بناتی ہے اور جھوٹی تسلیاں دیتی رہتی ہے۔ وہ ابھی تک لڑکی کو برآمد نہیں کر سکے ہیں۔"

"کہیں ایسا تو نہیں کہ ان ڈاکوؤں نے سپنا کو کسی اور کے ہاتھ بیچ دیا ہو؟" ورشا نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

"اسے کس کے ہاتھ بیچا ہوگا؟"

"شلپا بسواس، چترا سنہا، رابن گھوش یا نیلم بائی میں سے کسی کے ہاتھ بیچ سکتے ہیں۔" ورشا نے جواب دیا۔ "ان میں سے یقیناً کسی نے سپنا کو خرید لیا ہوگا۔"

"ورشا ٹھیک کہہ رہی ہے مالکن!" جینتی نے کہا۔ "ہمیں کسی پولیس افسر کو ساتھ لے کر ان اڈوں پر جا کر دیکھنا ہوگا۔"

شکنتلا دیوی کی سمجھ میں آ گیا۔ وہ بولی۔ "چلو، ہم پولیس کمشنر کے پاس چلتے ہیں۔"

وہ چاروں باہر کی جانب بڑھ گئیں تو سپنا نے ایک گہرا سانس لیا۔ اس کا دل بہت تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے سینہ شق کر کے نکل آئے گا۔ اس کا سارا جسم پسینے میں بھیگ گیا تھا۔ وہ ساڑھی کے پلو سے چہرے سے پسینہ پونچھنے لگی۔ اس عورت

نے اس کے قریب ہو کر سرگوشی کے انداز میں کہا۔ ''اصل میں کوئی اور چکر ہے ایسا لگتا ہے کہ لڑکی گھر سے اپنے آشنا کے ساتھ فرار ہو گئی ہے۔ یہ آج کل کی حسین لڑکیوں کو معلوم نہیں کیا ہوتا جا رہا ہے۔ وہ اونچے خواب دیکھنے لگی ہیں۔ سارا قصور ہماری فلموں کا ہے۔

سپنا نے عورت کی بات کا جواب نہیں دیا۔ وہ ٹکٹ گھر کی طرف دیکھنے لگی۔ جمال مسکراتا ہوا اس کی طرف آ رہا تھا۔ وہ تیزی سے اس کی طرف بڑھ گئی۔ جمال کے پاس پہنچی تو اس نے پوچھا۔ ''شکنتلا دیوی اینڈ پارٹی تم سے کیا کہہ رہی تھی؟''

سپنا نے اسے مختصر طور پر ساری بات بتائی تو وہ ہنس کر بولا۔ ''اسے ٹیلیفون میں نے کیا تھا۔''

''آپ نے کیا تھا؟'' سپنا ششدر رہ گئی اور پھٹی آنکھوں سے دیکھنے لگی۔ ''وہ کس لئے؟''

''لطف لینے اور یہ دیکھنے کیلئے کہ وہ آپ کو پہچانتی ہے کہ نہیں۔'' جمال نے جواب دیا۔ ''اتفاق دیکھئے کہ گاڑی سے اترتے ہی وہ سیدھے پہلے آپ کے پاس آئی۔ اس نے آپ سے آپ ہی کے بارے میں پوچھا۔ کیسا لطیفہ رہا؟''

''آپ کے اس لطیفے نے تو میری جان ہی لے لی تھی۔'' سپنا نے دزدیدہ نظروں سے دیکھا۔

''وہ آپ کے سامنے چھ سات منٹ تک کھڑی آپ ہی کو گھورتی رہی تھیں پھر بھی وہ پہچان نہ سکی تھیں۔ اس میک اپ کا جواب نہیں۔''

''اگر چہ وہ میرے پاس کچھ دیر اور کھڑی رہتیں تو شاید میں بیہوش ہو جاتی۔'' وہ بولی۔ ''میں نے خود پر کیسے قابو پایا یہ میرا دل جانتا ہے۔''

''مس سپنا!'' جمال اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔ ''ایسی جگہوں پر بیہوش ہونا کچھ اچھا نہیں لگتا ہے۔ اپنے آپ کو ذرا سنبھال کر رکھئے۔''

''آپ بھی ذرا احتیاط رہا کریں۔'' وہ برجستہ بولی۔ ''مجھ میں اور آپ میں بڑا فرق ہے۔ میں ایک عورت ہوں اور آپ ایک مرد ہیں۔''

''اگر آپ نے حوصلے سے کام نہیں لیا اور اس طرح ذرا ذرا سی بات پر نروس ہوتی رہیں تو کام کیسے چلے گا۔'' جمال شوخی سے بولا۔ ''آپ کو تو ابھی اپنے ماں باپ کے قاتل سے بدلہ لینا ہے اور دس شیطانوں سے ٹکر بھی لینی ہے۔ جب تک آپ مرد نہیں بنیں

گی کام نہیں چلے گا۔''

''آپ ٹھیک کہتے ہیں۔'' وہ آہستگی سے بولی۔ ''میں کوشش کروں گی ایسے مواقع پر اپنے حوصلے برقرار رکھوں۔''

''میں نے بڑی عجیب وغریب طبیعت پائی ہے۔'' جمال ہنس کے کہنے لگا۔ ''اس لئے میں ایسی دلچسپ اور اوٹ پٹانگ حرکتیں کرتا رہتا ہوں۔ اس لئے بھی غیرقانونی طور پر دونوں ملکوں کی سرحدیں پار کرتا رہتا ہوں۔ بعض اوقات بڑے سنگین خطرات پیش آتے ہیں تو اس کا مردانہ وار مقابلہ کرتا ہوں۔ میں نے آج تک سرحد پار کرانے والے کسی دلال کی مدد سے دونوں ملکوں کی سرحد پار نہیں کی۔ میں کسی خطرے سے گھبرانے یا خوف زدہ ہونے کے بجائے لطف اندوز ہوتا ہوں۔ میرے حوصلے مجھے سرخرو کرتے ہیں۔ میں نے آج تک ناکامی کا منہ نہیں دیکھا اور نہ ہی میں کبھی پولیس کے ہتھے چڑھا ہوں۔''

سپنا نے پلیٹ فارم کے ایک بک سٹال سے ایک فلمی رسالہ خرید لیا تھا۔ اس نے اپنا سارا وقت پڑھنے پر گزارا تھا۔ یہ فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ تھا۔ اس میں زیادہ مسافر نہ تھے۔ اس نے جمال سے بھی کوئی بات نہیں کی تھی۔ ایک اجنبی مسافر کی طرح لاتعلق سی بیٹھی رہی تھی۔ جب وہ پڑھتے پڑھتے اکتا جاتی تو باہر جھانکنے لگتی۔ جمال اس کے سامنے کھڑکی کے پاس بیٹھا تھا۔ اس نے بھی کوئی بات نہیں کی اور اخبار پڑھتا رہا۔

گاڑی بن گاؤں پہنچی تو نو بج رہے تھے۔ دو گھنٹے کی مسافت اسے دو صدیوں کی طرح بھاری لگی تھی۔ اس کے بس میں ہوتا تو وہ اڑ کر بنگلہ دیش پہنچ جاتی۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی عفریت اس کے تعاقب میں ہو۔ وہ جمال کے ساتھ ریلوے سٹیشن کی عمارت سے باہر آئی تو بھکاری مرد، بچوں، عورتوں اور رکشہ والوں نے انہیں اپنے نرغے میں لے لیا۔ جمال نے ان رکشہ والوں کو بری طرح جھڑک دیا جو ''ساب ساب'' کہہ کر اس کے ہاتھ سے دستی بیگ چھیننے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس کی نگاہیں کسی اور کو تلاش کر رہی تھیں۔ چند لمحوں کے بعد ایک رکشہ والا سڑک کے دوسری طرف سے اپنے رکشہ کے پاس کھڑا بیڑی پی رہا تھا۔ اس نے جمال کو دیکھتے ہی فضا میں ہاتھ ہلا دیا اور خوشی سے چلاتا ہوا اس کی طرف لپکا۔

''جمال صاحب...... ! جمال صاحب......!''

جمال، سپنا کو لے کر اس کی طرف تیزی سے بڑھ گیا۔ رکشہ والے نے ان دونوں کو باری باری بڑے مودبانہ انداز سے سلام کیا۔ پھر اس کے ہاتھ سے دستی بیگ لے کر بولا۔

''صاحب جی! آپ اس مرتبہ بہت جلدی واپس جا رہے ہیں۔ کیا ماتا جی بھی ساتھ جا رہی ہیں؟''

''ماتا جی!'' جمال نے سپنا کی طرف دیکھا تو اس کا چہرہ لال ہو گیا۔ وہ کسی اور سمت دیکھنے لگی۔ جمال نے پوچھا۔ ''دینو! موسم کیسا ہے؟''

''موسم کا کچھ نہ پوچھو صاحب!'' دینو نے اپنا سر کھجایا۔ ''کچھ سرد ہے' کچھ گرم ہے' کچھ اچھا ہے' کچھ خراب ہے۔ بس ملا جلا سا ہے۔''

''تم کیا کہتے ہو؟'' جمال نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ''آج ایک دن کسی ہوٹل میں رک جاؤں؟''

''آپ جیون پور سے نکل جائیں۔'' اس نے مشورہ دیا۔ ''راستہ لمبا ہے مگر اس کے سوا چارہ نہیں۔ ایسا موسم تو دس بارہ دن تک رہے گا۔ یہ جب سے بنگلہ دیش اور ہندوستان والوں میں سرحد پر جھڑپیں ہوئی ہیں تب سے موسم خراب ہو گیا ہے۔''

''کوئی بات نہیں ہم جیون پور کے راستے سے نکل جائیں گے۔ میں وہاں سے ایک دو مرتبہ جا بھی چکا ہوں۔''

''مگر صاحب جی! ماتا جی کیسے چلیں گی؟ ان کیلئے تو سفر بڑا دشوار گزار ہو جائے گا۔''

''تمہاری ماتا جی! دیکھنے میں تو بوڑھی ہیں ویسے جوان لڑکیوں سے بھی کہیں جاندار اور سمارٹ ہیں۔''

دینو نے رکشہ میں دستی بیگ رکھ دیا تو وہ دونوں سوار ہو گئے۔ جمال اس کا خیال کرتے ہوئے دائیں طرف بیٹھ گیا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ گھٹنے پر رکھ لئے۔ جتنا سکڑ اور سمٹ سکتا تھا وہ اتنا سمٹ گیا تھا۔ سپنا نے دیکھا تو اسے احساس ہوا کہ وہ تکلیف سے بیٹھا ہے۔ اس نے کہنا چاہا کہ وہ آرام سے بیٹھے مگر کہہ نہ سکی۔ فطری حیا مانع آ گئی تھی۔

☆.....☆.....☆

رکشہ ہچکولے کھاتا ہوا بڑی تیزی سے ٹھنڈی سڑک سے گزر رہا تھا۔ فرحت بخش ہوا چل رہی تھی۔ آسمان ابر آلود تھا۔ سپنا کو درختوں سے گھری ہوئی سڑک بہت اچھی لگ رہی تھی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ سڑک پر چھائی ہوئی ٹھنڈی چھاؤں میں کچھ دیر کے لئے بیٹھ جائے۔ یہاں بڑا سکون تھا مگر یہ وقت موزوں نہیں تھا۔ یہ پرایا شہر تھا۔ یہاں سایہ بھی اپنا دشمن ہوسکتا تھا۔

وہ سوچ رہی تھی کہ کتنی عجیب سی بات ہے کہ وہ اور اس کی ماں جعفر دلال کے ساتھ کلکتہ شہر آنے والی تھیں۔ پرکاش آنند کے ہاں زندگی گزارنے کے لئے مگر حالات نے جس تیزی سے پلٹا کھایا تھا۔ اس نے سب کچھ تہس نہس کردیا تھا۔ ماں کا کچھ پتہ نہیں تھا۔ وہ قتل کی جا چکی تھی یا زندہ تھی دشمن اتنا سفاک تھا کہ اس سے کسی رعایت کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ ایک رات وہ شکنتلا دیوی کے ہاں ماں کی موت کا خیال کر کے روتی رہی تھی۔ اب وہ کلکتہ میں ایک دن کے لئے بھی رہ نہیں سکتی تھی۔ اس لئے کہ شکنتلا دیوی کسی خونخوار درندے کی طرح اسے تلاش کر رہی تھی۔ وہ ایک خطرناک اور بااثر عورت تھی۔ پولیس اس کے ہاتھ میں تھی۔ اب وہ ایک نئے جذبے اور ولولے کے ساتھ اپنے دیش واپس جا رہی تھی تاکہ اپنے باپ اور ماں کے قاتل سے بھیانک انتقام لے سکے جو دس شیطانوں کا مہرہ تھا۔ جمال نے اس کا ہر طرح سے ساتھ دینے کا وعدہ کیا تھا۔ اب اسے ایک بہت بڑا سہارا مل گیا تھا۔ مرد کے سہارے کے بغیر وہ کچھ نہیں کرسکتی تھی۔ اس نے دو تین دنوں میں جمال کو ایک مخلص شخص پایا تھا۔ وہ اس پر بھروسہ کرسکتی تھی اور پھر یہ شخص اسے اچھا لگنے لگا تھا۔ جمال نے اس کے لئے کیا کچھ نہیں کیا تھا۔ شکنتلا دیوی کے چنگل سے نکالنے اور اس کی عزت و آبرو بچانے کے لئے وہ جان پر کھیل گیا تھا۔ اس دنیا میں ایسے پرخلوص لوگ کہاں ملتے ہیں۔

تھوڑی دیر کے بعد دینو گدی پر بیٹھے بیٹھے ان کی طرف گھوم گیا اور جمال سے

بولا۔ ''اس ہفتے تین دلال پکڑے گئے جو لوگوں کو پاکستان لے جانے کے لئے ہندوستان کی سرحد پار کر رہے تھے۔ ان میں سے دو دلالوں سے بیس بیس ہزار روپے وصول کر کے چھوڑ دیا۔ آج کل بڑی سختی ہو رہی ہے۔''

''تیسرے دلال نے کیا رشوت نہیں دی جو اسے چھوڑا نہیں؟'' جمال نے پوچھا۔

''اس سے بھی رقم زبردستی لے لی۔'' اس نے جواب دیا۔ ''اسے اس لئے ابھی رہا نہیں کیا ہے کہ وہ صرف لڑکیوں کی کھیپ پاکستان لے جا رہا تھا۔ اس میں پندرہ برس سے لے کر بیس برس تک کی دس بارہ لڑکیاں تھیں۔ جب وہ پولیس افسران کی خوب خدمت کر لیں گی تب ان سب کو رہا کر دیا جائے گا۔''

سپنا کے جسم پر جھرجھری سی آ گئی۔ اسے پولیس کے نام سے سخت نفرت ہو چکی تھی۔ وہ دل میں پولیس کو کوستی ہوئی قدرتی نظاروں کے حسن سے محظوظ ہونے لگی۔ اطراف میں دور دور تک کھیتوں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ ناریل اور سپاری کے درخت ایستادہ تھے۔ کھیتوں کا سلسلہ بھی پھیلا ہوا تھا۔ بائیں جانب اسے ایک گاؤں دکھائی دیا۔ ایک تالاب کے کنارے عورتیں کپڑے اور برتن دھو رہی تھیں۔ چھوٹے چھوٹے بچے کھیل رہے تھے۔ ان ننگ دھڑنگ بچوں نے اسے دیکھ کر اپنے ہاتھ فضا میں لہرائے۔ وہ بھی جوابی طور پر اپنا ہاتھ ہلانے لگی۔

سپنا کو ایک دم سے پیاس سی محسوس ہوئی تو وہ جمال سے بولی۔ ''کیا پینے کے لئے پانی مل سکتا ہے؟''

جمال نے دینو سے کہا تو اس نے اپنا سر ہلایا اور رکشہ لے جا کر ایک دکان کے پاس روک لیا جو سڑک سے قریب ہی تھا۔ پھر دینو نے رکشہ سے اتر کر دروازے کے پاس جا کر آواز لگائی۔ ''اتم بابو! اتم بابو! ذرا باہر تو آؤ۔''

چند لمحوں کے بعد دروازہ کھلا۔ ایک نوجوان اور شوخ سی لڑکی دروازے پر نمودار ہوئی اور دینو کو دیکھ کر خوش ہو گئی۔ ''کیا بات ہے چاچا جی؟''

''میرے مہمانوں کو پانی تو پلا دے۔'' دینو نے کہا۔ ''پانی ٹھنڈا اور گلاس صاف ہونا چاہیے۔''

لڑکی نے جمال اور سپنا کو دیکھا پھر اندر چلی گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ ایک صراحی کمر پر رکھ کر باہر آئی۔ اس کے ایک ہاتھ میں کانچ کا گلاس تھا۔ جمال رکشہ سے اتر آیا۔ دینو

نے اس کے ہاتھ سے صراحی لے کر گلاس میں پانی انڈیلا۔ جب گلاس بھر گیا تو دینو کے اشارے پر اس نے گلاس سپنا کی طرف بڑھا دیا۔ سپنا پانی پینے لگی تو لڑکی اسے بڑی گہری نظروں سے دیکھنے لگی۔ سپنا نے ایک گلاس پانی اور پیا۔ جس وقت جمال پانی پی رہا تھا تب بھی وہ لڑکی سپنا کو دیکھے جا رہی تھی۔ سپنا نے اس سے پوچھا۔ ''تم مجھے اس طرح گھور گھور کر کیوں دیکھ رہی ہو؟''

لڑکی نے بلا جھجک کہا۔ ''چہرے اور سفید بالوں سے تو آپ پچاس برس کی لگ رہی ہیں لیکن آپ کا جسم ہاتھ اور آنکھیں لڑکیوں کی طرح ہیں۔''

جمال چونک پڑا اور وہ سناٹے میں آ گئی۔ لڑکی غلط نہیں کہہ رہی تھی۔ میک اپ نے چہرے پر تو بڑھاپے کے آثار پیدا کر دیئے تھے۔ سفید بالوں کی وگ پہن کر وہ بوڑھی عورت دکھائی دیتی تھی۔ مگر اس کے ہاتھ اور جسم اور آنکھیں اس کے کم عمر ہونے کی چغلی کھا رہی تھیں۔ اب اس کی سمجھ میں آیا کہ شکنتلا دیوی' ورشا اور جیونتی کیوں اسے حیران اور مشکوک نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔

''ہزاروں میں ایک دو عورتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جن کا جسم' ہاتھ اور آنکھیں بہت خوبصورت ہوتی ہیں۔'' جمال نے لڑکی سے کہا۔

''آواز بھی کتنی میٹھی اور پیاری سی ہے۔'' لڑکی بولی۔ ''میں نے کسی جوان عورت کی بھی اتنی اچھی آواز نہیں سنی۔''

''چل بھاگ یہاں سے شیطان کی خالہ۔'' دینو نے پانی پی کر گلاس واپس کرتے ہوئے اسے ڈانٹا۔

جمال نے اپنی جیب سے دس روپے کا ایک نوٹ نکال کر لڑکی کی طرف بڑھایا۔ ''لو اسے رکھ لو۔ تمہاری باتیں بھی بڑی سندر ہیں۔''

لڑکی دس روپے کا نوٹ پا کر بہت خوش ہو گئی۔ وہ اس وقت تک خوشی اور حیرانی سے رکشہ کو دیکھتی رہی جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہیں ہو گیا۔

دینو نے رکشہ جیون پور گاؤں کے عقبی حصے میں روک لیا۔ جمال نے رکشہ سے اتر کے اسے ایک سو روپے کا نوٹ دیا تو وہ بہت خوش ہو گیا۔ وہ جمال سے بولا۔ ''میں سہ پہر تک یہیں آپ کا انتظار کروں گا۔ کوئی خطرہ محسوس کریں تو چلے آئیں۔''

سپنا ان دونوں کی گفتگو سے لاتعلق ہو کر گردوپیش کا جائزہ لینے لگی۔ یہ ایک ویرانہ

تھا۔ دائیں جانب گاؤں تھا جو کیلے کے درختوں کے پیچھے چھپ گیا تھا۔ کھیتوں میں سپاری اور ناریل کے اونچے اونچے درخت سنتریوں کی طرح کھڑے تھے۔ جھاڑیاں تھیں، کھیت تھے اور آم کے پیڑوں کا سلسلہ بھی دور تک چلا گیا تھا۔ لکڑی کے چھوٹے پل، پگڈنڈیاں اور سانپ کی طرح بل کھاتے ہوئے ٹیڑھے میڑھے راستے صاف نظر آ رہے تھے۔ دور دور تک کسی آدم زاد کا پتہ نہیں تھا۔ جمال دستی بیگ کاندھے سے لٹکا کر اس کے پاس چلا آیا۔

"چلیے! ہم اپنے سفر کا آغاز کرتے ہیں۔"

جمال اسے اپنے ہمراہ لے کر مغرب کی سمت چل پڑا۔ دینو رکشہ کو ایک درخت کی چھاؤں میں کر کے قریب ہی کھڑا ہو گیا تھا۔ کوئی ایک میل کی مسافت طے کرنے کے بعد سپنا تھک کر ایک سایہ دار درخت کے نیچے بیٹھ گئی۔ چند لمحوں کے بعد وہ بولی۔ "مجھے بالوں کی وگ سے بڑی وحشت ہو رہی ہے۔"

جمال اور اس نے اس بہروپ اور اس لڑکی کے ریمارکس پر کوئی بات نہیں کی تھی۔ وہ دینو کی وجہ سے چپ رہے تھے۔ جمال اس کی بات سن کر بولا۔ "ہمارے میک اپ مین صاحب نے آپ کے ہاتھوں اور حسین آنکھوں کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ آپ ایک طرف بوڑھی اور دوسری طرف لڑکی دکھائی دیتی ہیں۔ اب آپ اس بہروپ کو نکال پھینکئے۔ اب اس بہروپ کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اصل خطرہ جو تھا وہ ٹل گیا ہے۔"

سپنا نے بالوں کی وگ نکال کر ایک طرف پھینک دی۔ جمال نے دستی بیگ سے تولیہ نکال کر دیا تو اس نے اچھی طرح سے چہرہ صاف کر کے سارا میک اپ اتار دیا۔ اب اسے ایک طرح سے سکون سا محسوس ہو رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ چاروں طرف نظریں دوڑاتی ہوئی بولی۔ "سخت پیاس لگ رہی ہے۔ پانی مل سکتا ہے؟"

جمال نے ایک جھونپڑی کی طرف اشارہ کیا جو فرلانگ بھر کے فاصلے پر تھی۔ "وہاں تک چلنا ہوگا۔" جمال نے کہا۔ "وہ رنجن داس کی جھونپڑی ہے۔ وہ میرا جاننے والا ہے۔ وہاں نہ صرف پانی بلکہ کھانے اور ستانے کا بھی انتظام ہے۔"

سپنا نے دیکھا کہ اب چلنے کے سوا چارہ نہیں ہے تو وہ چل پڑی۔ وہ اس لئے بھی بے حد تھک گئی تھی کہ اسے کبھی کھیتوں اور پگڈنڈیوں پر چلنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ دھوپ میں تمازت بھی آتی جا رہی تھی۔ بدن میں چبھنے بھی لگی تھی۔ اس کا حلق بری طرح سوکھتا جا رہا تھا۔

رنجن داس جھونپڑی میں موجود تھا۔ اس میں دو کمرے بنے ہوئے تھے۔ اس نے حیرت سے سپنا کو دیکھا اور پوچھا۔ ''کیا یہ آپ کی پتنی ہیں؟''

سپنا سرخ ہو گئی۔ جمال زیر لب مسکرا دیا اور بات ٹالنے کی غرض سے کہا۔ ''پہلے پانی تو پلاؤ۔ انہیں بڑی سخت پیاس لگ رہی ہے۔''

سپنا پانی پی چکی تو جمال اسے دوسرے کمرے میں لے گیا۔ اس کمرے میں صاف ستھری چٹائی بچھی ہوئی تھی۔ ایک تکیہ بھی تھا۔ جمال نے اس سے کہا کہ وہ اس کمرے میں تھوڑی دیر آرام کر لے۔ اتنی دیر میں وہ رنجن داس سے معلوم کرتا ہے کہ راستہ صاف ہے کہ نہیں۔ وہ چٹائی پر جا کر بیٹھ گئی تو جمال کمرے سے نکل گیا۔ پھر وہ بستر پر لیٹ گئی۔ چند لمحوں کے بعد اسے رنجن داس کی آواز سنائی دی۔ ''آپ کی پتنی بہت سندر ہے۔ آپ نے کب بیاہ کیا۔ مجھے بتایا نہیں اور نہ شادی کی مٹھائی کھلائی۔ آج تو آپ کو مٹھائی کھلانا ہو گی۔''

''مٹھائی کھا لینا' لیکن یہ بتاؤ کہ راستہ کیسا ہے؟ کوئی گڑبڑ تو نہیں ہے۔'' جمال نے پوچھا۔

''دن میں سفر کرنے کے لئے تو میں نہیں کہوں گا۔'' رنجن داس نے جواب دیا۔ ''دن میں فوجی گشت پر نکل آتے ہیں۔ فوجیوں کو تو آپ جانتے ہیں۔ وہ رشوت بالکل نہیں لیتے اور نہ ہی جان بخشی کرتے ہیں۔ البتہ پولیس کو ہڈی ڈالو تو وہ کچھ نہیں پوچھتے ہیں۔''

''یہ لو سو روپے۔'' جمال نے کہا۔ ''اس میں سے تم مٹھائی کھا لینا اور کھانے کے لئے بھی کچھ لیتے آنا اور ذرا حالات کا بھی پتہ کرتے آنا۔''

''مجھے واپسی میں دو گھنٹے کی دیر ہو جائے گی۔'' رنجن داس نے دلاسہ دیتے ہوئے کہا۔ ''یہاں شاید منوہر لعل اور اس کا ایک دوست مجھ سے ملنے آئے تو اس سے کہہ دینا کہ وہ کل شام کو آ کر ملاقات کر لے۔''

چند لمحوں کے بعد رنجن داس جھونپڑی سے نکل گیا تو سپنا کو یہ احساس ہوا کہ اس جھونپڑی میں اس کے اور جمال کے سوا کوئی اور نہیں ہے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ ان دونوں کو یک جائی کا موقع ملا تھا۔ وہ ذرہ برابر بھی حواس باختہ نہیں ہوئی۔ اسے جمال پر پورا پورا بھروسہ تھا۔ ان دو دنوں میں اس نے جمال کو بہت قریب سے دیکھا تھا اور وہ اس سے اس طرح واقف ہو چکی تھی جیسے برسوں کی پہچان ہو۔

سپنا نے گردن گھما کر کھڑکی کی طرف دیکھا۔ اس کے دونوں پٹ کھلے ہوئے تھے اور اس میں سے تازہ ہوا کے جھونکے آ رہے تھے۔ پھر اس نے کمرے کا جائزہ لیا۔ ایک کونے میں کپڑے کی ایک چھوٹی سی گٹھڑی رکھی ہوئی تھی اور ایک لالٹین بھی تھی۔ چھوٹی سی محراب میں ایک مورتی بھی تھی۔ اس کے بائیں جانب دو ایک کنستر اور ٹین کے چار پانچ ڈبے رکھے تھے۔ ان کے پاس ایک مضبوط لکڑی کا تین چار فٹ کا ڈنڈا رکھا ہوا تھا جس کی ایک ضرب سے آدمی کا سر پھٹ سکتا تھا۔ یہ کمرہ اور اس کی ہر چیز صاف ستھری تھی۔ رنجن داس بڑا نفاست پسند معلوم ہوتا تھا۔

وہ اپنی ماں اور وقار حسین کے بارے میں سوچنے لگی۔ نیند نے اسے کب دبوچا اسے خبر بھی نہ ہو سکی۔ تھکن کی وجہ سے اسے نیند آ گئی تھی۔ رات بھی وہ بڑی دیر تک جاگتی شانتی سے باتیں کرتی رہی تھی۔ شانتی نے اسے ایک ماں کا پیار دیا تھا۔ اس کا اپنی بیٹی کی طرح خیال رکھا تھا۔ وہ بیدار ہوئی تو اسے گہرے سناٹے کا احساس ہوا۔ وہ ہڑبڑا کے ایک جھٹکے سے بیدار ہو گئی۔

سپنا نے سامنے والے کمرے کی دہلیز کی طرف دیکھا تو اس کے اوسان خطا ہو گئے۔ دہشت سے اس کا بدن لرزنے لگا۔ دہلیز کو پار کر کے دو غنڈے کھڑے ہوئے اسے حیرت زدہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ انہیں جیسے ایک حسین و جمیل عورت کی موجودگی کا یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ خواب کی سی حالت میں کھڑے تھے۔ ایک نے اپنے ساتھی کو کہنی مارتے ہوئے کہا۔ ''منوہر لعل! ہم خواب تو نہیں دیکھ رہے ہیں؟''

منوہر لعل نے اپنی آنکھیں دونوں ہاتھوں سے ملیں۔ پھر اس نے اپنے بدن کی چٹکی لی۔ ''نہیں موہن! یہ خواب نہیں زندہ حقیقت ہے۔''

''مجھے تو خواب ہی لگ رہا ہے منوہر لعل!'' موہن کے چہرے کے تاثرات بدلنے لگے۔ ''لیکن یہ عورت آئی کہاں سے؟ کیسے آئی؟ رنجن داس نے اس کا کوئی ذکر نہیں کیا تھا۔ یہ اس کی بیٹی نہیں معلوم ہوتی۔ اس لئے کہ اس کی بیٹی تو پچھلے سال بمبئی بھاگ گئی تھی۔''

''آسمان سے آئی ہو یا کہیں سے بھی آئی ہو ہمیں اس سے کیا۔'' منوہر لعل نے استہزائی لہجے میں کہا۔ ''ہمیں آم کھانے سے مطلب ہے' پیڑ گننے سے نہیں۔''

''پتہ نہیں یہ پکا ہوا پھل رنجن داس کہاں سے لایا ہے اور اسے چھوڑ کر کہاں چلا گیا ہے؟'' موہن تعجب سے بولا۔ ''کیا خیال ہے ہم اسے یہاں سے اٹھا کر اپنے ٹھکانے پر

نہ لے جائیں۔ اس وقت رنجن داس بھی نہیں ہے اور پھر اس کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں ہو گی۔"

سپنا کے بدن پر لرزہ ساطاری تھا۔ ان کی باتوں نے اسے جیسے بے جان کر دیا تھا۔ اس میں اتنی سکت بھی نہیں تھی کہ اپنی جگہ سے ہل سکے۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔ منوہر لعل کا چہرہ بڑا مکروہ تھا۔ اس کی لمبی گھنی مونچھوں نے اور خوفناک بنا دیا تھا۔ اس کے چہرے پر سفاکی عود کر آئی تھی اور اس کی آنکھوں میں ہوس ناچ رہی تھی۔ وہ لمبے چوڑے قد اور مضبوط بدن کا تھا۔ موہن کسی گینڈے سے مشابہ تھا۔ اس کے ہونٹوں پر مغرورسی مسکراہٹ جھلک رہی تھی اور سور جیسی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

غنڈوں کی آمد اچانک اور اتنی غیر متوقع تھی کہ وہ بدحواس ہو گئی تھی اسے سنبھلنے کے لئے مہلت درکار تھی۔ وہ اسے شاید یہ مہلت دینا چاہتے تھے اس لئے وہ بڑے اطمینان سے اپنی جگہ کھڑے تھے۔ اس نے اپنے خواب وخیال میں بھی نہیں سوچا تھا کہ یہاں غنڈوں سے بھی واسطہ پڑ سکتا ہے۔ جمال کہاں ہے؟ ایک دم سے اسے جمال کا خیال آیا۔ وہ شاید اسے سوتا ہوا پا کر کہیں نکل گیا ہو مگر وہ اسے اس ویرانے میں تنہا چھوڑ کر گیا کہاں؟ وہ ان غنڈوں سے کیسے اور کس طرح سے مقابلہ کرے۔ وہ سوچنے لگی۔

"مہارانی جی!" منوہر لعل نے اسے استہزائی انداز سے مخاطب کیا۔ "کیا آپ بتا سکتی ہیں کہ کہاں سے آپ کی تشریف آ رہی ہے؟"

"کون ہو تم لوگ؟" وہ ہذیانی انداز سے تقریباً چیختے ہوئے بولی کہ اگر جمال کہیں قریب ہو تو اس کی آواز سن لے۔

"ہم یہی سوال آپ سے کرنا چاہتے ہیں۔" موہن ہنسا۔ "آپ کون سے دیس سے آئی ہیں؟ کیا سندیسہ لائی ہیں؟"

"تم یہاں سے دفع ہو جاؤ۔" وہ اپنی پوری طاقت سے چیخی۔ "میں کوئی بھی ہوں تمہیں اس سے کیا؟"

"ہم بارات لے کر آئے ہیں لہٰذا اپنی دلہن کو لئے بغیر نہیں جائیں گے۔" منوہر لعل اپنی مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگا۔ "تمہیں ہم جیسے خوب صورت، جوان اور کڑیل شوہر ساری زندگی ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملیں گے۔"

معاً سپنا کی نگاہ اس ڈنڈے پر پڑی جو اس سے دو تین فٹ پر تھا۔ اسے ڈنڈا

اٹھانے کے لئے صرف ایک لمحے کی مہلت درکار تھی۔ یہ مہلت اسے آسانی سے مل سکتی تھی اس لئے کہ وہ اس سے چار پانچ قدم دور تھے۔ اس ڈنڈے کو دیکھ کر اس کا اعتماد تیزی سے بحال ہونے لگا۔ وہ اس سے اپنی عزت و آبرو کی حفاظت کر سکتی تھی۔ اس کے دفاع اور مقابلے کے لئے یہ ڈنڈا کافی تھا۔ اس خیال کے آتے ہی وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے ساڑھی کا پلو درست کرتے ہوئے اسے کمر میں اڑس لیا اور برہمی سے بولی۔ ''تم سوروں نے کبھی آئینے میں اپنی شکل دیکھی ہے؟''

''ناراض کیوں ہوتی ہو مہارانی!'' موہن نے چمکارتے ہوئے کہا۔ ''ذرا یہ تو بتاؤ کہ تمہارا خوش نصیب شوہر کون ہے؟''

''جمال احمد۔'' اس کے منہ سے بلا ارادہ نکل گیا۔

''جمال احمد؟'' منوہر لعل نے حیرت سے موہن کی شکل دیکھی۔ ''اس نے شادی کب کی؟ وہ آٹھ دس روز پہلے کلکتہ میں ملا تھا۔ اس وقت تو اس نے شادی نہیں کی۔ وہ شادی کرتا تو مجھے ضرور بتاتا۔ وہ کلکتہ میں شادی کر بھی نہیں سکتا۔ اس کے گھر والے تو کھلنا شہر میں ہیں۔''

''شاید اس لڑکی کو شادی کا فریب دے کر بھگا کر لے جا رہا ہوگا۔ اس لئے یہ اپنے آپ کو جمال کی بیوی کہہ رہی ہے۔'' موہن بولا۔

''نہیں، وہ ایسا آدمی بھی نہیں ہے۔'' منوہر لعل نے کہا۔ ''لکھ پتی آدمی ہے مگر میں نے اسے شراب اور عورت سے دور ہی دیکھا۔''

''چیز نہیں دیکھ رہے ہو کیا زوردار ہے۔ کون مرد ایسا ہوگا جو اسے دیکھ کر اس پر مر نہ جائے۔'' موہن نے ایک عاشق کے انداز میں حسرت بھری نظروں سے سپنا کو دیکھا اور اپنے سینے پر دو ہتڑ مارتے ہوئے بولا۔ ''میں نے اپنی زندگی میں کبھی ایسی قیامت نہیں دیکھی۔''

''یار اسے جلدی سے لے چلو۔'' منوہر لعل بولا۔ ''رنجن داس اور اس کا نام نہاد شوہر آ گیا تو پھر معاملہ خراب ہو جائے گا۔''

''ہمارے سنگ چلئے مہارانی جی!'' موہن نے اس کی طرف اپنا ہاتھ بڑھایا۔

سپنا غیر محسوس انداز سے ڈنڈے کے پاس پہنچ چکی تھی۔ اس نے چشم زدن میں ڈنڈا اٹھا کر اس کا ایک سرا دونوں ہاتھوں سے مضبوطی سے تھام لیا۔ اسے فضا میں لہراتی ہوئی

وہ ہیجانی لہجے میں بولی۔ ''خبردار! جو تم نے ہاتھ بڑھایا۔''

موہن نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ وہ بھونچکا سا ہو گیا تھا۔ دوسرے لمحے سنبھل کر منوہر لعل سے بولا۔ ''چیونٹی کے پر نکل آئے ہیں۔''

''خوب صورت لڑکیاں بہت زیادہ نخرے دکھاتی ہیں۔'' منوہر لعل' سپنا کو گھورنے لگا۔ ''مجھے ڈر ہے کہ کہیں اس کی نازک کلائی میں موچ نہ آ جائے۔''

''لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے ہیں۔'' موہن نے اپنی جیب سے چاقو نکال کر اسے ایک جھٹکے سے کھول لیا۔ سپنا نے اس کے ہاتھ میں چاقو دیکھا تو ایک سرد لہر اس کی ریڑھ کی ہڈی میں پھیل گئی۔ سپنا نے سوچا بھی نہیں تھا کہ اس بدمعاش کے پاس چاقو بھی ہوگا۔ موہن نے اس کے چہرے پر خوف کا سایہ دیکھا تو وہ تمسخر سے بولا۔ ''بے بی! یہ چھڑی پھینک دو۔ تمہارے بس کی نہیں ہے۔''

''میں اس سے تمہارا سر پھوڑ دوں گی۔'' وہ اپنی آواز کی لرزش پر قابو پا کے مضبوط لہجے میں بولی۔

''کیا تم نے مجھے بچہ سمجھ رکھا ہے۔'' موہن چاقو لہراتا ہوا اس کی طرف بڑھا۔

سپنا نے ایک دم سے اس کی طرف بڑھ کر کرکٹ کے بلّے کی طرح ڈنڈے کو موہن کے ہاتھ پر اس تیزی سے مارا کہ وہ اپنا چاقو والا ہاتھ پھرتی سے ہٹا بھی نہیں سکا۔ اس کے ہاتھ پر اتنے زور سے ڈنڈا لگا کہ چاقو چھوٹ کر فرش پر گر گیا اور اس کے منہ سے کراہ نکل گئی۔ اس نے بائیں ہاتھ سے دائیں ہاتھ کو پکڑ لیا۔ وہ بری طرح کراہنے اور درد کی شدت سے تڑپنے لگا۔ چیختے ہوئے بولا۔ ''میں مر گیا' میرا ہاتھ ٹوٹ گیا۔''

منوہر لعل نے سپنا کو حیرت اور خوف سے دیکھا۔ یہ لڑکی اتنی کمزور نہیں تھی جیسا اس نے سمجھا تھا۔ پھر اس نے لپک کر فرش سے چاقو اٹھا لیا۔ اس کے دستے پر ہاتھ کی گرفت مضبوط کرتے ہوئے دھاڑا۔ ''احمق لڑکی! تم کیوں اپنی موت کو دعوت دے رہی ہو؟''

''میں نے نہیں بلکہ تم دونوں بدمعاشوں نے اپنی اپنی موت کو دعوت دی ہے۔'' وہ پھنکاری۔ موہن کی درگت دیکھ کر اس کا حوصلہ بڑھ گیا تھا۔ اب وہ شیرنی بن گئی تھی۔ ''میں تم دونوں میں سے کسی کو زندہ نہیں چھوڑوں گی۔ زندگی چاہتے ہو تو بھاگ جاؤ۔''

''ہم اور بھاگ جائیں۔'' منوہر لعل استہزائی انداز سے بولا۔ ''اب تو ہم ہر قیمت پر تمہیں لے جا کر رہیں گے۔ تمہاری اس حرکت کا ایسا بھیانک انتقام لیں گے کہ تم ساری

زندگی بھلانا بھی چاہو تو بھلا نہ سکو گی۔"

منوہر لعل، موہن کے پاس جا کھڑا ہوا۔ اس کے ہاتھ کے درد میں کمی آ گئی تھی۔ منوہر لعل نے چاقو کو اس کی طرف بڑھایا۔ "تم اسے سنبھالو۔ میں بھی اپنا چاقو نکالتا ہوں۔ پھر ہم دونوں مل کر اسے گھیرتے ہیں۔ اس طرح یہ قابو میں نہیں آئے گی۔"

"مگر میرا دایاں ہاتھ بہت درد کر رہا ہے۔ میں اس سے چاقو کیسے چلاؤں؟ اس سے تو چاقو پکڑا بھی نہیں جائے گا۔"

"چاقو بائیں ہاتھ میں پکڑ لو۔" منوہر لعل بولا۔ "اگر اس نے پھر ڈنڈا مارنے کی کوشش کی تو چاقو اس کی پسلی میں اتار دینا۔"

موہن نے اپنا چاقو منوہر لعل سے لے کر اسے بائیں ہاتھ میں مضبوطی سے پکڑ لیا۔ اس کی نس نس میں لہوا بلنے لگا تھا۔ ایک معمولی سی لڑکی نے اسے نیچا دکھا دیا تھا۔ وہ اس کا بدلہ لینا چاہتا تھا اور منوہر لعل نے اپنی جیب سے چاقو نکالنے کے لئے جیب میں ہاتھ ڈالا تو سپنا نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا وہ موہن کی طرف لپکی تو موہن حواس باختہ ہو کر ایک قدم پیچھے ہٹا۔ یہ حملہ اس کے لئے غیر متوقع تھا۔ وہ پوری طرح سنبھلنے بھی نہیں پایا تھا کہ سپنا نے اس کے بائیں ہاتھ پر اس زور سے ضرب لگائی کہ اس کے منہ سے ایک دل خراش چیخ نکل گئی۔ چاقو ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گر گیا۔ وہ ناچنے لگا۔ اس کے لئے یہ درد نا قابل برداشت ہو گیا تھا۔ اس کی جیسے جان نکل رہی تھی۔ وہ سپنا کو گالیاں بکنے لگا۔

"اپنا منہ بند کرو نہیں تو وہ بھی توڑ دوں گی۔" سپنا غضب ناک ہو کر بولی۔

سپنا کی اس دھمکی کا اس پر اثر ہوا تھا۔ اس نے گالیاں بکنا بند کر دیں۔ اس کا چاقو منوہر لعل کے پیروں کے پاس آ کر گرا تو منوہر لعل نے اسے اٹھایا نہیں وہ اپنا چاقو نکال چکا تھا۔ سپنا نے اسے بھی اندر ہی اندر بری طرح خوفزدہ کر دیا تھا۔ اس نے محسوس کر لیا تھا کہ اس لڑکی کو قابو کرنا اتنا آسان نہیں ہے۔ وہ کسی زخمی شیرنی کی طرح غضب ناک ہو رہی تھی۔ اسے کبھی اپنی زندگی میں ایسی عورت سے واسطہ نہیں پڑا تھا۔ وہ سپنا کو قابو کرنے کی تدبیریں سوچنے لگا۔ تاہم وہ اپنا چاقو کھول کر بہت ہوشیار اور چوکنا کھڑا تھا۔ کہیں سپنا بھی اس پر اچانک حملہ آور نہ ہو جائے۔

ادھر سپنا کا ذہن بھی بڑی تیزی سے ایسی تدبیر سوچ رہا تھا جس سے وہ اس موذی سانپ پر بھی قابو پا لے۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اس نے جو سبق موہن کو دیا ہے کسی طرح اسے

منوہر لعل کو بھی دے۔ منوہر بہت ہوشیار اور شاطر قسم کا لگ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں جو چاقو تھا وہ موہن کے چاقو سے کہیں خوفناک تھا۔ اس کا پھل دیکھ کر اس کے سارے بدن میں جھرجھری سی آ گئی تھی۔ اس کے من کے نہاں خانوں سے ماں کی آواز سنائی دی۔ سپنا بیٹی! ہمت عزم و حوصلے سے کام لو۔ یہ دشمن تو کچھ بھی نہیں۔ تمہیں تو اس سے کہیں خطرناک دشمن سے انتقام لینا ہے۔ آگے بڑھو اس کا سر کچل کر رکھ دو۔

موہن درد سے مسلسل تڑپ اور کراہ رہا تھا۔ سپنا نے دیکھا۔ منوہر لعل کسی داؤ کو آزمانے کا سوچ رہا ہے تو وہ اس پر حملہ آور ہونے کے لئے بڑھی اور پھر ایک دم سے ٹھٹھک کے رک گئی۔ دو آدمی اسی وقت تیزی سے داخل ہوئے تھے۔ وہ موہن کو چیختا دیکھ کر بڑے حیران ہوئے۔ اس سے زیادہ حیرانی انہیں سپنا کو اور اس کی شعلہ بار نگاہوں کو دیکھ کر ہوئی تھی۔ ان کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ ماجرا کیا ہے۔

ایک آدمی نے موہن کے پاس جا کر حیرت سے پوچھا۔ ”کیا ہوا موہن؟ یہ تم چیخیں کیوں مار رہے ہو؟“

”اس کمینی نے ڈنڈے مار مار کر میرے دونوں ہاتھ توڑ دیئے ہیں۔“ موہن نے درد کی وجہ سے رک رک کر جواب دیا۔

”کیا؟“ اسے جیسے یقین نہیں آیا۔ اس نے سپنا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تم ایک عورت کے ہاتھوں پٹ گئے؟“

”بسوا جیت! تم نہیں جانتے یہ لڑکی بہت خطرناک ہے۔“ منوہر لعل حقارت سے بولا۔ ”تم خوب وقت پر آئے۔“ پھر وہ توقف کر کے دوسرے آنے والے شخص سے بولا۔ ”گوپال! تمہارے پاس چاقو تو ہے نا۔ تم اور بسوا جیت بھی آ جاؤ پہلے ہم اس لڑکی کو قابو میں کر لیں۔“

”مگر یہ حسین بلا ہے کون؟“ بسوا جیت نے اپنا چاقو نکالتے ہوئے پوچھا۔ ”یہ یہاں کیسے آئی ہے؟“

”تمہیں آم کھانے سے مطلب ہے یا پیڑ گننے سے۔“ منوہر لعل کو غصہ آ گیا۔ ”اس کے بارے میں جو کچھ معلوم کرنا ہے وہ بعد میں پوچھ لینا۔“

وہ تینوں بدمعاش ہاتھوں میں خوفناک قسم کے چاقو لئے اسے اپنے نرغے میں لینے کے لئے تین اطراف سے بڑھ رہے تھے۔ بڑی عجیب سی بات ہوئی تھی۔ سپنا مطلق نہیں

گھبرائی اور نہ پریشان ہوئی تھی۔ اس کا حوصلہ پست ہونے کے بجائے اور بڑھ گیا تھا۔ وہ آسانی سے اپنی شکست تسلیم کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے دل میں سوچ لیا تھا کہ ذلت کی زندگی سے موت بہتر ہے۔ وہ کسی قیمت پر ان کی درندگی کا نشانہ نہیں بنے گی۔

سپنا پوری طرح ان کے نرغے میں آ گئی تھی۔ اسے کسی بدمعاش پر حملہ کرنے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔ منوہر لعل اسے بے بس سا پا کر اس کی طرف بڑھنے لگا تو کمرے میں ایک کرخت آواز گونجی۔ ''کتو! پیچھے ہٹ جاؤ۔ ورنہ تمہاری کھوپڑیوں میں سوراخ کر دوں گا۔''

سپنا اور ان تینوں غنڈوں نے آواز کی سمت دیکھا۔ جمال اپنے ہاتھ میں پستول لئے کھڑا تھا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھیں انگارے برسا رہی تھیں۔ وہ تینوں پستول دیکھ کر خوفزدہ سے ہو گئے سپنا کا چہرہ دمک اٹھا۔ جمال نے گرجتے ہوئے کہا۔ ''بسوا جیت اور گوپال اپنے اپنے چاقو پھینک دو۔ موہن کے پاس خاموشی سے کھڑے ہو جاؤ۔ تم اپنا چاقو نہیں پھینکو گے۔ سپنا سے مقابلہ کرو۔'' اس نے توقف کر کے سپنا سے پوچھا۔ ''آپ اس سے مقابلہ کریں گی یا پھر میں اس کی کھوپڑی میں سوراخ کر دوں؟''

''میں اس سے مقابلہ کروں گی۔'' سپنا نے بڑے حوصلے سے کہا۔ ''میں اسے اس کی کمینگی کا مزا چکھانا چاہتی ہوں۔''

''آپ اس کمینے کے ہاتھ پیر کی ہڈیاں توڑ دیں تاکہ یہ سیالدہ ریلوے اسٹیشن پر بھیک مانگ کر گزارہ کرے۔'' جمال نے کہا۔

بسوا جیت اور گوپال نے پس و پیش کے بعد اپنے اپنے چاقو فرش پر پھینک دیئے اور وہ موہن کے پاس جا کر کھڑے ہوئے۔ جمال نے فرش پر موہن اور ان دونوں کے چاقو اٹھا لئے اور وہ تیزی سے دوسرے کونے میں جا کھڑا ہوا جہاں سے وہ ان بدمعاشوں کو پستول کی زد میں رکھ سکتا تھا۔ موہن ابھی درد سے تڑپ رہا تھا۔ اس کا درد کم ہونے کی بجائے بڑھتا جا رہا تھا۔ اسے جمال پر غصہ آیا تھا جس کے اچانک آ جانے کی وجہ سے ساری بازی الٹ گئی تھی۔

جمال کو دیکھ کر سپنا کا حوصلہ اور بڑھ گیا تھا۔ اسے جیسے ایک نئی توانائی ملی تھی۔ اب تو وہ تنہا ان چاروں بدمعاشوں سے لڑنے کا حوصلہ رکھتی تھی۔ اس کی رگوں میں لہو ابل رہا تھا۔ وہ منوہر لعل کو ایسا سبق دینا چاہتی تھی کہ وہ آئندہ کسی عورت کی بے بسی سے فائدہ نہ اٹھا

سکے۔

کمرہ کافی بڑا اور کشادہ تھا۔ اس میں ان دونوں کے مقابلے کی گنجائش تھی۔ منوہر لعل، جمال کے ہاتھ میں پستول دیکھ کر خوفزدہ سا ہو گیا تھا۔ ہر صورت میں اس کی موت لکھی ہوئی تھی۔ سپنا کو کسی صورت سے نقصان پہنچانے کی صورت میں وہ خود بھی بچ نہیں سکتا تھا۔ سپنا کی کامیابی بھی اس کے لئے موت سے کم نہ تھی۔ وہ عجیب الجھن اور مخمصے میں پڑ گیا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ وہ سوچ ہی رہا تھا کہ سپنا اس پر کسی غضب ناک شیرنی کی طرح ٹوٹ پڑی۔ اگر وہ تیزی اور پھرتی سے ایک طرف ہٹ نہ جاتا تو اس کی کھوپڑی دو حصوں میں تقسیم ہو جاتی۔ اس لمحے ایک تدبیر اس کے ذہن میں آئی وہ چاقو پھینک کر کمرے سے نکل بھاگا۔ سپنا نے اس کے پیچھے بھاگنا چاہا مگر جمال نے اسے روک لیا۔

جمال نے موہن سے مخاطب ہو کر حقارت اور غصے سے کہا۔ ''تم تینوں کان کھول کر سن لو اور اس بھگوڑے سے بھی کہہ دینا کہ وہ پولیس کے پاس جانے کی حماقت نہ کرے۔ اگر اس نے کمینگی کی تو میں کسی کو بخشوں گا نہیں۔ تم لوگ جانتے ہو کہ پولیس کمشنر مکر جی سے میرے دیرینہ تعلقات ہیں اور اس خبیث کو ایک مرتبہ میری سفارش پر چھوڑ دیا گیا تھا۔ چلو بھاگو......''

وہ تینوں بڑی تیزی سے جھونپڑی سے نکل گئے۔ سپنا نے ڈنڈا فرش پر رکھ کر ایک گہرا سانس لیا اور ساڑھی کے پلو میں پسینہ جذب کرنے لگی۔ جمال اسے تعریفی نظروں سے دیکھتا ہوا بولا۔ ''مجھے نہیں معلوم تھا کہ نازک اور حسین لڑکیاں بھی بڑی بہادر ہوتی ہیں۔''

''عورت کے لئے اس کی آبرو سے زیادہ قیمتی چیز کوئی نہیں ہوتی ہے۔'' سپنا نے جواب دیا۔ ''میں اپنی عزت بچانے کے لئے اپنی جان پر کھیل گئی تھی۔ آپ بروقت نہیں پہنچتے تو یہ بھیڑیئے مجھے بخشتے نہیں۔ یہ آپ نے مجھ پر دوسرا بڑا احسان کیا ہے۔''

''آپ نے جس بہادری سے مقابلہ کیا اور موہن کا حشر نشر کر دیا اس کی داد نہ دینا ناانصافی ہوگی۔ سچ پوچھئے تو میں عش عش کر اٹھا۔''

''یہ آپ کہاں چلے گئے تھے مجھے تنہا چھوڑ کر۔'' سپنا سرخ ہوگئی۔

''میں کہیں نہیں گیا تھا۔ جھونپڑی کے باہر ایک درخت کے سائے میں بیٹھا رنجن داس کا انتظار کر رہا تھا۔''

''کیا؟'' سپنا کے چہرے پر گہرا سا تعجب بکھر گیا۔ ''آپ میری چیخ و پکار کی آواز سن کر مدد کے لئے کس لئے نہیں آئے؟''

''میں آپ کی آواز سن کر کھڑکی کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔'' جمال نے جواب دیا۔ ''میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ آپ اپنی جان و آبرو کی کس طرح اور کیسے حفاظت کرتی ہیں۔ میں نے دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ آپ کی ناکامی کی صورت میں، آپ کی مدد کے لئے پہنچ جاؤں گا۔ جب میں نے یہ دیکھا کہ تینوں مسلح بدمعاش آپ کو قابو میں کرنے کے لئے نرغے میں لے رہے ہیں اور ان سے مقابلہ کرنا آپ کے بس کی بات نہیں ہے تو میں فوراً پہنچ گیا۔''

''آپ فوراً میری مدد کو آ جاتے تو اچھا تھا۔ خدانخواستہ مجھے کچھ ہو جاتا تو؟'' سپنا نے اسے تیکھی نظروں سے دیکھا۔

''دراصل میں آپ کو کندن بنا رہا ہوں۔'' جمال زیر لب مسکرایا۔ ''اس لئے فوراً نہیں پہنچا۔''

''وہ کس لئے؟'' سپنا نے اپنی لانبی پلکیں حیرت سے جھپکائیں۔

''اس لئے کہ آپ کو ایک بہت بڑے دشمن سے مقابلہ کرنا ہے۔'' اس کے لئے صرف عزم و حوصلے ہی کی نہیں بلکہ بہادری اور تجربے کی بھی ضرورت ہے۔ آپ نے پہلی مرتبہ دو بدمعاشوں سے مقابلہ کیا اور ایک طرح سے کامیاب رہیں۔ اپنے ہاں پہنچنے کے بعد میں آپ کو نہ صرف ہر قسم کے اسلحہ کے استعمال کی تربیت دلواؤں گا بلکہ جوڈو کراٹے بھی۔ فی زمانہ ہر لڑکی کو کم از کم جوڈو کراٹے ضرور آنا چاہیے۔''

''میری سہیلیاں بھی مجھ سے کہتی تھیں کہ میں جوڈو کراٹے سیکھ لوں اس لئے کہ معاشرہ بہت خراب ہوتا جا رہا ہے۔ جوان لڑکیوں کی عزت و آبرو محفوظ نہیں رہی ہے۔ انہیں دن دیہاڑے اغواء کر لیا جاتا ہے۔ اس فن کے سیکھنے سے لڑکیاں اپنا دفاع تو کر سکتی ہیں۔''

''مگر آج کل اسلحہ اس قدر عام ہو گیا ہے کہ اس کے سامنے ہر کوئی بے بس ہو جاتا ہے۔'' جمال نے کہا۔ ''سارا فن اور مہارت دھری رہ جاتی ہے۔''

''مگر پھر بھی یہ بہت بڑا سہارا ہوتا ہے ایک عورت کے لئے۔'' سپنا کہنے لگی۔ ''میں نے اخبار میں ایک خبر پڑھی تھی کہ ڈھاکہ یونیورسٹی کے تین طالب علموں نے جو اعلیٰ افسران کے بیٹے تھے انہوں نے اپنی ایک ہم جماعت لڑکی کو اغوا کر لیا۔ وہ لڑکی تین گھنٹے کے بعد ان

کے چنگل سے نکل کر خیریت سے اپنے گھر پہنچ گئی۔ اس کی مدد جوڈو کراٹے کے فن نے کی تھی۔ اس نے اپنی ذہانت اور اس فن کی بدولت ان کے عزائم خاک میں ملا دیئے تھے۔"

"آپ بھی تو بڑی ذہین ہیں۔" جمال نے اسے دزدیدہ نظروں سے دیکھا۔ "آپ کی ذہانت نے میری ایک بہت بڑی مشکل حل کر دی۔"

"کیسی مشکل؟" سپنا نے تعجب اور ساکت پلکوں سے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"شادی کی۔" جمال نے بناوٹی سنجیدگی سے کہا۔ "آپ نے دنیا کے سامنے یہ اعلان کر دیا کہ میں آپ کا شوہر ہوں۔"

"جی......" سپنا ہونقوں کی طرح اس کی شکل دیکھنے لگی۔ پھر شرما کر اس نے اپنی نگاہیں نیچی کر لیں۔ اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ وہ بمشکل تمام بولی۔ "میں نے ان بدمعاشوں سے اس لئے جھوٹ بولا تھا کہ شاید وہ واپس چلے جائیں۔"

"کیا یہ ممکن ہے کہ یہ جھوٹ سچ بن جائے۔" جمال نے بڑی آہستگی سے کہا۔ "میں نے اپنی زندگی میں کبھی کسی عورت کا سپنا نہیں دیکھا۔ آپ کو کیا دیکھا بس میں اب آپ کا سپنا دیکھنے لگا ہوں۔ مگر میں اس کے لئے آپ کو مجبور نہیں کروں گا۔ میں یہ بھی نہیں چاہوں گا آپ مجھے اس لئے قبول کر لیں کہ میں نے آپ کے لئے کچھ کیا ہے اور آپ کو سہارا دے رہا ہوں۔ آپ انکار کر دیں گی تو بخدا مجھے ذرا بھی ملال نہ ہو گا۔ ہم میاں بیوی نہ سہی ایک اچھے دوست تو ثابت ہو سکتے ہیں۔ میں ایک دوست کی طرح آپ کا ہمیشہ ساتھ دوں گا۔"

سپنا نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا اور نہ ہی اپنا جھکا ہوا سر اوپر اٹھایا۔ جمال سپنا ہی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر اپنی نظریں مرکوز کئے ہوئے تھا۔ سپنا کے چہرے پر کچھ نہ تھا۔ سپاٹ سا تھا۔ کسی کورے کاغذ کی طرح' اس کی آنکھوں پر بھی پلکوں کی چلمن گری ہوئی تھی ورنہ وہ ان آنکھوں میں اس کے دل کا حال پڑھ لیتا۔ اس کا دل بڑی تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ وہ حسن کے دربار میں سوالی بن کر کھڑا ہوا تھا۔

سپنا نے اپنی جھکی جھکی پلکیں اوپر اٹھائیں۔ پھر جمال نے اس حسین چہرے کو اپنی طرف اٹھتے پایا۔ لمحے جو صدیوں کی طرح بھاری تھے وہ ختم ہو گئے تھے۔ وہ نرم اور مترنم لہجے میں بولی۔ "مجھے کیا انکار ہو سکتا ہے مگر میں آپ کے لائق نہیں ہوں۔ آپ بہت بڑے آدمی ہیں اور میں......"

جمال نے بے اختیار اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ خوشی اس کے چہرے سے

پھوٹ پڑی تھی۔ وہ سرشاری سے کہنے لگا۔ ''یہ میں جانتا ہوں کہ کون کس کے لائق ہے۔ آج سے آپ میری ہیں۔ میں آپ کا ہوں۔ آپ نے مجھے قبول کر کے اتنا بڑا آدمی بنا دیا ہے کہ میں خوشی سے پاگل ہو رہا ہوں۔'' جمال خوشی اور جذبات کی رو میں کیا کہتا جا رہا ہے اسے ذرا احساس نہیں تھا۔

''کیا ایک لڑکی کو کسی پاگل شخص سے شادی کرنا چاہیے؟'' سپنا نے سکڑ اور سمٹ کر شوخ لہجے میں پوچھا۔

''نہیں، ہرگز نہیں، اسے کسی قیمت پر پاگل مرد سے شادی نہیں کرنا چاہیے۔'' جمال نے سنجیدہ ہو کر جواب دیا۔

''تو پھر میں کیسے آپ سے شادی کر سکتی ہوں۔'' وہ نظریں نیچی کر کے آہستگی سے بولی۔

''مگر میں پاگل تو نہیں ہوں؟'' وہ حیرت سے بولا۔ ''آپ سے کس نے کہہ دیا کہ میں پاگل ہوں۔''

''ابھی آپ ہی تو کہہ رہے تھے کہ میں خوشی سے پاگل ہو رہا ہوں۔'' وہ اپنی ہنسی نہ روک سکی۔ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ ''آپ پاگل ہو گئے تو میں کیا کروں گی؟ کہاں جاؤں گی؟ اس لئے کہ پاگل پن کا علاج ابھی دریافت نہیں ہوا ہے۔''

''دنیا میں ایسے پاگلوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔'' جمال دل کش انداز سے مسکرایا۔ ''اس کا علاج بھی دریافت ہو چکا ہے۔ اس کا واحد علاج شادی ہے۔ گھر پہنچتے ہی سب سے پہلے اسی پاگل پن کا علاج کرانا ہے۔''

سپنا کے چہرے پر ایک عجیب سا نکھار آ گیا جس نے اسے اور حسین بنا دیا۔ اس کا چہرہ کسی برقی قمقمے کی طرح روشن ہو گیا تھا۔

سپنا نے جمال کی آنکھوں میں جھانکا اور وہ اس راستے جیسے اس کے دل کی اتھاہ گہرائیوں میں اتر گئی۔ جمال کے لہجے میں، اس کے دل میں اور اس کی خوبصورت آنکھوں سے سچائی جھلک رہی تھی۔ جمال کا یہ جذباتی فیصلہ نہیں تھا۔ پھر یہ طلسم یک لخت بکھر گیا۔ وہ چونک کر حقیقی دنیا میں واپس آ گئی۔ کوئی بڑی تیزی سے دوڑتا ہوا جھونپڑی میں داخل ہوا تھا۔ اس نے اپنی آنکھیں کھول کر دیکھا۔ وہ رنجن داس تھا۔ اس کے چہرے کا رنگ اڑا ہوا تھا۔ وہ بری طرح ہانپ رہا تھا۔ وہ دیوار کے سہارے کھڑے ہو کر سینے پر ہاتھ رکھ کر پھولی ہوئی سانسوں کو قابو میں کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ بہت دور سے

دوڑتا ہوا آیا ہو۔

چند لمحوں کے بعد وہ پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان کہنے لگا۔ ''جلدی سے یہاں سے نکل چلو۔ منوہر لعل چھ سات مسلح آدمیوں کو لے کر اس طرف آ رہا ہے۔ تاکہ شریمتی جی کو اٹھا کر لے جائے اور آپ کو قتل کر کے کسی گڑھے میں دفن کر دے۔''

''کیا؟'' جمال ششدر رہ گیا۔ ''اس کمینے کی یہ مجال؟ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔'' وہ مشتعل ہو کر بولا۔

''بچوں جیسی باتیں نہ کرو جمال صاحب!'' رنجن داس نے وحشت زدہ لہجے میں اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ''کیا آپ چھ سات مسلح آدمیوں سے مقابلہ کریں گے؟ آپ کے پاس ہے کیا ان سے مقابلہ کرنے کے لئے۔ ان کے پاس بندوقیں ہیں وہ آپ کو بھون کر رکھ دیں گے۔''

''چلیں، یہاں سے نکل چلیں۔'' سپنا حواس باختہ ہو کر بولی۔ ''رنجن داس ٹھیک ہی کہہ رہے ہیں۔ باتوں میں وقت ضائع نہ کریں۔''

جمال نے ایک منٹ کے ہزارہویں حصے میں کچھ سوچا پھر اس نے لپک کر دستی بیگ اٹھا لیا اور رنجن داس سے پوچھا۔ ''چھپنے کی کوئی جگہ ہے؟''

''ہاں ایک محفوظ جگہ ہے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''میں وہیں آپ دونوں کو لے جانے کے لئے آیا ہوں۔''

جھونپڑی سے نکل کر رنجن داس انہیں شمال کی سمت لے کر چلا۔ وہ ایک کھیت اور پگڈنڈی پر سے ہوتے ہوئے ایک لکڑی کے پل کے پاس آئے۔ پل پار کرنے کے بعد انہیں ایک فرلانگ اور چلنا پڑا۔ ایک تالاب کے کنارے اونچی اونچی جھاڑیاں اور اس کے قریب ہی درختوں سے گھری ہوئی ایک جھونپڑی میں تین کمرے تھے۔ یہ جھونپڑی رنجن داس کی جھونپڑی کے مقابلے میں بہت بڑی، خوبصورت اور مضبوط بنی ہوئی تھی۔ بستر، برتن، چٹائیاں اور دو چوکیاں بھی تھیں۔ ایک کمرے کو باورچی خانہ بنایا گیا تھا۔ اس میں چولہا، لالٹین، توا اور مرچ مصالحے وغیرہ بھی تھے۔ ہر چیز پر گرد جمی ہوئی تھی جیسے بہت دنوں سے یہاں کوئی رہ نہیں رہا ہو۔

☆......☆......☆

ڈیڑھ گھنٹے تک مسلسل چلتے رہنے کی وجہ سے سپنا کا تھکن سے برا حال ہو رہا تھا۔ اس کے دونوں پیروں میں درد ہو رہا تھا۔ اگر اسے کچھ دیر تک مزید چلنا اور بھاگنا پڑتا تو پھر اس کے لئے ایک قدم اٹھانا بھی دوبھر ہو جاتا۔ اس کی حالت غیر ہو رہی تھی اور سانس بھی بہت بری طرح پھول رہی تھی۔ کوئی ایسی صاف جگہ نہیں جہاں وہ بیٹھ سکے۔ جو جگہ تھی وہ دھول مٹی سے اٹی ہوئی تھی۔ اس لئے وہ دیوار کے سہارے آنکھیں بند کر کے کھڑی ہوگئی اور خود پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگی۔ سپنا کی اس کیفیت کا رنجن داس کو فوراً ہی احساس ہو گیا تھا۔ اس نے جلدی سے ایک میلا کپڑا تلاش کر کے چوکی کی گرد صاف کی۔ پھر اس نے سپنا سے اپنائیت کے لہجے میں کہا۔ ''اب آپ یہاں آ کر بیٹھ جائیں۔''

سپنا چوکی پر دھپ سے بیٹھ گئی۔ اس نے سانسوں کے زیر و بم پر قابو پانے کے بعد پہلے تو ساڑھی کے پلو سے چہرے سے پسینہ پونچھا پھر اپنے بکھرے بالوں کو سمیٹنے اور درست کرنے لگی۔ اس وقت اسے سخت پیاس لگ رہی تھی۔ اس نے پانی کے لئے ابھی تک اس لئے نہیں کہا تھا کہ وہ بھی پسینے میں شرابور ہو رہے تھے۔ تھکے ہوئے تھے۔ ان کی حالت سے اندازہ ہو رہا تھا کہ ان کا بھی پیاس سے برا حال ہو رہا ہے۔ وہ تھوڑی دیر تک پیاس برداشت کر سکتی تھی۔

جمال اور رنجن داس بھی اس چوکی کے دوسرے کنارے بیٹھ کر سستانے لگے۔

کمرے میں گہرا سناٹا تھا۔ وہ تینوں خاموش بیٹھے تھے۔ انہوں نے راستے میں بھی آپس میں کوئی بات نہیں کی تھی اور نہ ہی اس کا کوئی موقع تھا۔ اس لئے کہ دشمن کسی عفریت کی طرح ان کی تلاش میں تھا۔ وہ جلد سے جلد اس کی دست رسائی سے نکل جانا چاہتے تھے۔ اسی میں ان کی عافیت اور سلامتی تھی۔ سب سے زیادہ خطرہ تو سپنا کی ذات کو تھا۔ اس نے موہن کے ساتھ جو سلوک کیا تھا اس نے موہن کو سخت مشتعل کر دیا تھا۔ وہ انتقام لینے کے لئے اندھا ہو

گیا تھا۔ انہیں دشمن سے بہت دور نکل جانا تھا۔ ان کے لئے ایک پل بھی بہت قیمتی تھا۔ دھوپ میں بڑی تمازت تھی۔ اس کے باوجود وہ کسی درخت کی ٹھنڈی چھاؤں میں ستانے کے لئے چند لمحوں کے لئے بھی نہیں رکے تھے۔ سپنا نے بھی رکنے اور ذرا دیر کے لئے دم لینے کے لئے نہیں کہا تھا۔ وہ اس مشکل اور تکلیف کو بڑے صبر و تحمل سے سہتی رہی تھی۔ جمال کو اس بات پر بڑی حیرت اور حد درجہ خوشی محسوس ہوئی تھی۔ ایک نوجوان اور نازک سی حسین لڑکی کا جو شہر اور گھر کے ماحول میں ناز و نعم میں پلی ہو' دشوار گزار راستہ اس طرح سے طے کرنا ناممکن سا تھا۔ اس کے دل کے کونے میں ایک خیال سا آیا کہ ایسی ہی لڑکی بہترین شریک حیات ثابت ہوتی ہے۔

جمال کے ذہن میں بہت سارے سوال کلبلاتے رہے تھے۔ اس نے تھوڑی دیر کے بعد رنجن داس سے پوچھا۔ ''اب تفصیل سے بتاؤ کہ اصل بات کیا ہے۔ تمہیں کس طرح اور کیسے پتہ چلا کہ وہ سپنا کو اغوا کرنے اور مجھے قتل کرنے کے لئے آ رہے ہیں؟''

''مجھے منوہر لعل کے ایک ساتھی سے معلوم ہوا تھا جو اپنی بندوق لینے اپنے گھر جا رہا تھا۔'' رنجن داس نے جواب دیا۔ ''اس نے مجھ سے کہا تھا کہ تمہاری جھونپڑی میں جو لڑکی ٹھہری ہوئی ہے وہ بڑی بدمزاج اور کمینی چیز ہے۔ اس نے بلاوجہ ڈنڈے سے موہن کے دونوں ہاتھ توڑ دیئے اور منوہر لعل کا سر پھاڑنے کے لئے لپکی پھر اس کے شوہر نے ان دونوں پر پستول بھی تان لیا تھا۔ وہ دونوں کسی طرح بھاگ کر نہ آتے تو اس کا شوہر ان دونوں کو گولی مار دیتا۔ اب منوہر لعل اپنی اور موہن کی ذلت کا بدلہ لینے جا رہا تھا۔ ہم چھ سات دوستوں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ لڑکی کو یرغمال بنا لیں گے اور اس کے شوہر کو قتل کر دیں گے لہٰذا تم اپنی جھونپڑی پر نہیں آنا۔''

''اس بدمعاش نے تمہیں جھوٹی اور من گھڑت کہانی سنائی ہے۔'' جمال کو غصہ آ گیا پھر اس نے مختصر طور پر سارا واقعہ رنجن داس کو سنایا۔

''اس نے مجھ سے اس لئے غلط بیانی کی ہو گی میں کوئی مداخلت نہ کروں۔'' رنجن داس بولا۔ ''میں نے جیسے ہی یہ بات سنی فوراً دوڑا ہوا آیا کہ آپ دونوں کو یہاں سے نکال کر لے جاؤں۔ آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ منوہر لعل کیسا خبیث آدمی ہے۔''

سپنا نے اس کی طرف ممنونیت سے دیکھا۔ ''بھیا! آپ نے ہم پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ کاش! میں آپ کو اس کا صلہ دے سکتی۔''

''آپ دونوں میرے مہمان ہیں میں آپ پر آنچ آنے کیسے دیتا؟'' رنجن داس نے انکساری سے کہا۔ ''صلے کا کیا ہے شریمتی جی! وہ کسی نہ کسی صورت میں مل جاتا ہے۔ مجھے اس بات سے بڑی خوشی ہو رہی ہے کہ آپ دونوں دشمن کے ہاتھوں سے محفوظ ہو گئے۔ بھگوان نے میری لاج رکھ لی۔ اب وہ یہاں نہیں پہنچ سکتے۔ اس لئے کہ اس جگہ کا کسی کے فرشتوں کو بھی معلوم نہیں۔''

''تمہارا بہت بہت شکریہ میرے دوست!'' جمال اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر تشکرانہ آمیز لہجے میں بولا۔ ''مجھے اپنی جان کی پرواہ نہیں۔ فکر سپنا کی عزت و آبرو اور زندگی کی ہے۔ میں اپنی جان دے دیتا مگر آخری سانس تک سپنا پر آنچ نہیں آنے دیتا۔ وہ بدمعاش آتے تو ان میں سے ایک بھی زندہ نہیں بچ پاتا۔ میں انہیں خون میں نہلا دیتا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ خون خرابا ہو اور اس کی وجہ سے تم پر کوئی مصیبت نازل ہو۔''

جمال کی بات سن کر اس کا حسین چہرہ تمتما اٹھا۔ دوسرے لمحے اس کی آنکھوں کے گوشے بھیگ گئے۔ دنیا میں ایک ایسی ہستی بھی ہے جو اس کے لئے اپنی جان قربان کر سکتی ہے۔ ورنہ اس دنیا میں کون کسی کا ہوتا ہے۔ ساری دنیا خودغرضی کے رنگ میں لپٹی ہوئی ہے جیسا کہ اس کی ماں کہتی تھی کہ رشتہ دار تو بہت ہیں لیکن انہوں نے اس لئے رشتہ ناطہ توڑ لیا کہ وہ ان کے مقابلے میں کم حیثیت کی تھیں۔

سپنا جمال کی طرف محبت پاش نظروں سے دیکھنے لگی۔ رنجن داس جمال سے بولا۔

''آپ نے بھی مجھ پر بڑا اکرم کیا ہے۔ منوہر لعل اور موہن ایسی گندی حرکت کریں گے مجھے امید نہیں تھی۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ موہن کو تو اس سے بھی کہیں بھیانک سزا ملنا چاہیے تھی۔''

''بھوک اور پیاس سے برا حال ہو رہا ہے۔'' جمال نے کہا۔ ''پہلے پانی کا بندوبست کرو۔ چائے بن سکتی ہے تو چائے پلاؤ پھر کھانے کا بندوبست کرنا۔''

''کچھ فاصلے پر ایک جاننے والے کا مکان اور اس کے قریب بازار بھی ہے۔'' وہ کہنے لگا۔ ''یہاں چائے پتی' شکر اور شاید کافی بھی ہے۔ میں جا کر دودھ اور پانی لے آتا ہوں۔ پھر اس کے بعد کھانے کا بھی بندوبست ہو جائے گا۔''

''ہم ابھی تو جیون پور ہی میں ہیں ناں؟'' جمال نے پوچھا۔ ''یہ جگہ' راستہ اور گاؤں دیکھا بھالا سا لگ رہا ہے۔''

''یہ جیون پور نہیں بلکہ بسنتی نگر ہے۔'' رنجن داس نے کھڑے ہوتے ہوئے جواب دیا اور اس نے سپنا سے پوچھا۔ ''آپ کو کچھ چاہیے؟''

''پیاس کے مارے میرا دم نکلا جا رہا ہے۔'' سپنا گلے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ ''جتنا جلد پانی پلا سکتے ہیں پلا دیں' پلیز!''

''میں تو بھول ہی گیا کہ میرے پاس چیونگم بھی ہیں۔'' رنجن داس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر تین چار چیونگم نکالے۔ اس نے ایک چیونگم جمال کو' دو سپنا کو دیئے اور خود ایک چیونگم منہ میں رکھ کر چبانے لگا۔ ''اس سے بڑی حد تک پیاس کم ہو جائے گی۔''

رنجن داس جھونپڑی سے نکل گیا تو جمال نے تینوں کمروں کی کھڑکیاں کھول دیں تا کہ روشنی اور ہوا آ سکے۔ اندر گھٹن سی ہو رہی تھی۔ رنجن داس نے جس کپڑے سے چوکی صاف کی تھی اس نے اس کپڑے سے اندر کی چوکی اور بستر بھی جھاڑ پونچھ دیئے۔ چوکی پر بستر لگا دیا۔ بستر صاف ستھرا تھا۔ معاً اس کی نظر کھڑکی سے باہر ناریل کے درخت پر پڑی۔ اس میں چھ سات ناریل لگے ہوئے تھے۔ وہ رنجن سے کہہ دیتا تو وہ درخت پر چڑھ کر دو تین ناریل توڑ دیتا۔ اس کے پانی سے پیاس تو بجھ جاتی۔ کھوپرے سے بھوک بھی کسی حد تک مٹ جاتی۔

وہ دوسرے کمرے میں آ کر سپنا سے بولا۔ ''آپ اندر آرام کر لیں۔ رنجن داس کو شاید آنے میں آدھا گھنٹہ لگ جائے باہر ناریل کے ایک درخت پر ناریل لگے ہوئے ہیں۔ میں پہلے دیکھ لیتا تو رنجن داس سے کہہ کر انہیں تڑوا لیتا۔''

''وہ واپس آئے گا تو اس سے جب تڑوا لیں گے۔'' سپنا بولی۔ ''مگر ناریل کو کیسے چھیلتے؟ یہاں شاید کوئی چاقو بھی نہیں ہے۔''

''چاقو تو ہونا چاہیے۔'' جمال اس کمرے میں چلا گیا جسے باورچی خانہ بنا لیا گیا تھا۔ چند لمحوں کے بعد وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک چھرا نما بہت ہی خوفناک قسم کا چاقو تھا۔ اس کی تیز دھار چمک رہی تھی۔ ''یہ رہا چاقو۔'' جمال اسے چاقو دکھاتے ہوئے بولا۔ ''اس سے شاید کٹھل کاٹا جاتا ہے اس لئے اس کی دھار اتنی تیز رکھی گئی ہے۔''

جمال چاقو چوکی پر رکھ کر خود بھی بیٹھ گیا اور پیر سے جوتا نکالنے لگا تو سپنا نے اس سے پوچھا۔ ''کیا آپ تالاب میں نہانے جا رہے ہیں؟''

''نہانے نہیں بلکہ ناریل توڑنے جا رہا ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔

''آپ کبھی ناریل کے درخت پر چڑھے ہیں؟'' سپنا نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے دریافت کیا۔

''اسکول کے زمانے میں' میں اپنے دوستوں سے شرط لگاتا تھا کہ میرے مقابلے میں کوئی درخت پر چڑھ کر دکھائے۔ دوستوں میں مقابلہ ہوتا تھا۔ میں ہمیشہ جیت جاتا تھا۔ یہ دس بارہ برس پہلے کی بات ہے۔ اب اس کی پریکٹس نہیں رہی۔''

''پریکٹس نہیں رہی تو پھر درخت پر چڑھنے کا خطرہ مول کیوں لے رہے ہیں؟ کیا آپ کو ناریل کے پانی کی بڑی طلب ہو رہی ہے؟''

''اپنے لئے نہیں آپ کے لئے ناریل توڑنے جا رہا ہوں۔'' وہ اپنی قمیض کے بٹن کھولنے لگا۔

''میرے لئے؟'' سپنا ششدر سی رہ گئی۔ ''نہیں' نہیں۔'' شدت جذبات سے اس کی آواز بھرا گئی۔ ''آپ میرے لئے اپنی جان خطرے میں نہ ڈالیں۔ آپ کی زندگی مجھے اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہے۔''

''مجھ سے آپ کی یہ حالت دیکھی نہیں جا رہی ہے۔'' جمال نے اس کے چہرے پر اپنی نگاہیں مرکوز کر کے کہا۔

''مجھے کیا ہوا؟'' اس نے تعجب سے پوچھا۔

''آپ اپنی شکل آئینے میں دیکھیں گی تو پتہ چلے گا۔ کئی میل کی مسافت اور بھوک پیاس نے آپ کو نچوڑ کر رکھ دیا ہے۔ پانی ملنے میں جتنی دیر ہوگی اتنا ہی آپ کی جان کو خطرہ بھی لاحق ہو جائے گا۔''

''مجھے کچھ بھی نہیں ہو گا اور نہ ہی میں بھوک پیاس سے مر جاؤں گی۔'' سپنا زیر لب مسکرائی اور پلکیں جھپکا کر بولی۔ ''آپ کی محبت نے مجھے اس قدر مضبوط اور سخت جان بنا دیا ہے کہ میں دس دنوں تک بھی ایسی بھوک پیاس کی شدت برداشت کر سکتی ہوں۔ ابھی تو بمشکل ڈیڑھ دو گھنٹے گزرے ہیں۔''

جمال نے اس کے حسین چہرے پر دھنک کے تمام رنگوں کو پھیلتے دیکھا۔ ''آپ واقعی اس قدر چاہنے لگی ہیں؟''

''اتنا کہ آپ تصور بھی نہیں کر سکتے ہیں۔'' اس نے اپنی نگاہیں نیچی کر لیں۔

''مگر میں تو آپ کے لئے ایک اجنبی ہوں۔ آپ میرے بارے میں کچھ نہیں

جانتی ہیں۔ یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ میں آپ کو محبت کے نام پر فریب دے کر لے جا رہا ہوں اور آپ ہیں کہ میری محبت میں دیوانگی کی حد تک آگے بڑھ گئی ہیں۔''

''کیا یہ بات میرے لئے بہت بڑا اعزاز نہیں ہے کہ آپ نے میرے بارے میں جانے اور پوچھے بغیر مجھے شریک سفر بنانے کا فیصلہ کرلیا۔'' سپنا جذباتی لہجے میں کہنے لگی۔ ''ایک ایسی لڑکی جو ذرہ تھی اسے آپ نے آفتاب بنا دیا۔ میں قطرہ تھی آپ کی وجہ سے موتی بن گئی ہوں اور پھر آپ نے ایک پر خطر راستے پر میرا ہر طرح ساتھ دینے کا وعدہ کیا ہے۔ تو آپ مجھے اپنی جان سے عزیز نہیں ہو سکتے ہیں؟''

''نجانے میں نے اپنی زندگی میں کتنی حسین لڑکیاں دیکھیں۔ ان میں آپ سے بھی کہیں حسین لڑکیاں تھیں۔ ان کا حسن و شباب بے مثل تھا۔ مگر کوئی میرا دل نہ جیت سکی۔ میں نے ان میں اپنے لئے کوئی کشش محسوس نہ کی لیکن جب میں نے آپ کو شکنتلا دیوی کے ہاں دیکھا تو آپ نے میرے من میں جگہ بنالی۔ میرے دل نے کہا۔ سپنا! تم میری ہو مجھے تم سے محبت ہے۔''

سپنا کے چہرے پر ایک عجیب سا نکھار آ گیا۔ اس کی بڑی بڑی حسین آنکھوں میں بہار کے رنگ چھانے لگے۔ جمال اسے دیکھتا رہ گیا۔

دو گھنٹے بیت گئے۔ رنجن داس نہیں آیا تو جمال کو تشویش ہونے لگی۔ سپنا بھی پریشان ہو رہی تھی۔ بار بار ان کی نگاہیں دروازے کی طرف اٹھ جاتی تھیں۔ چیونگم کی وجہ سے تھوڑی دیر کے لئے پیاس کی شدت میں کمی ہوئی تھی مگر اب پھر اس کی شدت میں اضافہ ہو گیا تھا۔ موسم بدل گیا تھا اور حبس ہو رہا تھا۔ ہوا تقریباً بند ہو چکی تھی۔ دھوپ میں بھی بہت تیزی آ گئی تھی۔

سپنا نے اپنا خدشہ ظاہر کیا۔ ''کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ غریب منوہر لعل اور اس کے آدمیوں کے ہتھے چڑھ گیا ہو؟''

''مجھے بھی کچھ ایسا ہی شک ہو رہا ہے۔'' جمال تائیدی لہجے میں بولا۔ ''میں سوچ رہا ہوں کہ اسے دیکھ آؤں۔ کہیں وہ اس پر تشدد نہ کر رہے ہوں؟''

''نہیں، نہیں، آپ نہ جائیں۔ سپنا نے حواس باختہ ہو کر اس کا بازو پکڑ لیا۔ ''کہیں وہ آپ کو......'' اس نے کانپ کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''وہ میرا بال بھی بیکا نہیں کر سکتے۔'' اس نے سپنا کو دلاسہ دیا۔ رنجن داس غیر مسلح

تھا اس لئے وہ ان کے قابو میں آ گیا ہو گا میرے پاس پستول بھی تو ہے۔''
''مگر وہ ایک دو نہیں بلکہ چھ سات مسلح بدمعاش ہیں۔'' سپنا خوفزدہ لہجے میں بولی۔''آپ ایک پستول سے ان سے کیسے مقابلہ کریں گے؟''
''میں مقابلہ کرنے نہیں بلکہ رنجن داس کو تلاش کرنے جا رہا ہوں۔'' جمال نے کہا۔''وہ تعداد میں چھ سات ہوئے تو کیا ہوا۔ ان کے پاس کیسی ہی بندوق کیوں نہ ہوں۔ کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس لئے کہ اصل لڑائی ذہانت سے ہوتی ہے۔ اس بات کا بھی تو امکان ہے کہ رنجن داس آس پاس منڈلاتے دیکھ کر کہیں چھپ گیا ہو اور ان کے ٹلنے کا انتظار کر رہا ہو۔ اگر وہ ان کے ہتھے چڑھ گیا ہوتا تو وہ لوگ اسے یہاں لے کر اب تک پہنچ چکے ہوتے۔''
''میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گی۔'' سپنا اٹھ کھڑی ہوئی۔''مجھے یہاں اکیلے ڈر لگے گا۔''
''تم میرے ساتھ چلنے کے مقابلے میں یہاں زیادہ محفوظ ہو۔'' جمال اسے سمجھانے لگا۔''میں یہاں سے زیادہ دور نہیں جاؤں گا۔ آس پاس ہی رہوں گا اور ادھر نظر بھی رکھوں گا۔''
''آپ اللہ کا نام لے کر جائیں۔'' سپنا بولی۔''میں اندر سے دروازہ بند کر کے رہوں گی۔''
جمال باہر نکلا تو سپنا نے دروازہ بند کر لیا اور دروازے کو ناقدانہ نظروں سے دیکھا۔ یہ دروازہ بے حد مضبوط تھا۔ جھونپڑیوں کے دروازے عموماً اتنے بڑے اور مضبوط نہیں ہوتے۔ وہ بے فکری ہو کر اندر کمرے میں آئی۔ وہ ساڑھی کے پلو کو شانے سے ہٹا کر ٹانگیں پسار کے اور سارے جسم کو ڈھیلا چھوڑ کر بستر پر لیٹ گئی۔ وہ جمال کی واپسی تک سکون اور اطمینان سے لیٹی رہنا چاہتی تھی۔ اس وقت ایک خیال اور ایک نئے احساس نے اس کی ساری بھوک پیاس مٹا ڈالی تھی۔ اس پر ایک عجیب سی سرشاری کی کیفیت طاری ہونے لگی تو اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور رنگین سپنوں کا جال بننے لگی۔ پھر سوچنے لگی۔ اس کی زندگی میں پیار نے دبے پاؤں قدم رکھا تھا۔ جمال نے اسے قبول کر لیا تھا۔ اس کی زندگی پر کوئی داغ دھبہ نہیں تھا مگر کوئی بھی مرد ایسی لڑکی کو قبول کرنے سے ہچکچاتا یا دور بھاگتا تھا جس کا کوئی گھر بار نہ ہو اور مشکل حالات میں گھری ہوئی ہو۔ جس کے اپنانے سے موت کا خطرہ ہو۔ مگر جمال نے اسے اپنی زندگی کا ایک ضروری حصہ بنا لیا تھا اور وہ اس کی شخصیت میں

جیسے جذبات ہو چکی تھی۔ اب جمال اس کے تصور کی طرح صرف اس کا اپنا تھا۔ آج کا دن اور لمحات ان کی محبت کے گواہ تھے۔

جمال سے اس کی بڑے عجیب و غریب حالات میں ملاقات ہوئی تھی۔ اس نے خواب و خیال میں بھی نہیں سوچا تھا کہ یوں اس کی زندگی میں کوئی شخص داخل ہو گا۔ اسے ایسا لگ رہا تھا کہ انہیں اس طرح ملنے اور مکمل ہونے کے لئے تخلیق کیا گیا تھا۔ اب وہ ایک دوسرے کی ذات کا جزو ہیں۔ کوئی طاقت ایک جزو کو الگ نہیں کر سکتی ہے۔ وہ سوچتے سوچتے سپنوں کی وادی میں بہت دور نکل گئی۔

یک لخت اسے کسی آہٹ کا احساس ہوا۔ اس کی چھٹی حس نے اسے بتایا کہ کوئی کھڑکی میں کھڑا اسے دیکھ رہا ہے۔ وہ فوراً سپنوں سے نکل کر حقیقت کی دنیا میں آ گئی۔ خوف کی لہر اس کی ہڈی میں اتر کے اسے دہلانے لگی۔ اس نے تکیہ پر سے گردن گھما کر کھڑکی کی طرف دیکھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ اس وقت ہوا کا ایک آوارہ جھونکا اندر آیا تو اس نے سوچا کہ شاید ہوا کی وجہ سے درختوں کے پتے سرسرائے تھے۔ پھر بھی اس نے بڑی سرعت سے بستر سے نکل کر لباس درست کیا اور لپک کر کھڑکی کے پاس آئی۔ کھڑکی میں کوئی گرل نہیں تھی۔ اس لئے گردن باہر نکال کر دونوں طرف دیکھا کوئی نہ تھا۔ صرف سناٹا اور ویرانی تھی۔ تھوڑی دیر تک اطمینان سے جھانکتی رہی۔ پھر بستر پر آ کر لیٹ گئی۔

☆......☆......☆

جمال بڑے محتاط انداز سے چاروں طرف دیکھتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ بسنتی نگر وہ کوئی دو برس پہلے اپنے ایک دوست کے ہمراہ آیا تھا۔ اس گاؤں کی آبادی زیادہ بڑی نہ تھی۔ پھر بھی اس میں ایک چھوٹا سا ہوٹل اور بازار تھا۔ ایسے ہی کچھ سرحدی گاؤں دو تین میل کے فاصلوں پر واقع تھے۔ ان گاؤں میں چھوٹی موٹی گھریلو صنعتیں بھی تھیں۔ پولیس اور فوج کا گزر بھی ہوتا تھا۔ اس وجہ سے گاؤں کے بازاروں میں کچھ رونق سی رہتی تھی۔ کافی دور نکل آنے کے بعد بھی اسے کسی جگہ بھی ایسے آثار نہیں ملے جس سے دشمن کا پتہ چلتا۔

تھوڑی دور چلنے کے بعد ایک نوجوان چرواہا نظر آیا جو ایک درخت کی گھنی چھاؤں میں بیٹھا ہوا تھا۔ پندرہ سولہ بکریاں گھاس چر رہی تھیں جمال اس کے پاس پہنچا تو وہ اسے کوئی افسر سمجھ کر کھڑا ہو گیا۔ پھر اس نے بڑے مؤدبانہ انداز سے سلام کیا۔ ''سلام صاحب۔''

جمال نے اس کے سلام کا جواب دے کر اس سے پوچھا۔ ''تم یہاں کتنی دیر سے

اپنی بکریاں چرا رہے ہو؟''

''دو گھنٹے سے۔'' اس نے جواب دیا۔ پھر اس سے رازدارانہ انداز سے کہا۔ ''کیا آپ گشتی پولیس والوں کے بارے میں کچھ معلوم کرنا چاہتے ہیں؟''

''نہیں۔'' جمال نے کہا۔ ''کیا تم رنجن داس کو جانتے ہو جو جیون پور میں رہتا ہے اور شہر میں پان لے جا کر بیچتا ہے۔''

''بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔'' رنجن داس کا نام سنتے ہی لڑکے کا منہ بن گیا۔ ''اس نے مجھے اب تک تین بکریوں کے پیسے نہیں دیئے ہیں۔''

جمال زیر لب مسکرا دیا۔ ''تم نے اسے آتے جاتے تو نہیں دیکھا۔''

''نہیں۔'' لڑکے نے سر ہلایا۔ ''میں خود اس کی تلاش میں ہوں تاکہ اس سے پیسے لوں۔ چار مہینے ہو رہے ہیں اسے میرے پیسے ہضم کئے ہوئے۔''

''اچھا تو تم منوہر لعل اور موہن کو بھی جانتے ہو گے جو نمبر دو کے کام کرتے رہتے ہیں؟''

''ان بدمعاشوں کو کون نہیں جانتا ہے۔ گاؤں کے لوگ ان سے ڈرتے بھی ہیں۔''

''تم نے منوہر لعل اور اس کے آدمیوں کو ادھر سے گزرتے ہوئے تو نہیں دیکھا؟''

''نہیں۔'' اس نے اپنا سر ہلایا۔ ''ان دو گھنٹے میں آپ پہلے آدمی ہیں جسے میں نے دیکھا ہے۔ آپ منوہر لعل کو کیوں پوچھ رہے ہیں؟''

''مجھے رنجن داس اور منوہر لعل سے کچھ کام تھا۔ میں ان کی تلاش میں کلکتہ سے آیا ہوں۔ کسی نے کہا کہ وہ بسنتی نگر گئے ہوئے ہیں۔''

''آپ ان بدمعاشوں سے بچ کے رہئے صاب!'' لڑکے نے اسے رازدارانہ انداز میں مشورہ دیا۔ ''آپ بسنتی نگر جا کر کسی سے بھی معلوم کر لیجئے۔ اگر وہ وہاں ہوئے تو پتہ چل جائے گا۔ ویسے یہ لوگ بسنتی نگر آتے ہیں تو کالو میاں کے ہوٹل پر اڈا جماتے ہیں۔''

''جب تم نے انہیں یہاں سے گزرتے نہیں دیکھا ہے تو میں انہیں وہاں جا کر کس لئے تلاش کروں؟''

''بسنتی نگر جانے کے لئے ایک راستہ تو ہے نہیں، کئی راستے ہیں۔ معلوم نہیں وہ کس راستے سے گئے ہوں۔''

”یہاں سے بسنتی نگر جانے کے لئے کوئی مختصر راستہ بھی ہے؟“ جمال نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”آپ سامنے والے کھیت سے چلے جائیں۔“ لڑکا اپنا ہاتھ جنوب کی سمت کر کے کہنے لگا۔ ”اس کھیت کے اختتام پر ناریل اور سپاری کے جو درخت نظر آ رہے ہیں ان کے پیچھے آم کا ایک چھوٹا سا باغ ہے اس میں سے ناک کی سیدھ میں گزر جائیں چند قدم پر لکڑی کا ایک پل ملے گا۔ اسے پار کرنے کے بعد دائیں جانب کیلے کا کھیت ہے اور بائیں جانب بسنتی نگر کی آبادی ہے۔ وہاں سے بازار بھی دکھائی دیتا ہے۔“

”یہ مختصر راستہ تو نہ ہوا۔“ جمال بولا۔ ”یہاں سے ایک دو میل ضرور چلنا پڑے گا۔“

”ارے نہیں صاب۔“ لڑکا ہنس پڑا۔ ”بمشکل چھ سات منٹ کا راستہ ہے۔ کہئے تو میں آپ کو وہاں پہنچا دوں۔“

”نہیں، میں خود چلا جاؤں گا۔“ جمال نے اپنی جیب سے دس روپے کا ایک نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھایا تو اس نے حیرت سے جمال کی شکل دیکھی۔ جمال نے کہا۔ ”اسے تم رکھ لو۔ یہ راستہ بتانے کا انعام ہے اور ہاں تم رنجن داس یا منوہر لعل کو بالکل نہیں بتانا کہ انہیں کوئی تلاش کر رہا ہے اور ان کے بارے میں پوچھ رہا تھا ورنہ تم خود مصیبت میں پڑ جاؤ گے۔“

”بہت بہت شکریہ بڑا صاب!“ لڑکے نے اس کے ہاتھ سے نوٹ لے کر جلدی سے اپنی جیب میں ٹھونس لیا۔ اس کا چہرہ دمک اٹھا تھا۔ ”میں ان کے باپ کو بھی آپ کے بارے میں نہیں بتاؤں گا۔ آپ بے فکر رہیں۔“

جمال عجیب مخمصے میں پڑ گیا کہ وہ بسنتی نگر جائے یا نہیں۔ وہ وہاں سے پانی اور خوردونوش کی چیزیں خرید کر واپس آنا چاہتا تھا۔ اس لئے کہ رنجن داس ابھی نہیں پہنچا تھا اور نہ اس کا دور دور تک پتہ تھا۔ وہ گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب ہو چکا تھا۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ منوہر لعل کے خوف سے کہیں روپوش ہو گیا ہو مگر رنجن داس خود غرض شخص نہیں تھا بھروسے کا آدمی تھا۔ وہ اسے برسوں سے جانتا تھا۔ وہ جب بھی آتا تھا اسے نوازتا رہتا تھا۔ رنجن داس نے مشکل سے مشکل وقت میں اسے سرحد پار کرنے میں مدد دی تھی۔ اس نے سوچا ممکن ہے وہ منوہر لعل کے خوف سے کسی اور راستے سے واپس پہنچ گیا ہو۔ اسے خریداری کرنے اور واپس پہنچنے میں آدھا گھنٹہ لگ جائے گا۔ دور دور تک دشمن کا نام و

نشان بھی نظر نہیں آ رہا ہے۔ رنجن داس نے کہا تھا کہ یہ محفوظ ترین جگہ ہے۔ منوہر لعل کو اس جھونپڑی کے بارے میں معلوم نہیں ہے۔ خوف اور فکر کی کیا بات ہے؟ وہ بادل نخواستہ بسنتی نگر کی طرف چل پڑا۔

مگر اسے بسنتی نگر پہنچنے میں پورا آدھا گھنٹہ لگ گیا۔ یہ ایک چھوٹا سا بازار تھا یہاں روزمرہ کی ہر چیز آسانی سے دستیاب تھی۔ اس نے پہلے تو ایک دکان سے ایک تھرماس اور پلاسٹک کی ایک ٹوکری خریدی۔ کالو میاں کے ہوٹل سے دال' بھات' مچھلی اور مرغی کا سالن پارسل کروایا اور تھرماس میں مٹکے کا پانی بھروا لیا۔ پھر اس نے اپنے لئے ایک گلاس پانی منگوایا۔ جب اس نے پانی کا گلاس اٹھایا تو اس کے تصور میں بھوکی پیاسی سپنا آ کھڑی ہوئی۔ اس نے دل میں سوچا ادھر سپنا کا پیاس سے برا حال ہو رہا ہے۔ پانی کے انتظار میں اذیت ناک لمحات کاٹ رہی ہے۔ کیا اسے پانی پیتے ہوئے اچھا لگے گا؟ یہ خودغرضی نہیں ہے۔ پھر اسے خیال آیا کہ رنجن داس اب تک پانی لے کر پہنچ گیا ہوگا۔ یہ سوچ کر اس نے پانی پی لیا۔

وہ پلاسٹک کی ٹوکری میں تھرماس اور خورد و نوش کا سامان رکھ کر تیزی سے واپس چل پڑا۔ واپسی میں اسے وہ چرواہا لڑکا کہیں دکھائی نہیں دیا۔ دس روپے ملنے کے بعد شاید وہ اس خوشی میں واپس چل پڑا تھا۔ جب اس نے تالاب پر پہنچ کر اپنی دستی گھڑی میں وقت دیکھا تو اسے اندازہ ہوا کہ وہ پورے ڈیڑھ گھنٹے کے بعد واپس ہوا ہے۔ وہ جھاڑیوں کے درمیان کے تنگ اور بل کھاتے ہوئے راستے سے جھونپڑی کے پاس پہنچا تو اس نے دیکھا کہ دروازہ کھلا ہوا ہے۔ اس نے سکون و اطمینان کا سانس لیا۔ رنجن واپس آ گیا تھا اس لئے دروازہ کھلا ہوا تھا۔

جمال دہلیز پار کر کے ایک دم سے ٹھٹھک کر رک گیا۔ اسے ایک ہولناک سناٹے کا احساس ہوا جیسے گھر میں کوئی نہیں ہے۔ کمروں سے نہ صرف ویرانی جھانک رہی تھی بلکہ تینوں کمرے سائیں سائیں کر رہے تھے۔ وہ ٹوکری چوکی پر رکھ کر اندر کے کمرے کی طرف لپکا۔ کمرے میں سپنا نہ تھی نہ رنجن داس تھا۔ اس کا خالی بستر منہ چڑا رہا تھا۔ پھر اس نے دونوں کمرے بھی جھانک کر دیکھ لئے۔ سپنا کا کہیں پتہ نہیں تھا۔ البتہ ہر چیز اپنی جگہ موجود تھی۔ اس کا دستی بیگ چوکی کے نیچے حفاظت سے رکھا ہوا تھا۔ پھر وہ پکارنے لگا۔
''سپنا..... سپنا..... سپنا'' مگر اسے اس پکار کا کوئی جواب نہیں ملا۔

جمال کو دفعتاً یاد آیا کہ رنجن داس نے بتایا تھا کہ جھونپڑی کے پیچھے ایک تالاب

ہے جو اونچی جھاڑیوں سے گھرا ہوا ہے۔ باہر سے اس کا پتہ نہیں چلتا۔ اس تالاب کا خیال آتے ہی جمال اس طرف دوڑ گیا۔ وہ تصور میں سپنا کو تالاب میں نہاتے دیکھ رہا تھا۔ پھر اس کی نظروں میں بھیگا بدن لہرانے لگا مگر سپنا کا وہاں بھی کوئی وجود نہ تھا اور نہ ہی اس کے قدموں کے نشان تھے۔ وہ بے حد پریشان ہوا۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ سپنا کہاں گئی؟ اس کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا؟ اس کے ذہن میں وسوسوں اور اندیشوں کے زہریلے بچھو رینگنے لگے۔ منوہر لعل اور اس کے بدمعاش سپنا کو اغوا کر کے تو نہیں لے گئے؟ مگر ان کی آمد کے کوئی آثار ظاہر نہ تھے۔ وہ آتے تو دروازہ ٹوٹا ہوا ملتا۔ اس کا دستی بیگ بھی موجود نہ ہوتا۔ سپنا یقیناً مزاحمت کرتی اور گھر کی چیزیں الٹ پلٹ پڑی ہوتیں۔ سپنا اتنی آسانی سے ان بدمعاشوں کے ہاتھ لگنے والی شے نہ تھی۔ اس نے دستی بیگ چوکی کے نیچے سے نکال کر دیکھا اسے سپنا نے اس کے سامنے اس چوکی کے نیچے اس طرح سے رکھا تھا کہ کمرے میں داخل ہونے والے کسی شخص کی نظر اس پر اس وقت تک نہیں پڑ سکتی تھی جب تک فرش پر دو زانو ہو کر دیکھا نہ جائے۔ اس میں کپڑوں کی تہہ میں تیس بتیس ہزار کی رقم موجود تھی۔ اس رقم کا علم صرف سپنا کو تھا۔ اس نے رنجن داس کو بتایا نہیں تھا کہ اس میں ایک بڑی رقم رکھی ہوئی ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ سپنا پیاس سے بے تاب ہو کر پانی کی تلاش میں نکل گئی ہو۔

جمال دستی بیگ کو واپس اس جگہ رکھ کر اپنا سر پکڑ کر چوکی پر بیٹھ گیا۔ یک لخت اسے یاد آیا کہ چاقو دکھائی نہیں دے رہا۔ پھر اس نے چاقو کو ہر جگہ دیکھ لیا۔ چاقو اسے کہیں نظر نہیں آیا۔ اس کے دل کے کسی کونے میں شک کی لہر اٹھی۔ کہیں رنجن داس سپنا کو چاقو کے زور پر اغوا کر کے تو نہیں لے گیا ہے؟ مرد کا کیا بھروسہ ہے؟ عورت کے معاملے میں مرد پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ سپنا کوئی معمولی لڑکی نہیں ہے۔ شعلہ مجسم ہے۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ رنجن داس یہاں سپنا کو غیر محفوظ پا کر کسی اور جگہ لے گیا ہو۔ سپنا نے چاقو اپنی حفاظت کے لئے لے لیا ہو مگر یہ دستی بیگ سپنا کیا دانستہ چھوڑ گئی ہے یا پھر اسے عجلت اور سراسیمگی میں لے جانے کا موقع نہیں ملا ہو۔

وہ کسی خیال کے زیر اثر بیرونی دروازے پر آیا۔ کسی کھوجی کی طرح وہ ان کے پیروں کے نشان دیکھنے لگا۔ رنجن داس کے ربڑ کے جوتے تھے۔ سپنا کے چمڑے کے چپل تھے۔ ان کے نشان صاف اور واضح تھے۔ اس نے جھونپڑی کا دروازہ بند کیا اور ان نشانات کی مدد سے آگے بڑھنے لگا جو اس کی رہنمائی کر رہے تھے۔ ان نشانات سے ایسا کچھ محسوس

ہو رہا تھا جیسے تازہ ہیں اور انہیں گئے ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی ہے۔ یہ نشانات ایک بہت ہی پرانے اور ویران مندر پر جا کر ختم ہوئے۔ یہ مندر گو درختوں سے گھرا ہوا تھا لیکن اس کی عمارت کا ایک حصہ دور سے دکھائی دیتا تھا۔ وہ سنبھل کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے کان لگا کر سننے کی کوشش کی۔ گہرے سکوت میں صرف پتوں کے سرسرانے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ اس نے ایک لمحے کے لئے سوچا کہ رنجن داس سپنا کو یہاں کس لئے لے آیا؟ کہیں وہ یہاں سے کہیں اور تو نہیں چلے گئے ہیں؟ اس نے جھک کر نشانات تلاش کرنا شروع کئے۔ کسی اور جگہ اسے پیروں کے نشانات نہیں ملے۔

وہ مندر کی عمارت کی طرف بڑھا۔ زمین پر بہت لمبی لمبی گھاس اگی ہوئی تھی۔ اتنی لمبی گھاس تھی کہ اس میں سے اسے اپنے پیر دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ وہ مندر کے اندر داخل ہوا تو اس کے فرش پر گرد کی موٹی تہہ تھی۔ اس نے پیروں کے نشانات دیکھے جو اس کمرے کی طرف جا رہے تھے جہاں بڑی مورتی رکھی تھی۔ اس کے عقب میں ایک کمرہ تھا جو پجاریوں کے لئے ہوتا تھا۔ وہ اس طرف بڑھنے لگا پیروں کے نشانات اس کمرے کے دروازے پر جا کر ختم ہو گئے تھے۔

جمال نے دروازے سے کان لگا دیئے۔ اندر گہرا سکوت تھا۔ جیسے کوئی نہ ہو۔ اس نے دروازے کا ہینڈل پکڑ کے آہستہ سے گھمایا تو دروازہ کھل گیا۔ اس نے جیسے ہی کمرے میں قدم رکھا اس کا دل دھڑکنا بھول گیا۔ کمرے میں چوکی کے پاس فرش پر ایک لاش منہ کے بل خون میں لت پت پڑی تھی۔ اس نے دیکھا شاید کسی نے اس کا پیٹ چیر دیا تھا۔ اس میں سے خون نکل کر فرش پر پھیل رہا تھا۔ اس سے ایسے لگ رہا تھا جیسے اس قتل کو چند لمحے ہوئے ہیں۔ پھر اچانک کمرے میں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا جیسے قاتل کھڑا ہو۔ اس نے دہشت زدہ ہو کر اس سمت دیکھا تو اچھل پڑا۔ سپنا اپنے ہاتھ میں خون آلود چاقو لئے کھڑی تھی۔ اس کے چہرے پر سفاکی اور آنکھوں میں انگارے دہک رہے تھے۔ سارے جسم کا سارا خون جیسے آنکھوں میں سمٹ آیا تھا۔

جمال کو سپنا کے سفاک چہرے اور اس کی سرخ سرخ آنکھوں سے خوف آنے لگا۔ اس نے اپنی زندگی میں کبھی کسی عورت کا ایسا خوفناک چہرہ اور شعلہ بار آنکھیں نہیں دیکھی تھیں۔ یہ شاداب چہرہ اب نسائیت کی تفسیر نہ تھا بلکہ یکسر بدلا ہوا تھا۔ یہ ایک جنونی قاتل کا چہرہ تھا۔ وہ غضب ناک ہو کر حقارت کی نگاہوں سے فرش پر پڑی لاش کو دیکھ رہی تھی

جو زخموں سے رسنے والے خون میں نہا رہی تھی۔

سپنا بت کی طرح کھڑی تھی۔ اس کی سانسیں ہی نہیں بال اور لباس بھی بے ترتیب ہو رہا تھا۔ اسے جیسے اپنا ہوش نہیں رہا تھا۔ وہ کسی اور ہی کیفیت میں تھی۔ اس نے جمال کو دیکھا تو اس کا حوصلہ اور بڑھ گیا۔ اس کی نس نس میں لہو ابلنے لگا۔ اس پر جیسے پھر سے ایک ہیجانی کیفیت طاری ہونے لگی۔ اس پر خون سوار تھا۔ وہ وحشیانہ انداز سے پھر لاش کی طرف بڑھی تاکہ چاقو کی نوک سے مقتول کے جسم پر ان گنت شگاف ڈال دے۔ جمال نے اس کے تیور بھانپ لئے تو لپک کر اس کا بازو پکڑ لیا۔ "[illegible] نی ہے؟"

"مجھے چھوڑ دو جمال [illegible]" وہ بھری ہوئی شیرنی کی طرح غضبناک [illegible] پوری کرنے دو۔ میں اس کے جسم [illegible] سکوں۔"

[illegible] جھنجھوڑ دیا۔ "رنجن داس مر چکا [illegible]" "مر گیا ہے [illegible]؟" اس کی سانس [illegible] اٹھیں۔

[illegible] دیکھا کہ وہ جنون [illegible] ہو کر [illegible] کھو چکی ہے اور اسے [illegible] تو جمال نے [illegible] طمانچے رسید کر دیئے۔ پھر [illegible] اس [illegible] جمال [illegible] سے گھورا۔ اس نے چاقو فرش پر پھینک دیا اور پھوٹ پھوٹ کر [illegible]۔ جمال نے اسے اپنے بازوؤں کے حصار میں لے لیا اور اسے رونے دیا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کی بھڑاس نکل جائے۔ چند لمحوں کے بعد وہ اس [illegible] بالوں کو سہلانے لگا۔ "سپنا! سپنا! پلیز! اپنے آپ کو سنبھالو۔ یہاں سے نکل چلو۔"

سپنا نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔ وہ اسی طرح پھوٹ پھوٹ کر روتی رہی۔ اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ وہ سمجھ گیا کہ سپنا اس لئے رو رہی ہے کہ وہ رنجن داس کے ہاتھوں بے عزت ہو چکی ہے۔ لٹ جانے کے احساس نے اسے ذہنی صدمے سے دوچار کر دیا ہے۔ اس لئے وہ بے قابو ہو کر رو رہی ہے۔ ایک عورت کے نزدیک عزت و آبرو سے کوئی شے قیمتی نہیں ہے۔

اس کے دل میں نفرت، غصے اور صدمے کی لہر در آئی تھی۔ اسے رنجن داس سے ایسی امید نہیں تھی۔ وہ اپنے آپ کو سپنا کا مجرم قرار دے رہا تھا۔ یہ سب کچھ اسی کی وجہ سے

ہوا تھا۔ وہ یہاں سے نہیں جاتا تو یہ واقعہ ہرگز ہرگز پیش نہیں آتا۔

سپنا کی ہچکیاں دم توڑنے لگیں تو جمال نے اس سے پوچھا۔ ''کیا رنجن داس نے تمہارے ساتھ کوئی بدتمیزی کی ہے؟''

''وہ اپنے ارادے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔'' سپنا نے سسک کر جواب دیا۔ ''وہ کامیاب ہو جاتا تو یہاں اس کے بجائے میری لاش ہوتی۔ اگر میں اسے قتل نہ کرتی تو وہ اپنے گھناؤنے ارادے میں کامیاب ہو جاتا۔''

''تم نے اچھا کیا ایک سانپ کا سر کچل دیا۔'' جمال نے اس کا شانہ تھپتھپایا۔ ''مگر اس کے ساتھ تم یہاں کیوں چلی آئیں؟''

''اس نے مجھ سے آ کر کہا تھا کہ آپ نے مجھے فوراً بلایا ہے کیونکہ اس جگہ پر منوہر لعل اپنے آدمیوں کے ساتھ پہنچنے والا ہے۔''

''چلتے وقت تم نے یہ چاقو لے لیا تھا یا رنجن داس کے پاس تھا؟'' جمال نے اپنے رومال میں اس کے آنسو جذب کرتے ہوئے پوچھا۔

''میں نے ایک انجانے خوف سے یہ چاقو اس کی نظریں بچا کر اپنے کپڑوں میں چھپا لیا تھا۔'' وہ دل گرفتہ لہجے میں کہنے لگی۔ ''یہ میرا محافظ بن گیا۔ میں نے رنجن داس کو بہت سمجھایا کہ وہ اپنے ذلیل ارادے سے باز آ جائے مگر اس نے میری ایک نہیں سنی۔ اس پر جنون سوار ہو گیا تھا۔''

''کیا تم نے چاقو رنجن داس کے سینے میں اتار دیا تھا؟'' جمال نے لاش کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ اسے کچھ اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ سپنا نے مقتول کے جسم کے کس حصے پر چاقو سے حملہ کیا تھا۔ کسی مرد پر ایک ایسی عورت کا چاقو چلانا بڑا مشکل تھا جس نے کبھی مرغی تک ذبح نہ کی ہو۔

''میں نے چاقو [illegible] کے پیٹ میں گھسیڑ دیا تھا۔'' سپنا کے سارے جسم پر نفرت اور غصے کی لہر اٹھی۔

جمال نے وہ خون آلود چاقو فرش پر سے اٹھا لیا جسے سپنا نے پھینک دیا تھا۔ اس نے رنجن داس کی لاش کے پاس جا کر چاقو کو اس کے کپڑوں سے صاف کیا پھر اسے اپنی جیب میں رکھتے ہوئے اس نے سپنا کی طرف دیکھا۔ سپنا کے لباس پر جا بجا خون کے چھینٹے اور کچھ بڑے دھبے پڑے ہوئے تھے۔ انہیں اچھی طرح سے دھو کر ہی صاف کیا جا سکتا تھا۔

وہ اسے سہارا دیتا ہوا کمرے سے لے کر نکلا۔ سپنا صدمے اور تھکن سے اپنے آپ کو بے جان سا محسوس کر رہی تھی۔ اس کے ہاتھوں اپنی عزت و آبرو بچانے کی کوشش میں قتل ہو گیا تھا اس سے وہ اپنے آپ کو قانون کی اور اپنی نظروں میں قاتل سمجھ رہی تھی۔ یہ احساس اسے اندر ہی اندر کاٹ رہا تھا اور اس کے اعصاب کو شکستہ بھی کر رہا تھا۔

سپنا نے چلتے چلتے ایک دم سے رک کر جمال کی طرف پرخیال نظروں سے دیکھا تو جمال نے حیرت سے پوچھا۔ ''کیا بات ہے؟''

''کیا میرا جرم نا قابل معافی نہیں۔'' وہ اپنے نازک اور خوبصورت ہاتھوں کو دیکھنے لگی اسے یہ ہاتھ خون میں رنگے دکھائی دے رہے تھے۔ ''میں نے قانون کو اپنے ہاتھ میں لے کر بہت بڑا جرم نہیں کیا؟''

''تم نے کوئی جرم نہیں کیا ہے سپنا!'' جمال کہنے لگا۔ ''اس لئے کہ اپنی عزت و آبرو بچانے کے لیے تم نے جو کچھ کیا اسے جرم نہیں کہا جاتا۔ اگر تم اپنے آپ کو اس کے رحم وکرم پر چھوڑ دیتیں یا کسی طرح اس کے قابو میں آ جاتیں تو وہ تمہاری عزت تباہ کرنے کے بعد افشائے راز کے خوف سے تمہیں قتل کر دیتا۔ تم اس کا اپنے دل پر اثر مت لو۔ اس واقعے کو ایک بھیانک خواب سمجھ کر بھلانے کی کوشش کرو۔''

سپنا کے دل کو ایک تقویت سی محسوس ہوئی۔ وہ جمال کے سہارے ہی چل رہی تھی۔ اسے بڑا اچھا لگ رہا تھا۔ مندر کی عمارت سے نکل کر وہ اس کے احاطے سے باہر آ گئے۔ جمال نے چلتے چلتے یک لخت ایک جھٹکے سے سپنا کا ہاتھ پکڑ کے ایک طرف کھینچ لیا اور جھاڑیوں کی طرف بڑھ گیا پھر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا تو سپنا نے اسے حیرت اور خوف سے دیکھا۔ جمال کی یہ حرکت اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ جمال نے اپنا منہ اس کے کان کے پاس لا کر آہستہ سے کہا۔

''رک جاؤ۔ دیکھو سامنے کون آ رہا ہے۔''

سپنا ایک دم رک گئی اور اس طرف دیکھنے لگی جس طرف جمال نے اشارہ کیا تھا۔ س نے دیکھا کہ دو سپاہی ایک نازک سی لڑکی کو بڑی بری طرح گھسیٹ کر لا رہے تھے۔ یہ یکھ کر وہ دم بخود رہ گئی۔ پھر اچانک کسی خیال کے تحت جمال سے بولی۔ ''ذرا یہ پستول مجھے کھانا۔''

☆......☆......☆

جمال نے چونک کر سپنا کی طرف اپنی گردن گھما کر دیکھا۔ سپنا کا چہرہ تمتما رہا تھا اور اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں ایک قاتل کی سی چمک تھی۔ وہ سمجھ گیا کہ سپنا کس لئے اس سے پستول مانگ رہی تھی۔ وہ دونوں سپاہیوں کو قتل کر دینا چاہتی تھی جو اس معصوم لڑکی کو قربانی کے جانور کی طرح ہانک کر مندر کی طرف لا رہے تھے اور ان کے ارادے ان کے چہروں سے صاف ظاہر تھے۔ وہ اس پرانے مندر میں محفل نشاط سجانے جا رہے تھے۔ اسے اس بات پر بڑی حیرت تھی کہ قانون کے محافظ ہوتے ہوئے بھی انہیں مندر کے تقدس کا کوئی خیال نہیں تھا۔ اس نے سوچا۔ ہوس کاروں کو بھلا کس بات کا خوف کہاں ہوتا ہے۔ وہ ایک ہی جذبہ رکھتے ہیں اور اس کے حصول کے لئے حیوان تک بن جاتے ہیں۔ ان کے نزدیک قانون اور انسانیت کوئی حقیقت نہیں ہوتی۔ رنجن داس بھی اپنی غرض میں اندھا ہو گیا تھا۔ قدرت نے اسے بڑی بھیانک سزا دی تھی۔

لحہ لحہ ان کے اور سپاہیوں کے درمیان فاصلہ کم ہوتا جا رہا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ قانون کو ہاتھ میں لے اور ان دونوں سپاہیوں کو قتل کر دے مگر اب اسے اس کے سوا کوئی چارہ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس لئے کہ پولیس سپنا کے لباس پر خون کے دھبے دیکھ کر مشکوک ہو جاتی۔ پھر رنجن داس کی لاش ان کے شک و شبہ کو یقین میں بدلنے سے روک نہیں سکتی تھی۔ وہ انہیں گرفتار کرنے پر ہی اکتفا نہیں کرتے بلکہ وہ سپنا سے ایسی بات کا مطالبہ کرتے جسے پورا کرنا ناممکن تھا۔ وہ ان کی کمزوری اور مجبوری سے فائدہ اٹھانے کے بعد رنجن داس کے قتل کے الزام میں حوالات میں بند کر دیتے۔ اسے کسی قیمت پر یہ منظور نہیں تھا کہ وہ اپنے آپ کو قانون کے حوالے کر دے اور سپنا ان کے ہاتھوں تباہ ہو جائے۔

جمال نے ایک پل میں بہت کچھ سوچنے اور مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیتے ہوئے یہ فیصلہ کر لیا کہ ان دونوں سپاہیوں کو موت کے گھاٹ اتار دینا چاہیے اس سے نہ صرف ان کی بلکہ اس معصوم لڑکی کی عزت اور زندگی بھی بچ جائے گی۔ اس نے اپنی جیب سے چاقو نکال کر

سپنا کی طرف بڑھا دیا اور خود پستول نکال کر چوکس ہو گیا۔

وہ دونوں سپاہی جھاڑیوں کے پاس اس جگہ کھڑے ہو گئے جہاں سے جمال جھانک رہا تھا۔ جمال کا دل بڑی تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ لڑکی ان سپاہیوں سے دو قدم کے فاصلے پر کھڑی رو رہی تھی اور اپنے ہاتھ جوڑ کر ان سے رحم کی التجا کر رہی تھی۔

''چوہدری!'' ایک سپاہی نے اپنی جیب سے سگریٹ کی ڈبیا نکالتے ہوئے کہا۔ ''مندر میں دھول مٹی اتنی ہو گی کہ اسے صاف کرتے کرتے پورا دن لگ جائے گا۔ کسی اور جگہ چل یار!''

''تم ٹھیک کہتے ہو۔'' دوسرے سپاہی نے سر ہلایا۔ ''کسی اور جگہ چلتے ہیں مگر کون سی جگہ؟''

''ہم آم کے باغ میں چلتے ہیں۔'' پہلے سپاہی نے کہا۔

''چلو۔'' دوسرے سپاہی نے سرشاری کے لہجے میں کہا۔ ''تم نے یہ بات پہلے کیوں نہیں بتائی۔ ہم نے جگہ کی تلاش میں بڑا وقت ضائع کر دیا۔''

پھر وہ دونوں اس لڑکی کو لے کر دائیں سمت چل پڑے تو چند لمحوں کے بعد جمال نے ایک گہرا سانس لیا۔ ''یا اللہ! تیرا شکر ہے۔''

جمال نے جھاڑیوں کی اوٹ سے نکل کر جھانکا۔ وہ اس لڑکی کو لئے تیزی سے آم کے باغ کی طرف جا رہے تھے۔ ابھی نظروں سے اوجھل نہیں ہوئے تھے۔ انہیں بھی اسی راستے پر چلنا تھا۔ بیچ راستے میں وہ گھر تھا جہاں دستی بیگ رکھا تھا۔ خورد ونوش کی چیزیں اور پانی بھی موجود تھا۔ سپنا کو ابھی تک ایک گھونٹ پانی بھی نصیب نہیں ہوا تھا۔

تھوڑی دیر انہیں اور کربناک انتظار کرنا پڑا تھا۔ جب لڑکی اور دونوں سپاہی آم کے باغ میں داخل ہو کر نظروں سے اوجھل ہو گئے تب جمال سپنا کو لے کر نکلا۔ سپنا چل تو پڑی تھی لیکن اسے پیاس مارے ڈال رہی تھی۔ اس کا حلق سوکھ گیا تھا اور کانٹے سے چبھ رہے تھے۔

گھر کے اندر پہنچ کر جمال نے فوراً پانی کا گلاس اس کی طرف بڑھایا تو اس نے [illegible] میں خالی کر کے ایک گلاس پانی اور مانگا۔ دوسرا گلاس خالی کرنے کے بعد سپنا کی [illegible] جان آ گئی اور وہ توانائی سی محسوس کرنے لگی۔ اس نے چند لمحوں کے بعد پوچھا۔

''یہاں ابھی کتنی دیر اور ٹھہریں گے؟''

جمال نے کچھ دیر سوچنے کے بعد جواب دیا۔ ''دن ڈوبنے تک یا پھر رات گزار کر صبح سورج نکلنے سے پہلے نکلنا ہو گا۔''

''کیا ہم تھوڑی دیر میں یہاں سے نکل نہیں سکتے ہیں؟'' سپنا نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔ ''نجانے کیوں مجھے اس جگہ سے خوف سا محسوس ہو رہا ہے۔''

''ان سپاہیوں کی واپسی تک یہاں سے نکلنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔'' جمال کہنے لگا۔ ''ہمیں اس آم کے باغ کے پاس سے گزر کر ریلوے لائن کی طرف جانا ہے۔ ویسے تمہیں خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ اب میں تمہیں ایک لمحے کے لئے بھی چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔ چلو تم کچھ کھا لو۔''

تھوڑی دیر کے بعد جمال نے باورچی خانے میں جا کر دو تین برتن لئے اور انہیں تالاب کے پانی سے دھو لایا۔ اس کے سوا چارہ بھی نہیں تھا۔ اس کا پانی اتنا گندا نہیں تھا جتنا اس نے سمجھا تھا۔ پھر اس نے چوکی پر کھانا چن دیا۔ دونوں چوکی پر آلتی پالتی مار کر کھانے کے لئے بیٹھ گئے۔ سپنا نے پہلا نوالہ لیا تھا کہ دفعتاً فضا میں ایک دل خراش نسوانی چیخ سنائی دی۔ کوئی عورت چیختی ہوئی اسی سمت میں آ رہی تھی۔ یہ آواز سن کر دونوں اچھل پڑے۔ ان دونوں نے حیرت سے ایک دوسرے کی شکل دیکھی۔ سپنا کھانے سے اپنا ہاتھ روک کر بولی۔ ''یہ اسی لڑکی کی آواز معلوم ہوتی ہے۔ ایسا لگ رہا ہے کہ وہ ان مردوں کے چنگل سے نکل بھاگی ہے اور وہ اس کا تعاقب کر رہے ہیں۔''

''کچھ ایسا ہی معاملہ لگ رہا ہے۔'' جمال نے بھی اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ ''اللہ اس لڑکی پر رحم کرے۔''

سپنا نے چوکی پر رکھا ہوا چاقو اٹھایا جو جمال نے کسی وجہ سے جیب سے نکال کر رکھ دیا تھا وہ ننگے پاؤں ہی دیوانہ وار باہر کی طرف لپکی۔ جمال اسے روکتا ہی رہ گیا۔ سپنا نے کچھ سنا ہی نہیں۔ اس پر جیسے ایک جنون سی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ وہ جتنی دیر میں جوتے پہن کر نکلا اتنی دیر میں وہ تالاب اور جھاڑیوں کی اوٹ سے نکل چکی تھی۔ اس نے کھلی جگہ پر آ کر دیکھا۔ سپنا پگڈنڈی پر کھڑی مخالف سمت دیکھ رہی تھی۔ وہ لپک کر سپنا کے پاس پہنچا' رکا اور سامنے دیکھنے لگا۔ وہی لڑکی بدحواسی کے عالم میں سر پر پیر رکھ کر بھاگتی ہوئی آ رہی تھی اور بار بار مڑ کے بھی دیکھتی جا رہی تھی۔ وہ اکیلی تھی۔ اس کے تعاقب میں کوئی نہ تھا۔

اس لڑکی کی نظر جیسے ہی ان دونوں پر پڑی وہ ٹھٹھک کے رک گئی اور اس نے

دہشت سے پھٹی پھٹی نظروں سے ان دونوں کو دیکھا۔ ایک عورت اور مرد کو دیکھ کر اسے جیسے تحفظ کا احساس ہوا۔ وہ ان کی طرف سراسیمگی سے لپکی۔ چند قدم طے کیے ہوں گے کہ ٹھوکر کھا کر زمین پر گری۔ پھر اٹھ نہ سکی۔ وہ دونوں تیزی سے اس کی طرف دوڑے۔ اس کے پاس جا کر اسے دیکھا۔ وہ بے ہوش پڑی تھی۔

جمال نے اسے اٹھا لیا۔ پھر اسے جھونپڑی میں لا کر اندر والے کمرے میں بستر پر لٹا دیا۔ جمال پانی لانے دوسرے کمرے میں گیا تو سپنا نے اپنی ساڑھی کے پلو سے اس کے ہاتھوں، چہرے اور آنکھوں پر سے دھول مٹی صاف کی۔ اس لڑکی کی ساڑھی پر جو مٹی لگی ہوئی تھی اسے اپنے ہاتھوں سے صاف کرنے لگی۔ جمال تالاب سے ایک برتن میں پانی لے آیا اور لڑکی کے منہ پر چھینٹے مارنے شروع کیے۔ چند لمحوں کے بعد اسے ہوش آنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد اسے جیسے ہی ہوش آیا وہ متوحش نظروں سے ان دونوں کو دیکھنے لگی اور ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھی۔ پھر خوف زدہ سی ہو کر مسکرا کر سمٹ گئی۔

''گھبراؤ نہیں تم پوری طرح محفوظ ہو۔'' جمال نے اسے تسلی دی۔ ''وہ سپاہی کہاں ہیں جو تمہیں آم کے باغ میں لے گئے تھے؟''

لڑکی نے چونک کر باری باری ان دونوں کے چہرے دیکھے۔ وہ حیرانی سے بولی۔ ''آپ کو کیسے معلوم ہوا؟''

''ہم نے تمہیں ان کے ہمراہ جاتے ہوئے دیکھا تھا۔'' سپنا نے جواب دیا۔ ''ہم نے سوچا کہ تمہاری مدد کریں مگر ہم کسی وجہ سے مجبور تھے۔''

''ان دونوں سپاہیوں کو سانپوں نے ڈس لیا۔'' لڑکی مرتعش لہجے میں بولی۔ اس کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ ''اس طرح بھگوان نے مجھے بچا لیا۔''

''انہیں سانپوں نے ڈس لیا؟'' سپنا کو اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا۔ وہ ہکا بکا رہ گئی۔ ''تم سچ کہہ رہی ہو؟''

''ہاں۔'' لڑکی نے سر ہلایا۔

''وہ تمہیں سانپ بن کر ڈسنا چاہتے تھے مگر انہیں سانپوں نے ڈس لیا۔'' سپنا حقارت سے بولی۔ ''قدرت نے ان سے کیسا بھیانک انتقام لیا۔''

''یہ تدبیر کے نہیں تقدیر کے کھیل ہیں۔'' جمال کہنے لگا۔ ''ہم نے اس معصوم لڑکی کو بچانے کی تدبیر سوچی تھی مگر کوئی تدبیر کام نہ آ سکی۔ قدرت کو اس کی زندگی اور عزت و

آبرو بچانا مقصود تھا۔ اس نے فرشتہ اجل کو سانپوں کی شکل میں بھیج دیا۔"

"تمہارا نام کیا ہے؟" سپنا نے اس کے چہرے سے بالوں کو ہٹاتے ہوئے پوچھا۔

"شیتل۔" اس نے جواب دیا۔

"بڑا سندر نام ہے۔" سپنا بولی۔ "یہ کتے تمہیں کس جرم میں پکڑ کے لائے تھے؟"

"میرا کوئی جرم نہیں تھا۔" شیتل بڑے کرب ناک لہجے میں کہنے لگی۔ "چودھری اور دینو ایک نمبر بدمعاش' کمینہ خصلت اور بدکار قسم پولیس والے تھے۔ ان سے پورا گاؤں نالاں تھا۔ کسی غریب اور شریف عورت کی عزت ان سے محفوظ نہیں تھی۔ ذرا ذرا سی بات پر انہیں حوالات میں بند کرنے کی دھمکی دے کر تباہ کر دیتے ہیں۔ جیون پور سے بسنتی نگر اپنے چھوٹے بھائی کے ساتھ اپنی ماسی سے ملنے جا رہی تھی کہ ان دونوں نے ہمیں روک لیا۔ انہوں نے میرے بھائی سے کہا کہ وہ گھر واپس جائے اور اپنی زبان بند رکھے۔ ہم تمہاری بن کو بسنتی نگر پہنچا دیں گے۔ پھر وہ مجھے ادھر لے آئے۔ ان کی نظر مجھ پر بہت دنوں سے تھی۔ میں کئی مرتبہ ان کے ہاتھوں سے بچ نکلی تھی مگر آج ان کے ہتھے چڑھ گئی۔ پھر بھگوان نے مجھے بچا لیا۔"

"دراصل موت انہیں یہاں کھینچ لائی تھی۔" جمال نے کہا۔ "تمہارے گاؤں والوں کو دو زہریلے ناگوں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نجات مل گئی۔"

ان دونوں نے شیتل کو بھی کھانے میں شریک کر لیا۔ کھانے سے فراغت پانے کے بعد اس نے جانے کی اجازت چاہی۔ جمال نے اسے سمجھایا کہ گاؤں پہنچنے کے بعد اسے کیا کرنا ہے۔ اسے سختی سے تاکید کی کہ وہ ان کے بارے میں کسی کو نہیں بتائے گی ورنہ وہ خود کسی مصیبت میں پھنس جائے گی۔ اس لئے کہ وہ بنگلہ دیشی ہیں اور غیر قانونی طور پر سرحد پار کر کے آئے تھے اور اسی طرح واپس بھی جا رہے ہیں۔ پھر انہوں نے باہر آ کر اسے رخصت کیا۔ شیتل رخصت ہوتے وقت بے حد جذباتی ہو گئی تھی۔ اس کی آنکھیں چھلک پڑی تھیں۔ وہ دونوں کھڑے اسے اس وقت تک دیکھتے رہے تھے جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہیں ہو گئی۔ اب اسے اکیلے جاتے ہوئے کوئی خوف نہیں تھا۔ اس لئے کہ اصل سانپ مر چکے تھے۔

جھونپڑی کے اندر آ کر سپنا خاموشی سے بستر پر بیٹھ گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے کہا۔ "اب تو راستہ صاف ہو چکا ہے۔"

"تم تھوڑی دیر تک ستانے کے بعد نہا کر کپڑے بدل لو پھر ہم چلتے ہیں۔"

جمال بولا۔ ''مگر ہمیں ایک رات تو کسی نہ کسی سرحدی گاؤں یا جھونپڑی میں گزارنا ہوگی۔ اس لئے کہ بڑی لمبی مسافت طے کرنی ہے۔ ہم کل ہی بنگلہ دیش پہنچ سکیں گے۔''

''میں چلنے سے نہیں گھبراتی۔'' سپنا زیر لب مسکرا دی۔ ''اب تو مجھے آپ کی رفاقت اور سہارا بھی مل گیا ہے۔''

سپنا جب نہانے کے لئے تالاب پر گئی تو جمال جھاڑیوں کے باہر کھڑا پہرہ دیتا رہا کہ مبادا کوئی ادھر نہ آ نکلے۔ جب وہ نہا کر جھونپڑی میں چلی گئی تو جمال بھی اندر آ گیا۔ نہانے کے بعد سپنا کا چہرہ نہ صرف نکھر گیا تھا بلکہ وہ اپنے آپ کو بے حد ہلکی ہلکی محسوس کر رہی تھی۔ اس کے بالوں کی خوشبو فضا میں پھیل رہی تھی۔ جمال اسے محویت سے دیکھنے لگا۔

''کیا آپ مجھے پہلی بار دیکھ رہے ہیں؟'' سپنا نے انوکھے انداز سے مسکراتی ہوئی بولی۔

جمال چونک کر بولا۔ ''جی ہاں۔ اب تم پہلے سے زیادہ حسین دکھائی دے رہی ہو۔ تم مجھے قطعی مختلف عورت لگ رہی ہو۔''

''میرا خیال ہے کہ اب ہمیں یہاں سے پہلی فرصت میں کوچ کر جانا چاہیے۔'' سپنا کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

''ایسی بھی کیا جلدی ہے۔'' جمال نے کہا۔ ''تھوڑی دیر بعد چلتے ہیں۔ دھوپ کی تمازت میں بھی کمی آ جائے گی۔''

''مجھے جلدی اس لئے ہو رہی ہے کہ کہیں اس مکان کا مالک نہ آ جائے یہاں سے جتنا جلد نکل پڑیں ہمارے لئے اتنا ہی بہتر ہوگا۔

جمال چلنے کی تیاری کرنے لگا۔ اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یہ مکان کس کا تھا وہ نہیں جانتا تھا۔ رنجن داس نے بھی نہیں بتایا تھا اور پھر خطرے کی بو بھی محسوس ہو رہی تھی۔ جمال جیب میں چاقو رکھنے لگا تو وہ بولی۔ ''آپ یہ چاقو تو مجھے دے دیں۔''

''تم اس چاقو کا کیا کرو گی؟'' جمال حیرت سے بولا۔ ''اسے میرے پاس ہی رہنے دو۔''

''کیا معلوم راستے میں کس قسم کے واقعات پیش آئیں۔'' سپنا نے سنجیدگی سے کہا۔ ''میں اس سے اپنی حفاظت تو کر سکتی ہوں۔ میرے پاس بھی کوئی چیز ہونا چاہیے۔ آپ کے پاس تو پستول ہے۔ آپ اس سے مقابلہ کر سکتے ہیں۔''

جمال نے چاقو اس کی طرف بڑھاتے ہوئے اسے سمجھایا۔ ''ذرا ذرا سی بات پر مشتعل ہو کر چاقو نہیں نکالنا۔ صبر و تحمل سے کام لینا۔ جب حالات بے قابو ہو جائیں کوئی اور صورت نہ رہے تب تم چاقو نکال سکتی ہو۔''

''میں آپ کی بات پر عمل کروں گی۔'' وہ بولی۔ ''میں نے رنجن داس کو مجبوراً ہی قتل کیا تھا۔''

جمال اور سپنا جھونپڑی سے باہر نکلے تو بہت ہوشیار، چوکنا اور محتاط تھے۔ ریلوے لائن کی طرف جانے کے لئے وہ مغرب کی سمت چل پڑے۔ سپنا نے اپنے ہاتھ میں ٹوکری اٹھا رکھی تھی۔ اس میں تھرماس تھا۔ تھرماس میں ایک دو گلاس پانی بچا تھا۔ جو کھانا بچ گیا تھا وہ بھی موجود تھا۔ سپنا نے اس خیال سے بچا کھچا کھانا لے لیا تھا کہ آگے چل کر اس کی ضرورت پڑ سکتی تھی اور پھر یہ جنگل خاصا طویل تھا۔ رات کہیں قیام بھی تو کرنا تھا۔

جمال نے چلتے چلتے سپنا کو بتانا شروع کیا کہ ''پانی اور کھانے پینے کی کسی چیز کے لئے فکرمند اور پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ راستے میں دو تین گاؤں اور بھی آئیں گے۔ ان گاؤں کے قریب دو تین جاننے والوں کی جھونپڑیاں بھی ہیں جہاں وہ سکون اور اطمینان سے رات بسر کر سکتے ہیں۔ ایک شخص کے تو بیوی بچے بھی ساتھ رہتے ہیں۔ ان لوگوں کی جھونپڑیوں میں دلال ان قافلوں کو لے کر رات دن ٹھہرتے ہیں جنہیں وہ سرحد پار کرانے کے لئے نکلتے ہیں۔ ان جھونپڑیوں کے مالک کو فی کس پچاس روپے ہندوستانی کرنسی میں ادا کرنا پڑتے ہیں۔ یہ لوگ ہر قسم کی سہولت فراہم کرتے ہیں۔ گشتی پولیس اور فوج سے بھی بچاتے ہیں اور پل پل کی خبر رکھتے ہیں۔''

جمال نے اسے یہ بھی بتایا تھا کہ حالات موافق ہوں تو ایک آدمی کو سرحد عبور کرنے میں چند گھنٹے بھی نہیں لگتے۔ کچھ ایسے شارٹ کٹ راستے بھی ہیں جس سے سرحد عبور کرنے میں صرف بیس پچیس منٹ لگتے ہیں۔ حالات ناسازگار ہونے کی صورت میں بہت لمبا چکر کاٹنا پڑتا ہے جس کی وجہ سے ایک دو دن لگ جاتے ہیں۔ وہ کئی مرتبہ ان شارٹ کٹ راستوں سے سرحد عبور کر چکا ہے پولیس کے آدمی فی کس سو دو سو روپے لے کر بحفاظت سرحد عبور کرا دیتے ہیں۔ اسمگلر اور منشیات فروش ان بے ضمیر پولیس والوں سے بہت فائدہ اٹھاتے ہیں۔

ریلوے لائن کے قریب پہنچنے میں انہیں خاصا وقت لگ گیا تھا۔ حالانکہ جمال

اسے شارٹ کٹ راستے سے لے کر چلا تھا۔ سپنا کے چلنے کی رفتار بہت سست تھی۔ وہ سو پچاس قدم چل کر کسی گھنے درخت کے نیچے کھڑی ہو کر سستانے لگتی تھی۔ راستے میں کہیں کہیں بارش کے پانی کی وجہ سے کیچڑ ہو گئی تھی اور پانی بھی جمع ہو گیا تھا جس کی وجہ سے لمبا چکر کاٹنا پڑتا تھا۔ ریلوے لائن مٹی دھول میں دب کر رہ گئی تھی۔ اس دیش کی آزادی کے بعد ریل گاڑیوں کی آمدورفت کا سلسلہ بند ہو گیا تھا۔ اس کے ساتھ ایک پکی سڑک چل رہی تھی جو پولیس اور فوج کی گاڑیوں کی آمدورفت کے لئے تھی۔ اسمگلروں کی گاڑیاں بھی اسی سڑک سے گزرتی تھیں۔ جمال نے سپنا کو بتایا۔

دھوپ کی تمازت نے پیاس کی شدت اس قدر بڑھا دی تھی کہ سپنا کی طبیعت نڈھال ہونے لگی تھی۔ اس سے جب پیاس برداشت نہیں ہوتی تھی وہ تھرماس سے ایک دو گھونٹ پانی پی لیتی تھی۔ پھر وہ جمال کو بھی پانی پلاتی تھی۔ لمبی مسافت طے کرنے کے بعد سپنا کو کیلے کے کھیت کے پاس ایک جھونپڑی دکھائی دی تو اس کے جسم میں جیسے ایک نئی جان آ گئی۔ پھر اس کی چال میں آپ ہی آپ تیزی آ گئی۔ اسے تیز تیز قدموں سے چلتا دیکھ کر جمال ہنس پڑا۔

''آپ کیوں ہنس رہے ہیں؟'' سپنا چلتے چلتے ٹھٹک کے رک گئی۔

''اس لئے کہ تم تھوڑی دیر پہلے تک جس انداز سے چل رہی تھیں اس سے ایسا لگ رہا تھا جیسے چاندنی رات میں چہل قدمی کر رہی ہو۔''

''ایسی تیز دھوپ میں ناہموار راستے اور پگڈنڈی پر میرے لئے چلنا دوبھر ہو رہا تھا۔ میں کس مشکل سے چلتی رہی ہوں یہ میں جانتی ہوں۔''

''تم مجھے پہلے ہی بتا دیتیں۔'' جمال کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ پھیل گئی۔

''آپ کیا کرتے؟'' سپنا حیرت سے اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگی۔

''میں آپ کو کندھے پر بٹھا لیتا۔'' اس نے شوخی سے جواب دیا۔

سپنا سرخ ہو کر تیز تیز قدموں سے چل پڑی۔ اس نے جمال کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

وہ دونوں جھونپڑی کے پاس پہنچ چکے تھے۔ سپنا نے دیکھا۔ یہ جھونپڑی رنجن داس کی جھونپڑی سے بھی بہت بڑی ہے۔ یہ ناریل، سپاری کے درختوں اور آم کے پیڑوں سے گھری ہوئی تھی۔ جمال نے دروازے پر دستک دی تو چند لمحوں کے بعد دروازہ کھلا۔ ایک

پالیس برس کی عورت دروازے پر کھڑی تھی۔ وہ جمال کو دیکھ کر مسرت آمیز لہجے میں بولی۔ ''جمال صاب! آپ؟'' پھر اس کی نظر سپنا پر پڑی تو وہ چونکی۔ اس کا چہرہ دمک اٹھا۔ وہ سپنا کو دزدیدہ نظروں سے دیکھنے لگی۔ پھر اس نے جمال سے پوچھا۔ ''آپ کی پتنی ہے؟''

''جی چندا بھابھی!'' جمال نے سپنا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ کو ہماری بیگم کیسی لگ رہی ہے؟'' سپنا نے اس کی پسلی میں کہنی ماری۔

عورت نے سپنا کو تعریفی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''بہت ہی سندر ہے۔ کہیں اس چاند کے ٹکڑے کو نظر نہ لگ جائے۔''

''کون آیا ہے؟'' اندر سے ایک مرد کی آواز سنائی دی۔ چند لمحوں کے بعد ایک مرد اس عورت کے پیچھے آ کھڑا ہوا۔ وہ پچاس برس کی عمر کا لگ رہا تھا۔ اس کے سر کے سارے بال سفید تھے۔ کلین شیو تھا۔ گورے رنگ اور مضبوط جسم کا تھا۔ اس کے چہرے پر شفقت تھی اور آنکھوں سے اپنائیت جھانک رہی تھی۔ وہ سمجھ گئی کہ یہ اس عورت کا شوہر ہے۔ عورت اس کی طرف مڑ کے سرشاری سے بولی۔ ''جمال صاب! اپنی دلہن کے ساتھ آئے ہیں۔ دیکھ تو دلہن کتنی سندر ہے؟''

''اچھا! چپکے سے شادی بھی کر لی؟'' مرد اپنی عورت کو ایک طرف ہٹاتے ہوئے جمال سے شکایتی لہجے میں بولا۔ ''بہت اچھا کیا آپ نے شادی کر لی۔'' وہ سپنا کو آشیرباد دینے لگا۔ ''بھگوان! تم دونوں کو سدا سکھی رکھے۔ ہماری بہو تو واقعی بہت سندر ہے۔ اندر آ جاؤ۔'' مرد اپنی عورت کی طرف گھوم گیا۔ ''تم نے انہیں اندر لا کر نہیں بٹھایا۔ دروازے پر باتوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ دیکھ نہیں رہی ہو بے چاری کا گرمی میں کیسا برا حال ہو رہا ہے۔''

''یہ موہنی صورت دیکھ کر کسی بات کا ہوش ہی نہیں رہا۔'' عورت نے آگے بڑھ کر سپنا کے ہاتھ سے ٹوکری لے لی اور اس کا ہاتھ پکڑ کے کمرے میں لے آئی۔ سپنا نے دیکھا۔ اس کمرے کے ایک کونے میں دو مختلف سائز کی چوکیاں لگی ہیں۔ ایک پر صاف ستھرا بستر بچھا ہے۔ دو تکیے ہیں۔ ایک چوکی پر گہرے نیلے رنگ کی دری بچھی تھی اور اس پر دو گاؤ تکیے رکھے تھے۔ ایک بید کی آرام کرسی پاس ہی تھی۔ عورت نے سپنا کو دوسری چوکی پر گاؤ تکیے کے سہارے بٹھا دیا۔ پانی لانے کا کہہ کر اندر چلی گئی۔ جمال سپنا کے قریب، مرد بید کی کرسی پر بیٹھ گیا۔

''جمال صاب!'' مرد نے سپنا کی طرف دیکھا جو ساڑھی کے پلو سے چہرے سے پسینہ پونچھ رہی تھی۔ ''بہو کو اس راستے سے کیوں لے جا رہے ہو؟ سرحدی جھڑپوں کی وجہ سے حالات بہت خراب ہو گئے ہیں۔ دس بارہ دنوں سے سخت کشیدگی ہے۔''

''اچاریہ چچا! کوئی مجبوری تھی جس کی وجہ سے اس راستے سے جانا پڑ رہا ہے۔'' جمال بھی اپنی جیب سے رومال نکال کر پسینہ پونچھنے لگا۔

دونوں سرحدی جھڑپوں اور کچھ دلالوں کی گرفتاری کے بارے میں باتیں کرنے لگے۔ سپنا کے چہرے پر ابھی بھی حیا کی سرخی موجود تھی۔ اس نے عورت کو اندر کے کمرے میں کسی سے سرگوشی کے انداز میں بات کرتے ہوئے سنا۔ چند لمحوں کے بعد وہ کمرے میں نمودار ہوئی تو اس کے ایک ہاتھ میں دو گلاس اور ایک صراحی تھی۔ ایک گلاس اس نے پہلے سپنا کو دیا پھر دوسرا گلاس جمال کو پھر اس نے دونوں پانی سے بھر دیئے۔ سپنا نے پورا گلاس ایک ہی سانس میں خالی کر دیا۔ پانی بہت ٹھنڈا اور میٹھا تھا۔ اس کے سارے جسم میں فرحت اور ٹھنڈک سی پھیل گئی۔ اس کی ساری تھکن دور ہو گئی۔ وہ اپنے آپ کو تر و تازہ محسوس کرنے لگی۔ جب وہ دوسرا گلاس پانی کا پی چکی تو مرد نے عورت سے کہا۔ ''تم جلدی سے چائے بنا دو۔ بہو کا منہ بھی میٹھا کرا دو۔ یہ پہلی بار یہاں آئی ہیں۔''

''یہ ٹوکری اندر لے جائیں۔'' جمال بولا۔ ''اس میں دوپہر کا کھانا ہے۔ میں نے بستی نگر سے کالو میاں کے ہوٹل سے خریدا تھا۔''

تھوڑی دیر کے بعد اندر کے کمرے سے ایک باریش جوان مرد نکل کر اس کمرے میں آیا تو اچاریہ نے اس سے کہا۔ ''آپ جمال صاحب ہیں۔ آپ بھی اپنی پتنی سپنا کے ساتھ کھلنا جا رہے ہیں۔ آپ کل صبح ان کے ساتھ چلے جائیں۔ یہ سکندر صاحب ہیں۔'' اس نے اس جوان کا تعارف جمال سے کرایا۔

اس جوان نے چونک کر سپنا کی طرف دیکھا۔ سپنا کو دیکھا تو وہ دیکھتا رہ گیا۔ ایک لمحے کے لئے اپنے آپ کو بھول گیا۔ دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہو گیا۔ سپنا بھی اسے دیکھ کر اچھل پڑی۔ اس مرد کا اس طرح سے گھور کر حیرت سے دیکھنا اسے سخت ناگوار لگا تھا۔ دوسرے لمحے اسے ایسا لگا کہ اس شخص کو اس نے کہیں دیکھا ہے؟ کہاں دیکھا ہے؟ اسے یاد نہیں آ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں جانی پہچانی سی لگیں۔ وہ چہرے سے اسے اس لئے پہچان نہ سکی تھی کہ اس مرد کا چہرہ داڑھی میں چھپا ہوا تھا۔ کہیں اس نے اس مرد کو شکنتلا دیوی کے ہاں

تو نہیں دیکھا تھا۔

دوسرے لمحے اس نے جمال کی طرف اپنا ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔ مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ میں نے آپ کی بیوی کو کہیں دیکھا ہے۔“

”بنگلہ دیش میں دیکھا ہوگا۔“ جمال نے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے جواب دیا۔

”میں گھوش داس کے پاس جا رہا ہوں۔“ وہ دروازے کی طرف بڑھتے اور سپنا کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”دن ڈوبنے سے پہلے آ جاؤں گا۔“

سکندر کمرے سے نکل گیا۔ سپنا کو اس کی آواز بھی مانوس سی لگی۔ کہیں یہ نوجوان اس کا کالج فیلو تو نہیں ہے؟ شاید ہے۔ تو وہ اسے دیکھ کر بری طرح چونکا اور ٹھٹھکا تھا۔ اس کی آنکھیں حیرت سے یہ جان کر پھیل گئی تھیں کہ وہ جمال کی بیوی ہے۔ اس لئے تو اس کی آواز بھی مانوس سی لگ رہی تھی۔ وہ اس کے کالج کا نہیں ہے تو پھر اس کے محلے کا یقیناً ہوگا۔

”کیا تم اس شخص کو پہچانتی ہو؟“ جمال نے پوچھا۔

”میں شاید اس شخص کو اس کی داڑھی کی وجہ سے پہچان نہیں پا رہی ہوں۔“ سپنا نے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”اس کی آواز مجھے مانوس سی لگ رہی ہے اور وہ اپنی آنکھوں سے مجھے شناسا لگ رہا ہے۔ وہ میرے کالج کا نہیں ہے تو پھر میرے شہر کا ہوگا۔“

”اس کے بشرے اور جملے سے تو ایسا ظاہر ہو رہا تھا جیسے اس نے تمہیں پہچان لیا ہے۔“ جمال بولا۔

”ایک بہت ہی حسین و جمیل عورت کو جو اس کے شہر سے تعلق رکھتی ہو اسے پہچاننا کون سا مشکل ہے۔“ اچاریہ نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔ ”اس لئے اس نے پہچان لیا ہوگا۔ بھلے اس نے ہماری بہو کو ایک بار کیوں نہ دیکھا ہو۔“

”وہ جو بھی ہے جہاں سے بھی تعلق رکھتا ہو مجھے کچھ اچھا آدمی نہیں لگ رہا۔“ جمال نے ناگواری کے لہجے میں کہا۔ ”اچاریہ چچا! ہم اس شخص کو اپنے ہمراہ کسی قیمت نہیں لے جائیں گے؟ آپ اسے ٹال دیں یا کسی اور کے ہمراہ بھیج دیں۔“

”یہ آپ لوگوں کی اپنی مرضی پر منحصر ہے کہ آپ اسے اپنے ساتھ لے جائیں یا نہ لے جائیں۔ نہ تو وہ آپ کو مجبور کر سکتا ہے اور نہ میں۔ میرے خیال میں آپ دونوں کا اس کے بغیر جانا ہی بہتر ہوگا۔“

”اسے یہاں کون لے کر آیا ہے؟“ جمال نے پوچھا۔ ”اس شخص کے بارے میں

آپ کیا جانتے ہیں؟ اسے کب سے جانتے ہیں؟''

''کچھ دنوں پہلے ایک رات وہ گھوش داس کے ساتھ آیا تھا'' اچاریہ نے جواب دیا۔ ''بس میں اسے اس دن سے جانتا ہوں۔ وہ ایک رات میرے ہاں قیام کر کے صبح نکل گیا تھا۔ یہ شخص مجھے اسی وقت مشکوک اور خطرناک قسم کا لگا تھا۔ اس نے مجھے جو کہانی سنائی اس پر مجھے ذرہ برابر بھی یقین نہیں۔ اس نے کہا تھا کہ وہ اپنے کالج کا یونین سیکرٹری ہے۔ اس نے حکومت کے خلاف کوئی تقریر کی تھی جس سے اشتعال پھیل گیا تھا اور ہنگامہ کھڑا ہو گیا تھا جس کی بناء پر اس کے خلاف حکومت نے گرفتاری کا وارنٹ جاری کر دیا تھا۔ وہ کلکتہ جا رہا ہے تاکہ روپوش رہے۔ مگر مجھے اس کی بات کا اعتبار اس لئے نہیں آیا تھا کہ اس کے پاس اسلحہ نہیں تھا۔ تب اس کی داڑھی بھی نہ تھی۔ اب وہ بہروپ بھر کے جا رہا ہے اور اس کے پاس اسلحہ بھی ہے۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ بنگلہ دیش جا کر کچھ ہی دنوں میں واپس آ رہا ہے۔''

''اس نے اپنا نام سکندر بتایا تھا۔'' جمال نے سپنا کی طرف دیکھا۔ ''کیا تم اس نام کے کسی آدمی سے واقف نہیں ہو؟''

''میں اس نام کے کسی شخص کو نہیں جانتی۔'' سپنا نے اپنا خوشنما سر ہلایا۔

''میں نے اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی وحشیانہ چمک دیکھی جس نے مجھے شک میں ڈال دیا ہے کہ کوئی خطرناک بندہ ہے۔'' جمال نے کہا۔

اس وقت چندا بھابھی ایک ٹرے میں مٹھائی اور چائے لے کر آئی تو جمال نے موضوع بدل دیا۔ اس لئے کہ سپنا خائف ہو رہی تھی۔ وہ اس وقت سوچ رہی تھی کہ یہ کون شخص ہے جسے وہ شناخت نہیں کر پا رہی ہے۔ چندا بھابھی نے ٹرے میز پر رکھ دی۔ مٹھائی کی پلیٹ میں سے ایک رس گلہ نکال کر سپنا کی طرف بڑھایا۔ ''چلو جلدی سے منہ کھولو۔''

سپنا چونک کر خیالوں کی دنیا سے نکل آئی۔ پھر اس نے شرماتے اور لجاتے ہوئے مٹھائی کھا لی۔ کسی نئی نویلی دلہن کی طرح لال ہوتے اس نے جمال کی طرف دیکھا۔ وہ اسے محبت پاش نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ جمال کے دل میں اس کے لئے محبت کا جو دریا موجزن تھا وہ اس کی آنکھوں سے عیاں تھا۔ اس نے دل میں سوچا۔ اللہ ان دونوں کی محبت کو سلامت رکھے۔ اسے زمانے کی نظر نہ لگے۔

سہ پہر ڈھلتے ہی حبس بہت بڑھ گیا۔ ہوا بالکل بند ہو گئی تھی جس سے بڑی گھٹن ہونے لگی تھی۔ سپنا کو کپڑے بدن پر چبھتے ہوئے سے لگ رہے تھے۔ اس کا دل نہانے کو چاہ

رہا تھا۔ چندا بھابھی نے اس سے کہا تھا اور آسمان کے آثار بتا رہے تھے کہ شام یا رات کے کسی وقت بارش یا طوفان کا امکان ہے۔ مگر اس وقت تک اس حبس کو برداشت کرنا بہت مشکل ہو رہا تھا۔ اسے بے چین دیکھ کر چندا بھابھی بولی۔ ''سپنا بیٹی! تم نہا کیوں نہیں لیتی ہو۔ آخر یہ تالاب کس لئے ہے؟''

''تالاب کہاں ہے؟'' سپنا نے تعجب سے پوچھا۔ ''راستے میں تو میں نے کوئی تالاب نہیں دیکھا۔''

''بہت بڑا تالاب اس مکان کے پچھواڑے میں ہے۔'' چندا بھابھی نے جواب دیا۔ ''تم اپنے کپڑے لے آؤ۔ میں تمہیں تالاب پر لے چلتی ہوں۔''

سپنا نے دستی بیگ سے وہ جوڑا بھی نکال لیا جو اس نے تالاب میں نہاتے وقت دھویا تھا۔ جس پر رنجن داس کے خون کے دھبے تھے۔ اس نے دھلا ہوا جوڑا بھی نکال لیا۔ چندا بھابھی نے اس کا گیلا جوڑا رسی پر سوکھنے کے لئے پھیلا دیا۔ یہ آنگن بہت بڑا تھا۔ وہ اسے عقبی دروازے سے لے کر تالاب پر لے آئی۔ تالاب واقعی بہت بڑا تھا۔ جھاڑیوں اور درختوں سے گھرا ہوا تھا۔ وہ یہاں بڑی آزادی اور اطمینان سے نہا سکتی تھی۔

سپنا کو چاروں طرف سے گھری ہوئی یہ جگہ اچھی معلوم ہو رہی تھی۔ وہ چند لمحوں تک اچھی طرح سے اس جگہ کا جائزہ لیتی رہی اور اس بات کے اطمینان کرنے کے بعد یہاں کوئی نہیں آ سکتا ہے اس نے اپنے بالوں کو کھول دیا۔ کپڑے پہنے پہنے نہانے اور تیرنے کو اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔ اس نے اپنی اس خواہش کے آگے سر جھکا دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے تالاب میں چھلانگ لگا دی۔ وہ بڑے سکون' آزادی اور اطمینان سے نہاتی' تیرتی اور ڈبکیاں لگاتی رہی۔ تالاب کا ٹھنڈا پانی اس کے بدن کو بہت اچھا لگ رہا تھا۔ اسے ایک انجانی لذت اور فرحت سی محسوس ہو رہی تھی۔

وہ بڑی دیر تک نہاتی رہی اور اس کا جی تالاب سے نکلنے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ نہاتے اور تیرتے ہوئے اسے ایک دم سے احساس ہوا کہ درختوں یا جھاڑیوں کے درمیان سے اسے دو آنکھیں گھور رہی ہیں اس بات کا احساس ہوتے ہی اس کے سارے بدن پر ایک عجیب سی سنسنی دوڑ گئی۔ اس نے متوحش نظروں سے اس سمت دیکھا جہاں گھنی جھاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں اسے وہاں کوئی آنکھیں دکھائی نہیں دیں۔ سپنا نے اس خیال کو واہمہ سمجھ کر جھٹکنے کی کوشش کی اس لئے کہ ان جھاڑیوں کی طرف کون اور کیسے ہو سکتا تھا اور بظاہر ادھر جانے کا

کوئی راستہ بھی دکھائی نہیں دیتا تھا پھر بھی اس کے دل میں ایک خوف دامن گیر ہو گیا پھر اس نے جھاڑیوں میں سرسراہٹ سی سنی تو اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا وہ ایسی حالت میں نہیں تھی کہ تالاب سے نکل کر گھر کی طرف بھاگ سکے اس نے اپنا چاقو کپڑوں میں چھپا کر رکھا ہوا تھا۔ چندا بھابھی نے بھی اس سے کہا تھا کہ وہ بغیر کسی خوف و جھجک کے یہاں نہا سکتی ہے وہ تالاب پر کسی مرد کو آنے نہیں دے گی۔ جمال کو بھی نہیں۔ وہ خوف و وحشت سے سوچ رہی تھی کہ اس نے ایک گلہری کو جھاڑیوں میں سے نکل کر درخت کی طرف لپکتے دیکھا اس نے ایک دم سے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ لیا آنکھیں بند کر کے ایک لمبی سانس لی پھر ہنس پڑی اس گلہری نے تو اس کی جان ہی نکال دی تھی۔

پھر وہ کسی مچھلی کی طرح بڑے اطمینان سے سطح آب پر تیرتی ہوئی درختوں کے جھنڈ کی طرف جا نکلی اور ایک پتھر پر بیٹھ کر ستانے لگی وہ دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی چندا بھابھی نے اسے کہا تھا کہ وہ کچھ کام نمٹا کر نہانے کے لئے آ رہی ہے اسے بیس منٹ ہو گئے تھے نہاتے اور تیرتے ہوئے چندا بھابھی ابھی نہیں آئی تھی۔ ہر طرف ایک گہرا سکوت طاری تھا ہوا بند تھی درخت کے پتے بھی ساکت تھے اسے اپنے دل کے دھڑکنے کی صدا سنائی دے رہی تھی۔ پھر اس نے سنا کہ عقب کے درختوں میں کوئی گہری سانسیں لے رہا ہے وہ اس سے زیادہ فاصلے پر نہیں ہے۔ ایک سرد سی لہر نے اس کے سارے وجود کو ہلا دیا اس نے ایک دم سے پانی میں چھلانگ لگا دی اور ایک طرف تیزی سے تیرنے لگی جہاں اس کے کپڑے رکھے تھے اس نے ایک بار رک کر مڑ کے دیکھا وہاں کسی کا وجود نہیں تھا کہیں یہ اس کا واہمہ تو نہیں؟ وہ سوچنے لگی۔

چند لمحوں کے بعد اس نے چندا بھابھی کو آتے دیکھا تو اس نے اطمینان کا سانس لیا پھر وہ تالاب میں ڈبکیاں لگانے لگی چندا بھابھی بھی تالاب میں اتر گئیں اور اپنے بالوں کی لٹیں کھولنے لگی۔ تھوڑی دیر کے بعد کنارے پہنچ کر اس نے دھلا ہوا لباس پہنا اور اپنے گیلے بالوں کو تولیے سے جھاڑنے لگی۔ معاً اس کی نظر جھاڑیوں کی طرف اٹھ گئی ایک لمحے کو مردانہ جوتا دکھائی دیا دوسرے ثانیے وہاں کچھ نہیں تھا وہ سکتے کی سی حالت میں کھڑی ہو گئی۔ کون ہو سکتا ہے؟ سکندر؟ اس نے سوچا یا واہمہ؟

شام کے وقت بڑے زور کا طوفان آیا یہ طوفان اتنے زور کا بھی نہیں تھا جیسے بنگلہ دیش میں ہر دو چار سال میں آ کر پورے دیش کو تہس نہس کر دیتا اور ہزاروں کو لقمہ اجل بنا لیتا

تھا۔ زوروں کی بارش ہو رہی تھی بار بار بادل کی گرج کے ساتھ بجلی چمک رہی تھی اور رات کا حسن نکھر گیا تھا۔ سپنا کو ایسا لگ رہا تھا اس رات نے اس کے دل میں پیار کی شدت بھر دی ہے خوابیدہ سپنے جاگنے لگے ہیں چندا بھابھی نے رات کے کھانے سے فراغت پانے کے بعد ایک کمرے میں ان کے لئے بستر ٹھیک کر دیا تھا طوفان اور بارش کی وجہ سے سکندر نہیں لوٹا تھا۔

اس کمرے میں بڑی چوکی پر چندا بھابھی نے ان دونوں کے لئے بستر لگا دیا تھا اس کے ایک کنارے پر جمال لیٹ گیا دوسرے کنارے پر سپنا لیٹ گئی بارش ابھی تھمی نہیں تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے آسمان میں ہزاروں چھید ہو گئے ہوں وہ رکنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ کمرے میں گھپ اندھیرا تھا ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا تھا جمال جلد ہی گہری نیند سو گیا تھا اس کی سانسوں کی آواز کمرے کے سکوت میں ڈوب ڈوب کر ابھر رہی تھی اس کی نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی وہ سوچ رہی تھی کہ یہ سکندر کون ہے؟ وہ اسے شناخت کیوں نہیں کر سکی؟ وہ اسے دیکھ کر اس بری طرح چونکا کیوں تھا؟ حسین صورت دیکھ کر کوئی اس طرح چونکتا نہیں ہے پھر وہ جھاڑیوں اور درختوں کے پیچھے چھپ کر اسے تیرتا اور نہاتا ہوا دیکھتا رہا تھا یہ واہمہ نہیں تھا یہ حقیقت تھی اس نے کیسی گری ہوئی حرکت کی اس سے بڑی کمینگی کیا ہو سکتی ہے۔ اس کے دل کے کسی کونے میں نفرت و حقارت کی لہر اٹھی وہ کف افسوس ملنے لگی۔ کاش! وہ اسے واہمہ نہیں سمجھتی۔ اس کے پاس چاقو تھا وہ جھاڑیوں کے پیچھے جا کر اسے قتل کر دیتی اس طرح ایک شیطان اس دنیا سے رخصت ہو جاتا۔

وہ انہی خیالات کے دریا میں غوطہ زن تھی کہ نیند نے اسے دبوچ لیا اس نے نیند کی حالت میں محسوس کیا کہ اس کے چہرے اور آنکھوں پر روشنی پڑ رہی ہے وہ بیدار ہوئی تو اس کا خیال درست تھا۔ روشنی اس کے سراپا پر بکھری ہوئی تھی وہ جیسے ہی ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھی روشنی ایک دم سے غائب ہو گئی کمرے میں گھپ اندھیرا تھا وہ اس لمحے چکرا سی گئی یہ روشنی کہاں سے آئی یہ کس چیز کی روشنی تھی؟ اس نے کھڑکی کی طرف دیکھا کھڑکی سے اندھیرا جھانک رہا تھا اور برستا ہوا سیاہ آسمان دکھائی دے رہا تھا۔

سپنا کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تو اس نے جمال کو بری طرح جھنجھوڑ کے جگا دیا جمال گہری نیند سے ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے سپنا کی طرف دیکھنے لگا اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا اس نے گھبرا کے پوچھا۔ ''کیا بات ہے سپنا؟''

''کوئی کھڑکی میں تھا اور کمرے میں ٹارچ کی روشنی ڈال کر جائزہ لے رہا تھا۔''

سپنا نے خوفزدہ لہجے میں جواب دیا۔

''اتنی رات گئے کون ہو سکتا ہے؟'' جمال نے اپنی دستی گھڑی میں وقت دیکھا رات کے تین بج رہے تھے پھر وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''رات کے تین بج رہے ہیں یہاں چور ڈاکو تو ہوتے ہی نہیں تمہیں وہم ہوا ہوگا' روشنی ٹارچ کی نہیں بجلی کے چمکنے کی ہوگی۔''

اسی وقت آسمان پر بڑے زور کی بجلی چمکی اور اس کی روشنی کھڑکی سے کمرے میں آئی تو ایک پل کے لئے روشنی ہوگئی پھر اندھیرا چھا گیا۔ جمال نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا تو بے حد سرد ہو رہا تھا اس کے ہاتھ کی پشت تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ ''دیکھا تم نے روشنی کس چیز کی تھی؟''

''وہ روشنی بجلی کی نہیں ٹارچ کی تھی۔'' سپنا نے تکرار کی۔ ''کوئی چور ہی تھا' وہ چوری کے ارادے سے آیا تھا ٹارچ کی روشنی سے کمرے کا جائزہ لے رہا تھا اس کی روشنی میرے چہرے پر پڑی تو میری آنکھ کھل گئی اس علاقے میں چور ڈاکو آخر کیوں نہیں ہو سکتے ہیں؟''

''اچھا اب تو بے فکر ہو کر سو جاؤ۔'' جمال نے آہستگی سے کہا۔ ''میں پہرہ دیتا رہوں گا اگر وہ کوئی چور تھا تو شاید پھر آئے۔''

سپنا بستر پر لیٹ گئی۔ جمال کھڑکی میں کھڑے ہو کر باہر جھانکنے لگا سپنا سوچنے لگی کہیں وہ سکندر تو نہیں تھا؟ وہ سکندر تھا تو کس لئے اتنی رات بارش میں بھیگتا ہوا آیا تھا اور کمرے میں جھانک رہا تھا کہیں اسے دستی بیگ کی تلاش تو نہیں تھی؟ سکندر نہیں تھا تو پھر یقیناً کوئی چور ہوگا وہ چوری کے ارادے ہی سے آیا ہوگا وہ اپنے دل کو سمجھاتے ہوئے گہری نیند سو گئی۔

سپنا بیدار ہوئی تو صبح ہو چکی تھی۔ سورج بھی نکل آیا تھا۔ بارش شاید سورج نکلنے سے بہت پہلے تھم چکی تھی۔ اس لئے کہ آسمان صاف تھا اور کسی صاف و شفاف آئینے کی طرح چمک رہا تھا۔ بادل کہیں بھی دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ خوشگوار ہوا چل رہی تھی۔ جمال بستر پر نہیں تھا۔ اس کی باتیں کرنے کی آواز دوسرے کمرے سے آ رہی تھی۔ وہ انگڑائی لے کر اٹھ بیٹھی۔

☆......☆......☆

ناشتہ کرتے وقت چندا بھابھی نے بتایا کہ سکندر صبح سات بجے یہ کہنے کے لئے آیا تھا کہ وہ رات کو گوشی کے دوست کے ہاں رک گیا تھا اور اب وہ اکیلا ہی جیسور جا رہا ہے۔ یہ سن کر سپنا نے سکون کا سانس لیا۔ وہ اس کی صورت تک دیکھنے کی روادار نہیں تھی۔

جمال نے رخصت ہوتے وقت چندا بھابھی کے ہاتھ پر پانچ سو روپے رکھ دیئے۔ چندا بھابھی نے سپنا کا ماتھا چوم کر اس کی بڑی بلائیں لیں۔ اچار یہ ان دونوں کو رخصت کرنے کے لئے تھوڑی دور تک آئے تھے اور پھر آشیر باد دے کر واپس چلے گئے۔

رات کی موسلا دھار بارش کی وجہ سے موسم بہت خوشگوار ہو گیا تھا۔ اس وقت بھی بڑی تیز ہوائیں چل رہی تھیں۔ سپنا کو پلو سنبھالنا دشوار ہونے لگا تو اس نے کمر میں اڑس لیا تھا۔ مگر اس کی زلفیں تھیں کہ بار بار اس کے چہرے پر آ جاتی تھیں۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی جمال کے ساتھ چلی جا رہی تھی۔ راستوں میں کیچڑ اور پھسلن سی ہو رہی تھی۔ چندا بھابھی نے ربڑ کے جوتے دے دیئے تھے اس لئے چلنے میں اس قدر دشواری نہیں ہو رہی تھی۔

کوئی ایک گھنٹے تک مسلسل چلتے رہنے کی وجہ سے سپنا تھک گئی اور اس کے پیر شل ہونے لگے تو اس نے جمال سے کسی جگہ تھوڑی دیر تک ستانے کے لئے کہا۔ جمال اسے لے کر درختوں کے جھنڈ کی طرف بڑھا تو سپنا نے حیرت سے پوچھا۔ ''یہ آپ ادھر کہاں جا رہے ہیں؟''

''ان درختوں کے بیچ ایک چھوٹا سا کوارٹر ہے جو فوجیوں کا ہے۔'' جمال نے جواب دیا اور یہ کوارٹر ہندوستان اور بنگلہ دیش میں جب سرحدی جھڑپیں ہوتی ہیں تب استعمال کیا جاتا ہے۔ میں جب بھی اس راستے سے گزرتا ہوں تو یہاں تھوڑی دیر آرام کر لیتا ہوں۔ بہت کم لوگوں کو اس کوارٹر کا علم ہے۔''

جمال جب اسے لے کر وہاں پہنچا تو سپنا نے دیکھا کہ اس کی عمارت سرخ اینٹوں سے بنی ہوئی ہے اور بہت مضبوط تھی۔ اس کا برآمدہ بڑا کشادہ تھا۔ ایک کمرے کے دروازے پے

پر بڑا سا تالا پڑا تھا۔ برآمدے میں بید کی تین کرسیاں اور ایک میز تھی۔ وہ دھول مٹی سے ا
ہوئی تھیں۔ جمال نے دستی بیگ سے جوتے صاف کرنے کا کپڑا نکال کر دو کرسیوں اور میز
صاف کیا۔ سپنا میز پر ٹوکری رکھ کر کرسی پر بیٹھ گئی۔ جمال نے تھرماس سے پانی نکال کر سپنا
دیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ دونوں چائے پی رہے تھے۔ جمال اس کو بتا رہا تھا کہ یہاں سے ایک
میل کے فاصلے پر بنگلہ دیش کی سرحد ہے۔ ایک بڑا نالہ پار کرنے کے بعد ہم ایک سرحد
گاؤں میں داخل ہو جائیں گے۔ پھر اس گاؤں میں کوئی نہ کوئی سواری مل جائے گی جس
ہم جرنیلی سڑک پر آ جائیں گے اور ٹیکسی سے ہم کھلنا روانہ ہو جائیں گے۔ جیسور سے کھلنا
اڑھائی گھنٹے کا سفر ہے لہٰذا اب منزل بہت قریب ہے۔"

"تمہاری منزل اب کبھی نہیں آئے گی مسٹر جمال!" اچانک ایک تیز و تند آواز فض
میں گونجی تو وہ دونوں اچھل پڑے۔ سپنا کے ہاتھ سے چائے کی پیالی چھوٹتے چھوٹتے بچی۔
اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ ان دونوں نے بوکھلا کر آواز کی سمت دیکھا سکندر عمارت
کے عقب سے نکل کر برآمدے کی طرف آ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں خوفناک قسم کا ریوالور تھ
اور اس کے ہونٹوں پر استہزائی مسکراہٹ ناچ رہی تھی اور آنکھوں سے سفاک چمک عیاں
تھی۔ "میں تمہاری منزل کو لے جانے آیا ہوں۔"

ان دونوں پر ایک لمحے کے لئے سکتہ چھا گیا۔ وہ دم بخود سے بیٹھے رہے۔ چند
لمحوں کے بعد جمال تیز لہجے میں بولا۔ "یہ کیا بدمعاشی ہے؟"

"یہ بدمعاشی نہیں ہے۔" وہ جمال کو حقارت سے دیکھتے ہوئے بولا۔ "بدمعاشی تو
تم نے میرے ساتھ کی ہے تم نے مجھ سے سپنا کو چھین لیا ہے۔"

"تم سپنا کو جانتے ہو؟" جمال حیرت سے بولا۔

"سپنا کو کومیلا کا کون شخص نہیں جانتا۔" سکندر، سپنا کو گہری نظروں سے دیکھنے لگا تو
وہ اس کی سفاک نظروں کی تاب نہ لا سکی۔ "سپنا تو میرا سپنا تھی۔ میرے اس سپنے کو تم نے
چھین لیا۔ اب میں تمہارا سپنا چھین لوں گا۔ سپنا صرف میری ہے۔ وہ کسی اور کی نہیں ہو سکتی
ہے۔"

"تم یہ مت بھولو کہ سپنا میری بیوی ہے۔" جمال نے برہمی سے کہا۔ "تم میری
سپنا کو مجھ سے چھین نہیں سکتے؟"

سکندر حقارت آمیز انداز میں ہنسنے لگا۔ "اس خوش فہمی کو دل سے نکال دو۔ یہ بھول
کہ سپنا تمہاری بیوی ہے۔ ویسے مجھے سپنا سے ہرگز ہرگز ایسی امید نہیں تھی کہ وہ تم سے

شادی کرے گی۔ کتنے دکھ اور حیرت کی بات ہے کہ اس نے میری محبت کی کوئی قدر نہیں کی۔
میری محبت کو بڑی بے رحمی سے کچل دے۔ یہ بے وفا نکلی۔ اس کے باوجود دل میں اس کی
چاہت کم نہیں ہوئی ہے۔''

''تم سپنا پر بہتان لگا رہے ہو۔'' جمال بھڑک اٹھا۔ ''اس نے نہ تو تم سے کبھی
محبت کی اور نہ ہی وہ تمہیں جانتی ہے۔''

''سپنا!'' سکندر نے اسے محبت پاش لہجے میں کہا۔ ''تم اپنے شوہر سے صاف
صاف کہہ دو' ڈرو نہیں اسے بتا دو کہ تم مجھ سے کتنی شدید محبت کرتی تھیں۔''

''میں تو تمہیں جانتی تک نہیں۔'' سپنا اپنی آواز کی لرزش پر قابو پا کر بولی۔ ''میں
نے کل تمہیں پہلی بار دیکھا تھا۔''

''کیا کہا......؟'' سکندر کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ ''تم نے مجھے نہیں
پہچانا' حیات کو نہیں پہچانا جس نے تمہاری محبت کے حصول کے لئے اپنے دوست شکیل کو قتل کر
دیا پھر وہ تمہاری محبت میں دیوانہ ہو کر کتنے سارے خطرات مول لے کر تمہیں حاصل
کرنے......''

''تم......تم حیات ہو۔'' سپنا اچھل پڑی۔ اسے جیسے یقین نہیں آیا۔ ''مگر میں نے
تم سے کبھی محبت نہیں کی؟''

'ہاں' میں حیات ہوں۔'' وہ مسکرایا اور جمال سے بولا۔ ''دیکھا تم نے میری
سپنا نے بالآخر اقرار کر لیا۔''

''اس نے شناخت کا اقرار کیا ہے محبت کا نہیں۔'' جمال نے تلخی سے کہا۔

''ایک بیوی اپنے شوہر کے سامنے کسی غیر مرد سے اپنی محبت کا اظہار کیسے کر سکتی
ہے؟ یہ مشرقی عورت ہے مغربی نہیں؟''

''ذلیل' قاتل' کمینے۔'' سپنا برافروختہ ہو گئی۔ ''میں نے جس شخص پر کبھی تھوکنا بھی
پسند نہیں کیا اس سے کیسے محبت کر سکتی ہوں؟''

''خدا کے لئے دل شکن باتیں نہ کرو سپنا! شکیل کو کیا میں نے تمہاری خاطر قتل نہیں
کیا؟ اب تم میری محبت کا یہ صلہ دے رہی ہو۔ تم میری خاطر اپنے شوہر کو چھوڑ نہیں سکتی ہو۔''

''بہتر یہ ہے کہ تم میری نظروں کے سامنے سے دفع ہو جاؤ۔'' سپنا ایک جھٹکے سے
کھڑے ہو کر ہذیانی لہجے میں بولی۔ ''میں نے تم سے کبھی محبت کی اور نہ میں نے تمہارے
بارے میں سوچا۔ میں مر جاؤں گی مگر میں تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گی۔''

''مسٹر جمال!'' اس نے ریوالور کی نال کا رخ جمال کی کھوپڑی کی طرف کرتے ہوئے کہا۔ ''میں وقت ضائع کرنا نہیں چاہتا' ویسے بھی فضول اور بے نتیجہ باتوں میں بہت وقت ضائع ہو چکا ہے۔ تم اپنی بیوی کو ابھی اور اسی وقت طلاق دے دو۔'' ''یہ کیا بکواس ہے میں اسے طلاق کیوں دوں۔''

''لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے ہیں۔'' اس نے ایک قہقہہ لگایا۔ پھر اس نے عمارت کے عقبی حصے کی طرف منہ کر کے آواز دی۔ ''نیاز! آ جاؤ' جلدی سے آ کر اس کی مشکیں کس دو۔''

چند لمحوں کے بعد ایک شخص ایک ہاتھ میں ریوالور اور دوسرے ہاتھ میں رسی لئے داخل ہوا تو سپنا اس کی شکل دیکھ کر چونک پڑی۔ نیاز اس کے شہر کا خطرناک بدمعاش تھا۔ دن دیہاڑے کسی عورت کو اغوا کرنا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ اس نے قتل کی وارداتیں بھی کی تھیں۔ اس کے نام سے ہر شریف آدمی خوف کھاتا ہے۔ اسے دیکھ کر سپنا کے حواس معطل ہونے لگے۔ اس کے جسم پر لرزہ طاری ہو گیا۔ اب دو مسلح اور خطرناک بدمعاشوں نے انہیں اپنے حصار میں لے رکھا تھا۔ وہ بے بس ہو گئے تھے۔ جمال اب اپنا پستول بھی نکال نہیں سکتا تھا۔ بیک وقت دو بدمعاشوں سے مقابلہ کرنا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ اسے تھوڑی سی مہلت درکار تھی جس سے فائدہ اٹھا کر ان دونوں پر فائر کر سکے مگر اس کے آثار دور دور تک نہ تھے۔

ریوالور کی نالیں انہیں گھور رہی تھیں۔ حیات کے اشارے پر نیاز نے آگے بڑھ کر جمال کی مشکیں کس دیں اور اسے برآمدے کے فرش پر ڈال دیا۔ حیات نے بھی نیاز کی مدد کی تھی۔ سپنا دیوار سے لگی کھڑی کسی بے بس ہرنی کی طرح یہ تماشہ دیکھ رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ اس کے لئے فرار ہونا اتنا آسان نہیں تھا اس لئے کہ دشمن دو تھے وہ سوچ رہی تھی کہ کیوں نہ چاقو نکال کر وہ اپنا خاتمہ کر لے ان درندوں کے ہاتھوں اسے اپنی زندگی اور عزت بچانا بہت مشکل تھا۔ اس کے دل کے کسی کونے میں ایک نادیدہ آواز نے اسے مشورہ دیا کہ جلد بازی کی کوئی ضرورت نہیں۔ وہ تدبیریں سوچے اور تقدیر کا فیصلہ بھی دیکھے کہ وہ کیا کرتی ہے تقدیر نے شیتل کو بچایا تھا وہ بھی اسے بچا سکتی ہے۔ اس کی ذات پر یقین کرنے کی ضرورت تھی جو مارنے والے سے بڑا تھا۔

حیات نے جمال سے بڑے سفاک لہجے میں کہا۔ ''میری محبوبہ کے پیارے شوہر! میں تمہیں قتل نہیں کروں گا۔ میں تمہاری جان بخشی کا وعدہ کرتا ہوں۔ میری دلی تمنا ہے کہ تم

ہزار برس زندہ رہو۔ ہر برس کے دن ہوں پچاس ہزار تا کہ تم سپنا کی یاد میں جلتے اور تڑپتے رہو۔ تمہیں معلوم ہے کہ ہجر کے دن کیسے قیامت کے ہوتے ہیں۔ فراق کی راتیں کتنی طویل اور عذاب ناک ہوتی ہیں اور پھر تم اپنی ان گناہ گار آنکھوں سے دیکھو گے کہ میں تمہاری پیاری بیوی کے ساتھ کیسا جشن مناتا ہوں۔ جشن کا ایک ایک لمحہ تمہارے دل میں کسی خنجر کی طرح کاٹتا ہوا اتر جائے گا۔ یہ میں اس لئے کرنا چاہتا ہوں کہ تم نے سپنا کے خوبصورت جسم کو اپنی ملکیت بنا لیا تھا جبکہ یہ صرف میرا حق تھا تمہیں اس خیانت کی سزا ملنا چاہیے جس طرح خون کا بدلہ خون ہوتا ہے اسی طرح خیانت کا بدلہ خیانت ہوگا۔''

''مگر تم یہ بات بھول رہے ہو کہ سپنا ایک عورت ہے۔'' جمال نے اسے ساکت پلکوں سے دیکھا۔ ''تم عورت کے جسم پر تو حکومت کر سکتے ہو' دل پر نہیں۔ جبر و زبردستی' ظلم و ستم اور ایذا رسانی سے تم اسے محبت کرنے پر مجبور نہیں کر سکتے۔ تم یہ بات بھول رہے ہو کہ عورت بظاہر بڑی نازک اور کمزور ہوتی ہے مگر جب وہ انتقام پر آتی ہے تو اس کے آگے کوئی ٹھہر نہیں سکتا اس نے انتقام کے جنون میں بڑی بڑی سلطنتیں تباہ کر دیں بھلا تم کیا چیز ہو اس کے سامنے۔''

''وہ سب قصہ کہانیاں ہیں ان کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔'' وہ ہنسا۔ ''ہاتھ کنگن کو آرسی کیا' میں بھی دیکھ لیتا ہوں کہ یہ نازک اور بے حد پیاری سی عورت کس طرح سے مجھ سے انتقام لیتی ہے اور اپنے آپ کو میرے جنون سے بچاتی ہے۔ تم بھی دیکھ لینا۔''

حیات نے جمال کے جواب کا انتظار نہیں کیا وہ سپنا کے پاس آ گیا جسے نیاز پستول کی زد میں لئے کھڑا تھا اس سے اپنی نگاہیں نہیں ملا رہی تھی۔ اس کے پاس ایسی چیز نہیں تھی جس سے وہ آنکھوں کو پھوڑ سکے۔ حیات نے نیاز کے پاس آ کر کہا۔ ''یار! ذرا اس کمرے کا تالہ توڑ کر اندر جاؤ اور جائزہ لو اور دیکھو کہ یہ جگہ کس حد تک استعمال کے قابل ہے۔''

نیاز نے دروازے کے پاس جا کر ریوالور سے ایک فائر تالے پر کر دیا۔ تالہ کھل گیا۔ نیاز نے تالہ نکال کر فرش پر پھینک دیا پھر اس کی کنڈی کھول کر اس نے ایک زوردار لات مار کر دروازہ کھول دیا۔ حالانکہ اس طاقت کے مظاہرے کی ضرورت نہ تھی۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر سپنا نے جمال کی طرف دیکھا۔ جمال نے آنکھوں سے اشارہ کیا۔ اسے ہمت اور ذہانت سے دشمن کے عزائم کو ناکام بنانے کی تلقین کی۔

نیاز اندر چلا گیا تو حیات سپنا کے روبرو آ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ اس کی آنکھوں میں

آنکھیں ڈال کر فاتحانہ انداز سے مسکرایا۔ ''کل میں نے تمہیں تالاب میں دیکھا تھا دراصل میں وہاں اس لئے آیا تھا کہ تمہیں تالاب سے اغوا کر کے لے جاؤں مگر چندا بھابھی کے آنے اور تمہارے چوکنا ہونے سے سارا معاملہ چوپٹ ہو گیا۔ دراصل مجھے تاخیر اسی لئے ہو گئی تھی کہ میں تمہارے جادو سے مسحور ہو کر اپنے آپ کو بھول گیا تھا۔ پھر میں اسی جادو کا نظارہ کرنے رات کو آیا تھا۔ میری آنکھیں پوری طرح سیراب بھی نہیں ہو پائی تھیں کہ تم ٹارچ کی روشنی سے بیدار ہو گئیں پھر مجھے لوٹ جانا پڑا مگر اب اس وقت مجھے کسی ناکامی کا منہ دیکھنا نہیں پڑے گا۔''

''یہ تم تھے ذلیل' کمینے......'' سپنا نے اسے شعلہ بار نگاہوں سے دیکھتے ہوئے اس کے منہ پر تھوک دیا۔

''ہاں وہ میں تھا......'' وہ بے عزتی پر ہنسا۔ اس نے اپنے بائیں ہاتھ کی آستین سے پسینے کو صاف کرتے ہوئے کہا۔ ''سپنا جانی! میں کوشش کروں گا کہ تمہاری نفرت محبت میں بدل جائے۔ میں اپنے خوابوں کی تعبیر پانے کے لئے بہت کچھ کر سکتا ہوں۔ تمہارے قدموں میں اپنا سر بھی رکھ سکتا ہوں۔''

''کبھی تم نے یہ سوچنے کی کوشش کی کہ خواب کی تعبیر کبھی کسی کو ملی ہے؟'' وہ نفرت سے بولی۔

''یہ جو تم اچانک اور غیر متوقع مل گئی ہو کیا یہ میرے خواب کی تعبیر نہیں ہے؟'' وہ ہنسا۔

''یہ تعبیر نہیں ہے بلکہ تمہاری موت ہے جو تمہیں یہاں کھینچ لائی ہے۔'' سپنا نے برہمی سے کہا۔ ''میری تعبیر تو جمال تھا جو مجھے مل گیا۔ تم اچھا نہیں کر رہے ہو حیات مجھ سے دشمنی مول لے کر' اس لئے کہ دنیا میں عورت سے زیادہ خطرناک کوئی شے نہیں ہے۔''

اسی وقت نیاز کمرے سے نکلا تو حیات کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ نیاز کا چہرہ دمک رہا تھا اس کے ہاتھ میں شراب کی بوتل تھی جس میں تھوڑی سی شراب تھی۔ اس نے شراب کا ایک گھونٹ لینے کے بعد سپنا کو بھوکی نظروں سے دیکھا پھر وہ حیات سے بولا۔ ''ایک کمرے میں ایک لمبی چوڑی مسہری نرم و گداز بستر موجود ہے اور چادریں ہیں۔ باورچی خانہ بھی ہے اور اس میں کچھ برتن بھی۔ اس کے علاوہ نشست گاہ بھی ہے یہاں رات بڑے سکون اور آرام سے گزاری جا سکتی ہے۔ مگر پورے گھر کی صفائی کرنا ضروری ہے۔ ایسا لگ رہا ہے کہ یہ گھر ایک دو برس سے مقفل پڑا ہے۔''

''کیا شراب کی بوتلیں بھی ہیں؟'' حیات نے پوچھا۔ ''یہ بوتل کہاں سے ملی؟''

''شراب کی چھ سات خالی بوتلیں پڑی ہیں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''صرف ایک بوتل تھی جس میں اتنی ہی شراب تھی۔ اس کے علاوہ فرش پر بہت ساری چوڑیاں ٹوٹی ہوئی پڑی ہیں۔ ایسا لگ رہا ہے کہ یہ عشرت کدہ ہے کوئی فوجی کوارٹر نہیں ہے۔''

''تم سپنا سے پورے گھر کی صفائی کرواؤ۔'' حیات نے رعونت سے کہا۔ ''میں گاؤں جا کر شراب اور سوڈے کی بوتلیں لے کر آتا ہوں۔ شاید مچھلی یا تلی ہوئی مرغی مل جائے پھر دو دن کے کھانے کا راشن بھی تو چاہیے۔''

''گاؤں میں شراب اور سوڈے کی بوتل مل جائے گی؟'' نیاز نے حیرت سے کہا۔

''شراب ہی نہیں زہر بھی مل جاتا ہے۔'' حیات بولا۔ ''اسی گاؤں میں شراب کی بھٹی ہے اس میں روز ہی شراب کشید کی جاتی ہے۔ دو تین سپیرے بھی رہتے ہیں ان کے پاس سانپوں کا زہر ہوتا ہے جوان اور حسین لڑکی بھی مل سکتی ہے کہو تو تمہارے لئے ایک لڑکی لیتا آؤں۔''

''اس چاند کے ہوتے ہوئے لڑکی کی کیا ضرورت ہے۔'' نیاز سپنا کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''ایسی خوبصورت لڑکی تو پورے بنگلہ دیش میں نہیں ملے گی۔''

حیات نے چونک کر نیاز کی صورت دیکھی۔ اس کی آنکھوں میں شیطانیت دیکھ کر بولا۔ ''نیاز! میں نے تم سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ سپنا کے بارے میں تم سوچو گے بھی نہیں۔ میں نے تمہیں دس ہزار ٹاکا اسی لئے دیئے ہیں کہ تم اسے اغوا کر کے کلکتے پہنچاؤ گے۔ اسی لئے تمہیں ساتھ لے جا رہا تھا اسے دیکھ کر تمہاری نیت میں فتور آ رہا ہے یہ سراسر غلط بات ہے۔''

''غلط کیا ہے صحیح کیا ہے یہ میں نہیں جانتا۔'' نیاز نے بے پروائی سے کہا۔ ''تم جانتے ہو میں بھی اس کے دیوانوں میں سے رہا ہوں اسے دیکھ کر میں بھی تو آہیں بھرتا تھا اب تمہیں بتاؤ اسے دیکھ کر دل میں فتور پیدا نہیں ہوگا تو کیا ہوگا؟ یہ چیز ہی ایسی ہے۔''

''میں اسے بیوی بنانے کے لئے لے جا رہا ہوں نا کہ غیر قانونی بیوی بنانے۔'' حیات نے تلخی سے کہا۔ ''میں کیسے چاہوں گا کہ تم میری ہونے والی بیوی پر بری نگاہ ڈالو۔ یہ میری عزت اور محبت ہے۔''

''مگر یہ اب کسی اور کی بیوی ہے۔'' نیاز نے تیزی سے کہا۔ ''کسی کی بیوی پر تم تصرف حاصل کرنا چاہتے ہو تو مجھے بھی اس کا حق حاصل ہے۔ تم اپنے دس ہزار ٹاکا اپنے

پاس رکھو۔'' نیاز نے اپنی جیب سے اس کی رقم نکال کر اس کی طرف اچھال دی۔

حیات نے لپک کر نوٹوں کی گڈی پکڑ لی پھر کچھ سوچ کر اس نے رقم نیاز کی طرف بڑھا دی۔ ''اسے تم رکھو۔ مگر تم اسے میری واپسی سے پہلے ہاتھ نہیں لگاؤ گے میں تمہارا حق محفوظ رکھتا ہوں۔''

''بہت خوب۔'' نیاز خوش ہو گیا۔ ''مجھے تم سے یہی امید تھی۔''

''تم سپنا سے ہوشیار رہنا۔'' حیات نے اسے تنبیہہ کی۔ ''یہ ایسی نہیں ہے جیسی دکھائی دیتی ہے' زہریلی ناگن ہے' تمہیں ڈسنے کی کوشش کرے گی حسن و شباب کا جادو چلائے گی' فریب دے گی' تم اس کے جال میں پھنس گئے تو پھر موت تمہارا مقدر بن جائے گی۔''

''کیا میں کوئی بچہ ہوں جو تم مجھے نصیحت کر رہے ہو۔'' نیاز ہنسا۔ ''میں اب تک کوئی دو درجن عورتوں کو اغوا کر کے یرغمال بنا چکا ہوں کتنی ہی عورتوں نے مجھے فریب دینے کی کوشش کی تھی مگر ان میں سے کوئی بھی کامیاب نہ ہو سکی بھلا یہ کیا دھوکہ دے گی؟''

حیات باہر نکل گیا۔ ادھر نیاز نے سپنا سے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''مہارانی جی! اندر چلیں جلدی سے صفائی کر دیں کمروں کی۔''

سپنا نے چوں چرا نہیں کی۔ اس نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے پہلے جمال کی طرف دیکھا۔ جمال نے اسے سر کے اشارے سے جانے کے لئے کہا۔ جب وہ دونوں اندر چلے گئے تو اس نے سکون کا سانس لیا۔ وہ یہ چاہتا تھا کہ حیات اور نیاز اس کے سامنے سے ہٹ جائیں تو وہ اپنے ہاتھ پیر کھولنے کی کوشش کرے گا۔ ان دونوں کی موجودگی میں کسی قسم کی کوشش بے سود تھی۔ جمال نے بڑا زور لگایا اس کے ہاتھ بڑی مضبوطی سے بندھے ہوئے تھے وہ جنبش تک نہ کر سکے۔ مگر اس نے حوصلہ نہیں ہارا۔ وہ اپنی کلائیوں کو حرکت دینے کی کوشش کرنے لگا اور دل میں گڑگڑا کر دعا مانگنے لگا کہ سپنا جلدی سے چاقو سے نیاز کا کام تمام کر دے تو اس مصیبت سے نجات مل جائے گی۔ مگر وہ جانتا تھا کہ نیاز پر چاقو سے حملہ کر کے اسے زخمی یا ہلاک کرنا اتنا آسان نہیں ہے رنجن داس اور نیاز میں بڑا فرق ہے نیاز اسے چھٹا ہوا بدمعاش لگ رہا تھا۔ سپنا کی کامیابی مشکوک تھی مگر وہ ناامید نہیں ہوا تھا پرامید نظروں سے وہ دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔

سپنا کمرے میں جھاڑو دینے لگی۔ وہ چاہتی تھی کہ نیاز کسی بہانے سے اس کے قریب آئے اور وہ چاقو اس کے پیٹ میں اتار دے' مگر نیاز اس کی توقعات سے کہیں زیادہ

چالاک ثابت ہو رہا تھا۔ اسے جیسے احساس ہو گیا وہ اس کے ساتھ کوئی چال چلنے کا سوچ رہی ہے اس لئے وہ سپنا سے دو قدم پر کھڑا تھا اسے ریوالور کی زد میں لئے ہوئے تھا۔

صفائی کے کام سے فراغت پانے کے بعد سپنا نے جھاڑو اور جھاڑن باورچی خانے میں پھینک دی خواب گاہ میں آ کر وہ کرسی پر ڈھیر ہو گئی وہ بہت تھک گئی تھی نڈھال سی ہو رہی تھی پسینے سے اس کا جسم بھیگ رہا تھا وہ ساڑھی کے پلو سے چہرے سے پسینہ پونچھنے لگی تو نیاز بستر پر ٹانگیں ٹکا کر بیٹھ گیا تو وہ نیاز کی طرف مخمور نظروں سے دیکھتی ہوئی بولی۔ ''کیا تمہیں حیات کی بات پر بھروسہ ہے؟''

''بھروسہ کیوں نہیں ہے؟'' نیاز معنی خیز انداز سے مسکرایا۔ ''مگر تم پر نہیں ہے۔''

''میں نے تم سے کب کہا کہ تم مجھ پر بھروسہ کرو۔'' سپنا نے تیزی سے کہا ''مگر تم یہ بات سوچ سکتے ہو کہ ایسا شخص جس نے میرے حصول کے لئے تمہاری خدمات حاصل کی ہیں ایک خطیر رقم خرچ کر رہا ہے وہ مجھے تمہارے تصرف میں دیدے گا؟''

''اس کے باپ کو بھی دینا پڑے گا۔'' نیاز نخوت سے بولا۔ ''اس لئے کہ وہ مجھ سے بہت ڈرتا ہے میں اسے کسی بھی جگہ پھنسا سکتا ہوں۔''

''جانتے ہو اس نے تمہیں گھر کے اندر کس لئے بھیجا تھا؟'' سپنا نے اسے پر خیال نظروں سے دیکھتے ہوئے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''جائزہ لینے کے لئے۔'' نیاز نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔ ''نہیں' یہ بات نہیں تھی۔'' سپنا کا لہجہ پراسرار سا ہو گیا۔ ''وہ محض بہانہ تھا اس نے تمہارے خلاف سازش کرنے کے لئے بھیجا تھا۔''

''کیسی سازش؟'' نیاز سنجیدہ ہو گیا اس کے چہرے پر غصے کی سرخی پھیلنے لگی۔

''اس نے مجھ سے کہا تھا کہ تم کسی طرح نیاز کو ختم کر دو۔ میرا نیاز کو ختم کرنا بہت مشکل ہے یہ کمینہ میرے راستے کا پتھر بن گیا۔''

''تم جھوٹ بول رہی ہو۔'' نیاز بگڑ گیا۔ ''ہم دونوں کو آپس میں لڑانا چاہتی ہو تا کہ ہم آپس میں لڑ کر ختم ہو جائیں۔''

''میں سچ بول رہی ہوں۔'' سپنا نے ساڑھی کا پلو کھسکا کر کمر سے چاقو نکال کر اس کی طرف اچھال دیا۔ ''یہی میری سچائی کا ثبوت ہے۔''

نیاز نے چاقو کو کھول کر اور الٹ پلٹ کر دیکھا۔ ''یہ تو بہت خوفناک چاقو ہے۔''

''تمہیں اب بھی میری بات کا یقین نہیں آ رہا؟'' سپنا نے اس کی طرف پرامید

نظروں سے دیکھا۔

''نیاز نے ایک ثانیے کے لئے سپنا کو گہری نظروں سے دیکھا۔ وہ اس کی بات کی تہہ میں پہنچ کر بولا۔ ''تم یہ چاہتی ہو کہ میں حیات کو قتل کر دوں؟''

''ہاں۔'' سپنا نے اپنا سر اثبات میں ہلایا۔ ''اسی لئے تو میں تمہیں خطرے سے آگاہ کر رہی ہوں۔''

''مگر حیات کے قتل سے تمہاری ذات کو نہیں صرف میری ذات کو فائدہ پہنچے گا۔ میرے راستے کا بہت بڑا پتھر ہٹ جائے گا۔''

''کیا مطلب؟'' سپنا نے حیرت سے اپنی پلکیں جھپکائیں۔

''مطلب یہ کہ تم پر صرف اور صرف میرا تصرف ہو گا۔'' وہ ہنسا۔ ''آخر تم نے کیا سوچ کر مجھے حیات کی دھوکے بازی سے آگاہ کیا؟ تمہارا کیا خیال ہے کہ میں تم جیسی بت کافر کو اس افشائے راز پر بخش دوں گا؟ ہرگز نہیں میری چندا! میں کسی قیمت پر تم سے دستبردار ہونے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ اگر میں گرفتاری کے خوف سے فرار نہ ہوا ہوتا تو ایک دو مہینے پہلے ہی اغوا کر چکا ہوتا۔''

سپنا نے حوصلہ نہیں ہارا۔ اس کے پاس ایک اور ٹرمپ کارڈ تھا۔ ''اگر میں تمہیں تیس ہزار ٹاکا دوں تو کیا ہم دونوں کو جانے دو گے؟''

''تیس ہزار ٹاکا؟'' حیرت اور خوشی سے نیاز کا چہرہ کھل اٹھا۔ ''اتنی بڑی رقم بھی ہے تمہارے پاس، بہت خوب اب تو میں نہایت مزے سے ایک سال تک کلکتے میں روپوش ہو سکتا ہوں اور ہاں تم دونوں کو جانے دوں گا لیکن آج نہیں کل صبح، اس لئے کہ آج کا دن اور رات میری زندگی کے ناقابل فراموش بن جائیں۔ میں اس سنہرے موقع کو ہاتھ سے جانے دینا نہیں چاہتا۔''

سپنا کو پچھتاوا ہونے لگا۔ اسے اندازہ نہ تھا کہ اس کی تدبیر الٹ ہو جائے گی۔ وہ پہلے اس پہلو پر غور کر لیتی تو اس سے غلطی سرزد نہ ہوتی۔ چاقو جو اس کا محافظ تھا اور آخری سہارا تھا وہ چھن گیا تھا۔ مگر وہ پوری طرح ناامید اور مایوس نہیں ہوئی تھی۔ اوپر ایک ایسی ہستی موجود تھی جو اپنے کھیل بھی دکھاتی تھی۔ بس اسے دل کی گہرائیوں سے یاد کرنے اور اس کے آگے جھولی پھیلانے کی ضرورت ہوتی ہے۔

''رقم کہاں ہے؟'' نیاز نے بے چینی سے پوچھا۔ ''مجھے حیات کے آنے سے پہلے وہ رقم دے دو۔ چلو۔''

نیاز نے دستی بیگ میں سے رقم نکال کر اپنی جیبوں میں ٹھونس لی۔ جمال بڑی بے بسی اور خاموشی سے یہ سب کچھ دیکھتا رہا۔ اس کے دل پر سپنا کا چہرہ دیکھ کر چوٹ لگ رہی تھی۔ وہ اسے بڑی دل شکستہ دکھائی دے رہی تھی۔ چہرہ بھی زرد ہو رہا تھا۔ اس کے ہاتھ آزاد نہیں ہو سکے تھے اس کی کلائیاں بری طرح درد کر رہی تھیں۔ اس لئے اس نے اپنی جدوجہد اور کوشش ترک کر دی تھی۔

دستی بیگ سے رقم نکالنے کے بعد نیاز سپنا کو کمرے میں لے آیا اور اس کی طرف پیاسی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تم کتنی سندر ہو' میرا خیال تو رقم کی طرف گیا بھی نہیں تھا ایک ٹکٹ میں دو مزے ہوں گے۔ میں نے خواب و خیال میں بھی نہیں سوچا تھا۔''

نیاز نجانے کیا الٹی سیدھی بکواس کرتا رہا۔ وہ خاموشی سے سنتی رہی۔ تھوڑی دیر میں حیات آ گیا۔ اس کی ٹوکری میں شراب کی دو بوتلوں کے علاوہ خوردونوش کی اشیاء بھی تھیں۔ سپنا دھڑکتے دل سے نیاز کی طرف دیکھ رہی تھی کہ وہ کس طرح حیات کو موت کا مزہ چکھاتا ہے۔ حیات نے ٹوکری میز پر رکھتے ہوئے سپنا سے پوچھا۔ ''نیاز نے تمہارے ساتھ کوئی بدتمیزی تو نہیں کی؟''

''نہیں۔'' سپنا نے نفرت سے منہ کو سکوڑا۔

نیاز نے ٹوکری کی طرف دیکھا تو حیات نے اس میں ایک بوتل نکال کر اس کی طرف بڑھا دی۔ ''اتفاق سے ایک دکاندار کے پاس یہ بدیشی شراب کی بوتل نکل آئی اس کے لئے بڑا مول تول کرنا پڑا تب کہیں جا کر اس نے تین سو روپے لئے' اسے میں نے تمہارے لئے خرید لیا۔''

''بہت بہت شکریہ تمہارا اے دوست!'' نیاز نے اپنا ریوالور میز پر رکھ کر اس کے ہاتھ سے شراب کی بوتل لے لی۔ اس کا ڈھکن کھول کر اس کے دو تین گھونٹ لئے جیسے وہ شراب پی نہیں چکھ رہا ہو۔ پھر اس نے بوتل کا منہ ڈھکن سے بند کر دیا پھر اس نے اس لمحے سے فائدہ اٹھایا اور بجلی کی سی تیزی سے گھوم کر بوتل حیات کے منہ پر کھینچ ماری جو اسے دمکتے چہرے اور سفاک نظروں سے گھور رہا تھا پھر اس سے کہیں تیزی سے میز پر سے ریوالور اٹھا لیا۔

نیاز کے اچانک اور غیر متوقع حملے سے حیات کے قدم اکھڑ گئے مگر اس نے گرتے گرتے مسہری کے کنارے کا سہارا لیا اور جیب سے ریوالور نکالنے کی کوشش کی فرشتہ اجل ایک لمحے کے ہزاروں حصے کی بھی مہلت دینا نہیں چاہتا تھا۔ نیاز کے ریوالور سے نکلی ہوئی

ایک گولی حیات کے دل پر اور دوسری اس کی کھوپڑی میں سوراخ کر گئی۔ حیات فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ نیاز نے سپنا کی طرف مسکراتے ہوئے فاتحانہ نظروں سے دیکھا اور اس کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ ”اب تم میرے نزدیک آ جاؤ میں نے راستے کا پتھر ہٹا دیا ہے۔“

سپنا کی رگوں میں لہو منجمد ہو گیا وہ خوف و دہشت سے پیچھے ہٹنے لگی۔ تیزی سے ہٹتے ہٹتے دیوار سے جا ٹکرائی۔ اب اس کے لئے فرار کا کوئی راستہ نہیں رہا تھا۔ نیاز اپنے ہاتھ میں ریوالور نچاتا ہوا اس کی طرف کسی ناگ کی طرح پھنکارتا ہوا بڑے سکون و اطمینان سے آہستہ آہستہ بڑھ رہا تھا۔ شکار کو اپنے جال میں پھنستا ہوا دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر شیطانی مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ اس کی آنکھوں کی تیز وحشیانہ چمک نے سپنا کو بری طرح سہا دیا تھا۔ اس کے جسم پر لرزہ طاری ہو گیا۔ اپنے آپ میں وہ اتنی سکت بھی نہیں پا رہی تھی کہ اپنی جگہ سے حرکت کر سکے۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ بہت نحیف اور کمزور ہو گئی ہو وہ ہر لمحے موت سے قریب ہوتی جا رہی ہو اس خیال سے اس کا دل ڈوبتا جا رہا تھا کہ یہ ناگ اسے ڈس لے گا اسے ایسا لگ رہا تھا کہ کسی بھی لمحے اس کی نبض ساکت ہو جائے گی۔

”تم نے کیا فیصلہ کیا؟“ نیاز اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر غرایا۔

”کیسا فیصلہ؟“ سپنا نے بھی بے خوفی سے اس کی وحشیانہ آنکھوں میں جھانکا۔

”تم خوشی سے اپنے آپ کو میرے حوالے کر دو گی یا مجھے تشدد اور بربریت پر مجبور کرو گی؟“

”میں صرف ایک شرط پر تمہاری بات مان سکتی ہوں کہ تم مجھے اور جمال کو یہاں سے جانے دو گے؟“

”سچ!“ نیاز کا چہرہ دمک اٹھا اور اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ ”لیکن ایک بات یاد رکھنا میں فریب اور ریاکاری کو پسند نہیں کرتا ہوں۔ اس کی بڑی بھیانک سزا دیتا ہوں۔ چاہے تم جیسی عورت ہی کیوں نہ ہو؟“

فرشتہ اجل ابھی وہاں سے گیا نہیں تھا۔ وہ اپنی ڈائری میں دو نام لکھ کر لایا تھا۔ ایک نام حیات کا جو اب فرش پر مردہ پڑا تھا اور دوسرا نام نیاز کا جو اپنی طاقت کے گھمنڈ پر سپنا کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ سپنا کو اپنے مضبوط بازوؤں کے حصار میں قید کرنے کے لئے اور قریب ہوا۔ یک لخت اس کے ہاتھ سے ریوالور چھوٹ کر فرش پر گر پڑا۔ سپنا کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ یہ غیر متوقع طور پر کیا ہو گیا۔ نیاز نے سپنا کے بجائے دونوں ہاتھوں سے اپنا گلا اس طرح پکڑ لیا جیسے کوئی اندر سے اس کا گلا دبا رہا ہو اس کا چہرہ پیلا پڑنے لگا۔ وہ چکرانے

اور لڑکھڑانے لگا۔ اس کی آنکھیں تھیں کہ باہر کو نکلی جا رہی تھیں اور اس کے حلق سے خرخر کی آوازیں نکلنے لگیں۔ وہ اپنا توازن قائم نہ رکھ سکا لڑکھڑاتا ہوا حیات کی لاش پر جا گرا۔ چند منٹوں تک درد و اذیت سے تڑپتا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ اس کا جسم سرد پڑتا گیا۔

سپنا نے ایک طرف حیرت اور خوف سے تقدیر کے اس کھیل کو دیکھا جس نے تدبیر کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔ اس نے خواب و خیال میں بھی نہیں سوچا تھا کہ اس شیطان کو موت یوں اچانک دبوچ لے گی۔ نیاز کا جسم اور چہرہ نیلا پڑتا چلا گیا تھا اور اس کے منہ سے جھاگ نکلنے لگا مرنے کے بعد بھی اس کے چہرے پر حیرت کا عنصر تھا۔

سپنا کا دل بھر آیا اور بے اختیار اس کی آنکھیں چھلک پڑیں وہ اس امداد غیبی پر سجدے میں گر کر پھوٹ پھوٹ کر رونا چاہتی تھی اور اس کا شکر بجا لانا چاہتی تھی جس نے اسے ایک نئی زندگی دی تھی اور اس کی لاج رکھ لی تھی جس کے پاس انسان کو بچانے کے لئے تدابیر کی کوئی کمی نہیں ہوتی مگر اس کمرے میں سجدہ شکر بجا لانے کی جگہ نہیں تھی فرش پر حیات کا نجس خون دور تک پھیلا ہوا تھا دو لاشیں بکھری پڑی تھیں۔ پھر اس نے دل کی اتھاہ گہرائیوں سے اپنے رب کو مخاطب کیا۔ سچ ہے تو بہت عظیم اور بہت بڑا ہے تیرے ہاتھ میں زندگی اور موت ہے۔ وہ اپنے رب سے ابھی مخاطب ہی تھی کہ جمال کی تیز اور ہذیانی آواز گہرے سکوت کا سینہ چیرنے لگی۔ ''سپنا! سپنا! تم ٹھیک ہو؟'' وہ اس کی آواز سن کر یک لخت چونکی اس نے نیاز کے پاس آ کر اس کی جیب سے اپنا چاقو نکالا۔ فرش سے نیاز کا ریوالور بھی اٹھا لیا جو اس کے کسی کام نہ آ سکا تھا پھر وہ تیزی سے برآمدے میں آئی۔ جمال کا پورا وجود درد کے سمندر میں غوطہ زن تھا۔ اس نے قدموں کی آواز سن کر آہستہ آہستہ سر اوپر اٹھایا۔ اسے ایسا لگ رہا تھا کہ سپنا نے اپنی لاج کے لئے اپنی زندگی قربان کر دی ہو۔ پھر وہ درندگی کا شکار ہو گئی ہو۔ اسی لئے سپنا نے اس کی پکار کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اس پر نیم بے ہوشی کی سی کیفیت طاری تھی۔

سپنا نے جلدی سے اس کے ہاتھ پیروں کی رسیاں کاٹ کر اسے شکنجے سے آزاد کر دیا۔ ان رسیوں نے تو اس کے جسم کے گوشت کو کاٹ کر رکھ دیا تھا۔ جمال کو سنبھلنے میں دس بارہ منٹ لگ گئے سپنا نے اسے پانی پلایا تو اس کے جسم میں جان سی آ گئی۔ پھر اس نے سپنا کے دمکتے چہرے اور چمکتی آنکھوں کو دیکھ کر پوچھا۔ ''تم ٹھیک تو ہو؟ تمہیں کچھ ہوا تو نہیں، کس نے کس کو گولی ماری ہے؟''

جمال اندر کھیلے جانے والے ڈرامے سے بے خبر تھا۔ اس نے فائر کی آواز سنی تھی

مگر اسے یہ معلوم نہ ہو سکا تھا کہ کس نے کس کو ختم کیا ہے۔ سپنا نے اسے مختصر طور پر سارا واقعہ سنایا۔ پھر وہ تھوڑی دیر کے بعد اس کمرے میں آیا جہاں ان دونوں کی لاشیں پڑی تھیں۔ جمال نے نیاز کی جیبوں میں رکھی ساری رقم نکال لی۔ اس کی رقم کے ساتھ اور رقم بھی تھی۔ حیات کی رقم تھی جو اس نے سپنا کے حصول کی خدمات کے عوض دی تھی۔ اس نے حیات کی جیبوں کی تلاشی نہیں لی اسے حیات کی رقم کی ضرورت نہیں تھی۔

کمرے سے برآمدے میں آ کر جمال نے اس سے کہا۔ ''حیات کو نیاز سے خطرہ محسوس ہونے لگا تھا' وہ اس کے راستے کا پتھر بن گیا تھا۔ اس نے نیاز کو ہٹانے کے لئے شراب میں زہر ملا دیا تھا۔ اس نے گاؤں روانہ ہونے سے پہلے نیاز سے کیا کہا تھا۔ تمہیں یاد ہے اس نے کہا تھا کہ اس گاؤں میں شراب ہی نہیں سانپوں کا زہر بھی مل جاتا ہے۔ دونوں نے ایک دوسرے کو ہٹانے کی کوشش کی اور وہ کامیاب بھی رہے۔ یہ اسی انجام کے مستحق بھی تھے۔''

تھوڑی دیر کے بعد وہ روانہ ہوئے دن خیریت سے گزر گیا۔ شام کے وقت انہیں سرحد عبور کرنے کے لئے دشواری پیش آ رہی تھی۔ اس لیے کہ فوجی گاڑیاں نقل و حرکت کر رہی تھیں۔ جب اندھیرا بڑھ گیا اور ان گاڑیوں کی نقل و حرکت بند ہو گئی تب وہ ہندوستانی سرحد عبور کر کے بنگلہ دیش سرحد میں آ گئے۔ جمال اسے لے کر ایک گاؤں کی طرف بڑھا۔ اس نے ایک گھر کے دروازے پر دستک دی تو ایک بوڑھے شخص نے دروازہ کھولا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ اس شخص کے گھر سے نہا کر تازہ دم ہو کر اور چائے پی کر نکلے پھر وہ انہیں لے کر جرنیلی سڑک پر آیا۔ ایک ٹیکسی والا کھلنا جانے کے لئے تیار ہو گیا۔ جمال نے بوڑھے کو سو ٹا کا کا ایک نوٹ دے کر رخصت کیا اور اس سے بولا۔ ''اب ایک نئے اور خوشگوار سفر کا آغاز ہوتا ہے۔''

جس وقت ٹیکسی رکی رات کے دو بج رہے تھے۔ وہ جیسور میں رات کے کھانے کے لئے ایک گھنٹہ رکے تھے راستے میں دو مرتبہ ٹیکسی خراب ہوئی تھی بالآخر ایک پر خطر سفر اختتام کو پہنچا تھا۔ سپنا نے ٹیکسی سے اتر کے دیکھا۔ ویرانے میں ایک خوبصورت اور پر شکوہ حویلی تھی۔ اندھیرے کی وجہ سے اسے کچھ اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔ جمال ٹیکسی والے کو رخصت کر کے حویلی کے صدر دروازے کی طرف بڑھا۔

☆......☆......☆

دستک دینے کی نوبت نہیں آئی۔ دربان دروازہ کھولے باادب اور مستعد کھڑا تھا۔ اس نے بڑے مؤدبانہ انداز سے ان دونوں کو سلام کیا۔ جمال نے دربان سے کہا کہ وہ کسی ملازمہ کو جگا کر اس کے کمرے میں بھیج دے۔ پھر وہ سپنا کو لے کر اپنے کمرے کی طرف بڑھا۔ سپنا سحر زدہ سی چل پڑی۔ اسے یہ سب کچھ کسی سپنے کی طرح لگ رہا تھا۔ اس نے اپنی زندگی میں کبھی ایسی شاندار اور پرشکوہ حویلی نہیں دیکھی تھی۔ یہ حویلی کسی محل سے مشابہ تھی۔ وہ راہداری سے گزرتی ہوئی بغور جائزہ لے رہی تھی۔ چاروں طرف سناٹا اور اندھیرا تھا۔ اندھیرے کی وجہ سے اس کی وسعت کا اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔ صرف نیچے اور اوپر کی راہداریوں میں زرد زرد سی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ کمروں کے دروازے بند تھے۔ وہ جمال کے کمرے میں پہنچ کر انگشت بدنداں سی رہ گئی۔ اتنا خوبصورت اور ایسا آراستہ و پیراستہ کمرہ تو اس نے خواب میں بھی نہیں دیکھا تھا۔ جمال نے ایئر کنڈیشن آن کر دیا۔ وہ بڑے صوفے پر بیٹھ کر مبہوت سی ہو کر کمرے کی ایک ایک چیز کو دیکھ رہی تھی۔

''یہ میرا کمرہ ہے۔'' جمال نے کہا۔ ''کیسا ہے؟''

''بہت خوبصورت اور بے حد شاندار۔'' سپنا تعریفی لہجے میں بولی۔ ''اس پر کسی شاہی خلوت گاہ کا دھوکہ ہو رہا ہے۔ کیا میں رات کو یہیں رہوں گی؟''

''تم اس کمرے میں تھوڑی دیر کی مہمان ہو۔'' جمال نے کہا۔ ''اس کمرے سے نکلنے کے بعد تم اس کمرے میں قدم نہیں رکھ سکو گی۔''

''جی!'' سپنا نے حیرت سے جمال کا چہرہ دیکھا۔ اسے جمال کا لہجہ بڑا عجیب سا محسوس ہوا۔

''اب تم اس کمرے میں دلہن بن کر قدم رکھو گی۔'' جمال زیر لب مسکرایا۔ ''میں کوشش کروں گی جتنا جلد ہو سکے تم اس کمرے میں آ جاؤ۔''

سپنا کے چہرے پر حیا کی سرخی پھیل گئی تو اس کا حسن اور نکھر گیا۔ اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی تو جمال نے بلند آواز سے کہا۔ ''آ جاؤ۔''

دوسرے لمحے کمرے کا دروازہ کھلا۔ ایک جوان ملازمہ سر پر ساڑھی کا پلو درست کرتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ اس کی آنکھوں میں نیند بھری ہوئی تھی۔ اس کے چہرے سے حیرت چھلکی ہوئی تھی۔ اس کی حیرت پر جمال کا چہرہ کسی ردعمل سے عاری رہا۔ اس نے ان دونوں کو باری باری سلام کیا اور ایک طرف مؤدبانہ انداز سے کھڑی ہوگئی لیکن اس کی نگاہیں سپنا کے چہرے پر مرکوز تھیں۔

''چمپا! تم نے آنے میں بڑی دیر لگا دی۔'' جمال نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ''جلدی سے دو گلاس اناناس کا شربت لے آؤ۔''

چمپا تھوڑی ہی دیر میں شربت لے آئی تو جمال بولا۔ ''بیلا کے برابر جو کمرہ ہے وہ جلدی سے ٹھیک کر دو۔ پھر آ کر انہیں اس کمرے میں لے جاؤ۔'' چمپا چلی گئی تو جمال نے سپنا سے کہا۔ ''بیلا میری سب سے چھوٹی بہن ہے۔''

تھوڑی دیر کے بعد چمپا آئی اور سپنا کو لے کر اس کے کمرے میں پہنچی۔ سپنا نے دیکھا۔ یہ کمرہ بھی بہت خوبصورت صاف و شفاف اور نہایت آراستہ و پیراستہ تھا۔ لمبی چوڑی مسہری، بستر اور تمام فرنیچر نیا لگ رہا تھا۔ سپنا سے جمال نے کہہ دیا تھا کہ ملازمہ نے اس سے کچھ دریافت کرنے کی کوشش کی تو اس کی کسی بات کا جواب دینے کی ضرورت نہیں۔ کسی بہانے سے ٹال دے۔ چمپا نے کچھ کریدنے کے بارے میں سوچا مگر اسے بے حد سنجیدہ دیکھ کر ہمت نہ ہوئی۔ وہ سلام کر کے دروازہ بند کر کے چلی گئی۔

چمپا کے جانے کے بعد سپنا بستر پر دراز ہوگئی۔ بستر اتنا نرم و نازک تھا جیسے پھول پتیوں سے بنایا گیا ہو۔ بستر کا نرم و گداز پن اس کے جسم میں جذب ہونے لگا تو اسے بڑی راحت سی محسوس ہو رہی تھی۔ کمرہ ایئر کنڈیشنڈ تھا۔ خوشگوار خنکی کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ نئی زندگی کی آسائش سے اس کے ذہن پر سرور چھانے لگا۔ پھر اسے اپنی ماں کا خیال آیا لیکن وہ ماں کے بارے میں زیادہ دیر تک سوچ نہ سکی۔ نیند نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔

سپنا بیدار ہوئی تو صبح کے نو بج رہے تھے۔ وہ اپنے آپ کو بے حد ہلکی پھلکی سی محسوس کر رہی تھی۔ پورے جسم میں ایک عجیب سی فرحت بھر گئی تھی۔ وہ بستر سے نکلی تو اس نے کرسی پر ایک نیا جوڑا رکھا ہوا دیکھا۔ پورا لباس سفید براق تھا۔ وہ سمجھ گئی کہ یہ اس کے لئے ہے۔ وہ یہ لباس لے کر ملحق غسل خانے میں چلی گئی۔ غسل خانہ بھی بہت بڑا اور کشادہ

تھا۔ اس نے بڑے سکون و اطمینان سے غسل کیا۔ کپڑے پہن کر نکلی اور سنگھار میز کے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر بالوں میں کنگھی کرنے لگی۔ سنگھار میز پر میک اپ کے لوازمات اور خوشبویات کی بہت ساری شیشیاں رکھی تھیں۔ وہ میک اپ نہیں کرتی تھی۔ اس کی ماں کو بھی میک اپ پسند نہیں تھا۔ وہ کہا کرتی تھی کہ حسن کسی میک اپ کا محتاج نہیں ہوتا ہے۔

تھوڑی دیر کے بعد دروازے پر دستک ہوئی تو وہ بلند آواز میں بولی۔ ''آ جاؤ۔''

دروازہ کھلا تو چمپا نمودار ہوئی۔ اس نے پہلے تو سلام کیا۔ پھر بولی۔ ''ناشتے کی میز پر جمال صاحب اور گھر کے لوگ آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔''

سپنا، چمپا کے پیچھے پیچھے راہداری اور کئی کمروں سے گزر کر کھانے کے کمرے میں پہنچی۔ لذیذ ناشتے کی خوشبو نے اس کی بھوک چمکا دی۔ ناشتے کی لمبی چوڑی میز پر جمال اپنے گھر والوں کے ساتھ موجود تھا۔ وہ سپنا کو دیکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ سپنا نے میز کے گرد بیٹھے ہوئے مردوں اور عورتوں کو دیکھا تو وہ نروس سی ہو گئی۔ جمال نے پہلے اپنی ماں کا پھر مردوں کا تعارف کرایا، پھر عورتوں کا، سپنا نے ہر ایک سے متعارف ہوتے وقت انہیں جھک کر آداب کیا اور پوری توجہ سے ان کے نام اور چہرے ذہن نشین کرنے لگی۔ اس لئے کہ اسے ان کے ساتھ رہنا تھا۔

زیب النساء جمال کی والدہ تھیں۔ ساٹھ برس سے اوپر کی تھیں مگر صحت مند اور شفیق مزاج خاتون تھیں۔ انھوں نے سپنا کو بڑی محبت اور گرم جوشی سے گلے لگایا تو اس کی آنکھیں پرنم ہو گئیں۔ اسے اپنی ماں یاد آ گئی تھی۔ کفیل احمد سب سے بڑے بھائی تھے۔ گنجے ہی نہیں موٹے اور بھدے بھی تھے۔ ان کے چہرے اور آنکھوں سے ریاکاری اور منافقت ٹپک رہی تھی۔ منجھلا بھائی کمال بھی چہرے مہرے سے ایسا ہی لگ رہا تھا لیکن وہ چھریرے جسم کا تھا، اس کا قد نکلتا ہوا تھا۔

کفیل اور کمال کی بیویاں نسیمہ اور خدیجہ بھی تیز و طرار تھیں۔ ان دونوں کی عمروں میں چھ سات برس کا فرق تھا۔ اس نے محسوس کیا تھا کہ جیٹھانی اور دیورانی نے اسے نفرت اور حقارت کی نظروں سے دیکھا۔ کفیل کی دو لڑکیاں تھیں۔ بڑی لڑکی آمنہ اور چھوٹی کا نام تابندہ تھا۔ وہ انیس اور سولہ برس کی تھیں۔ وہ اس سے کھلے دل، محبت اور گرم جوشی سے پیش آئی تھیں۔ یہ لڑکیاں اسے اچھی لگی تھیں۔ کمال کا بیٹا نہال جو سترہ برس کا تھا اس نے بھی بڑے اخلاق کا مظاہرہ کیا۔ وہ بڑا شریر اور چلبلا سا لگا تھا۔ بیلا تو اسے سب سے اچھی اور پیاری سی لگی۔ وہ اس کی ہم عمر تھی۔ بیلا نے سب کے سامنے اس کا رخسار چوم کر کہا۔ ''میری

بھابھی تو چاند کا ٹکڑا ہے۔'' پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بٹھا لیا۔

تابندہ خوشی سے بولی۔ ''جمال چچا تو اپنے لئے آسمان کی حور اسمگل کر کے لا ئے ہیں۔ اب تو وہ ان سے شادی کریں گے نا؟''

''چچا جان شادی کرنے کے لئے لائے ہیں تمہاری خدمت کرنے کے لئے نہیں۔'' نہال نے تیزی سے کہا۔

''دادی اماں!'' آمنہ نے زیب النساء سے کہا۔ ''چچا کی شادی تو اتنی دھوم دھام سے ہونا چاہیے کہ پورے شہر میں آج تک کسی کی نہ ہوئی ہو۔''

''تم ٹھیک کہتی ہو۔'' بیلا نے اپنا سر ہلایا۔ ''اب اس نیک کام میں دیر نہیں ہونا چاہیے۔ میرا بس چلے تو آج شام ہی ان کی شادی کر دوں۔''

''میں تمہاری تائید کرتا ہوں۔'' نہال نے اپنا بایاں ہاتھ فضا میں بلند کر دیا۔ ''اس کام میں اس لئے بھی دیر نہیں ہونا چاہیے کہ بالآخر انہیں کوئی لڑکی پسند آ گئی۔ اب تو ہمارے گھر والوں میں بڑی رونق اور چہل پہل ہو جائے گی۔''

زیب النساء ہنسنے لگیں۔ ''یہ کوئی گڈے گڑیا کی شادی ہے جو آج ہی ہو جائے گی۔ اس میں کم سے کم دس پندرہ دن لگیں گے۔''

''دلہن ہمارے گھر سے رخصت ہو گی۔'' نہال نے کہا۔ ''میں دلہن کا بھائی بنوں گا۔''

''نہیں ہم لے جائیں گے سپنا باجی کو اپنے گھر۔'' آمنہ بولی۔ ''یہ ہمارے گھر سے رخصت ہوں گی۔ ہم انہیں اپنے ہاتھوں سے دلہن بنائیں گی۔ تمہیں تو اپنے بال بنانے کی تمیز تک نہیں ہے تم دلہن کو کیسے تیار کرو گے۔ لڑکے کہیں دلہن کا میک اپ کرتے ہیں۔''

''میں انہیں بیوٹی پارلر لے جا کر تیار کراؤں گا۔'' نہال تیزی سے بولا۔ ''میرے پاس دو ہزار ٹاکا ہیں۔''

''ہماری سپنا باجی کا حسن بیوٹی پارلر کا محتاج نہیں ہے۔'' تابندہ نے جواب دیا۔ 'اپنی رقم اپنے پاس رکھو۔''

''سپنا بھابھی پر صرف میرا حق ہے۔'' بیلا فوراً بول اٹھی۔ ''تم سب دولہا والوں کی طرف سے آنا۔ میں صرف نہال کو اپنے ساتھ ملا لوں گی۔''

''دادی اماں!'' تابندہ بولی۔ ''ناشتہ کرنے کے بعد آپ سپنا باجی کی نظر اتاریں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی بدخواہ کی نظر لگ جائے۔''

لڑکیاں جس طرح اس کی کھلے دل سے عزت' پذیرائی اور اس کے حسن کی تعریف کر رہی تھیں اس نے سپنا کو بہت متاثر کیا تھا۔ یہ سب کچھ اس کی توقع کے خلاف تھا۔ حیرت انگیز مسرت کی بھی بات تھی۔ آمنہ اور بیلا تقریباً اس کی ہم عمر ہی تھیں۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ برسوں سے ایک دوسرے کے آشنا ہوں۔ مگر اس نے محسوس کیا تھا کہ نسیمہ اور خدیجہ کو ہی نہیں جمال کے بھائیوں کو بھی نہال اور لڑکیوں کا محبت آمیز رویہ زہر لگ رہا ہے۔ ان کے بشروں سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اندر ہی اندر کھول رہے ہیں۔ خدیجہ اور نسیمہ نے کسی بات پر اس پر غیر محسوس انداز سے طنز کیا تھا اور چبھتے ہوئے لہجے میں کچھ کریدنا چاہا تو بیلا نے ان کی بات بڑی خوبصورتی سے کاٹ دی تھی۔ اس بات سے اس کے دل کو بڑی ڈھارس بندھی تھی کہ ان دو حاسد عورتوں کے مقابلے میں چاہنے والوں کی تعداد زیادہ ہے۔

سپنا نے یہ بھی محسوس کیا تھا کہ اس گھر میں بیلا کا ایک طرح سے سکہ چلتا ہے۔ اس نے تھوڑی ہی دیر میں جان اور پرکھ لیا تھا کہ بیلا بے حد مخلص لڑکی ہے۔ اس کا وجود آبشار کی طرح تھا وہ حد سے زیادہ باتونی بھی تھی۔ بھابھیاں بڑی تھیں مگر اس کے سامنے ان کا بس نہیں چلتا تھا۔ شاید اس لئے کہ وہ تین بھائیوں کی اکلوتی اور سب سے چھوٹی بہن ہونے کے ناطے لاڈلی بھی تھی۔ ماں اور تینوں بھائی اسے حد سے زیادہ چاہتے تھے۔

ناشتے سے فراغت پانے کے بعد جمال اپنی ماں سے بولا۔ ''میں سپنا کو شاپنگ کرانے لے جا رہا ہوں۔ دوپہر تک ہم لوٹ آئیں گے۔''

''کیا میں مر گئی ہوں جو آپ انہیں شاپنگ کرانے لے جائیں گے۔'' بیلا بولی۔ ''اور پھر آپ کو دنیا والوں کا کوئی خیال نہیں وہ کیا کہیں گے؟''

''دنیا والوں کو کیا تکلیف ہے جو وہ اعتراض کریں گے۔'' جمال نے حیرت سے کہا۔

''اعتراض کی بات نہیں ہے کیا شادی سے پہلے آپ شاپنگ کرائیں گے۔ آپ دس ہزار ٹاکا دے دیں میں اور آمنہ جا کر شاپنگ کرا لائیں گی۔''

''میں بھی ساتھ چلوں گی۔'' تابندہ بھی ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

میری تو سب سے زیادہ ضرورت پڑے گی۔'' نہال بھی بول پڑا۔'' مجھ سے اچھا اور تجربہ کار ڈرائیور اس گھر میں موجود ہی نہیں ہے۔''

''تمہارا عورتوں میں کیا کام ہے جو کباب میں ہڈی بن رہے ہو۔'' آمنہ تنک کر بولی۔ ''گاڑی تو مجھے بھی چلانا آتی ہے۔''

''گاڑی آپ چلائیں گی۔'' نہال منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنسنے لگا۔ ''اس ہفتے تین چالان ہوئے ہیں۔ دو گاڑیاں مرمت کے لئے گیراج گئی ہوئی ہیں۔ اپنے آپ پر نہیں تو نئی گاڑی اور راہ گیروں پر رحم فرمائیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم بازار کے بجائے ہسپتال پہنچ جائیں۔''

نہال اور آمنہ آپس میں جھگڑنے لگے تو بیلا نے فیصلہ صادر فرما دیا۔ ''نہال گاڑی چلائے گا اور قلی کا کام بھی انجام دے گا۔''

سپنا کی زندگی میں ایک خلا تھا یہ ایک ایسا خلا تھا جو کبھی پر نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کی نہ تو کوئی بہن تھی اور نہ کوئی بھائی تھا۔ اس نے خواب و خیال میں بھی نہیں سوچا تھا کہ ایک دن یہ خلا بھی پر ہو جائے گا۔ اسے نہال کی صورت میں ایک بہت ہی پیارا سا بھائی ملا تھا۔ تین لڑکیاں بہنوں کی شکل میں ملیں تو اس کے دل کے تمام نہاں خانوں میں مسرت کی جھنکار ہونے لگی تھی۔ اس کی زندگی میں چپکے سے بہار آ گئی تھی۔ گو نہال سگا بھائی یا بہنیں نہیں تھیں لیکن اسے وہ سب سگوں اور اپنوں سے بڑھ کر لگی تھیں۔ وہ گھنٹوں میں اس کے قریب آ گئی تھیں۔ ان کی محبت اور جذبوں میں کوئی کھوٹ نہیں تھی۔ ان سب نے اسے جیسے بن مول خرید لیا۔ وہ ایک جلتی شمع کی طرح تھی اور وہ اس پر پروانوں کی طرح نچھاور ہو رہی تھیں۔ نئی زندگی کا آغاز اس کے لئے بہت خوشگوار ثابت ہوا ہے۔

سپنا نے حویلی کے احاطے میں چھ سات نئے ماڈل کی خوبصورت اور بیش قیمت گاڑیاں دیکھیں۔ نہال کے پاس مرسڈیز گاڑی کی چابی تھی۔ وہ شہر کے سب سے بڑے بازار پہنچے تو وہاں خریداری اپنے عروج پر تھی۔ جمال نے شاپنگ کے لئے دس بارہ ہزار کی رقم دی تھی اس کے علاوہ نہال' آمنہ' تابندہ اور بیلا بھی اپنی اپنی رقم لے کر آئی تھیں۔ وہ اسے اپنی طرف سے تحائف خرید کر دے رہے تھے۔ ان سب کے چہروں پر محبت کا ایک جذبہ دکھائی دیتا تھا۔

رات کے کھانے سے فراغت پانے کے بعد زیب النساء نے جمال اور سپنا کی شادی کا رسمی اعلان کر دیا کہ آج سے ٹھیک دس دن کے بعد جمعہ کے روز عصر کی نماز کے بعد ان کی شادی بڑی سادگی مگر پروقار طریقے سے ہو گی۔ جمال نہیں چاہتا تھا کہ شادی جیسے مقدس فریضے کو دھوم دھڑکے اور فضول خرچی کا نشانہ بنایا جائے۔ لڑکیاں سادگی سے شادی کی تقریب منعقد کرنے کے لئے کسی قیمت پر تیار نہ تھیں۔ وہ روایتی انداز سے شادی کی تمام رسومات انجام دینا چاہتی تھیں۔ انہوں نے نہ صرف منہ پھلایا بلکہ شادی کے بائیکاٹ کی دھمکی

بھی دے دی۔ جمال نے ان کی خواہش کے آگے اپنا سر جھکا دیا۔

نسیمہ اور خدیجہ کے سینوں پر سانپ لوٹ گئے۔ بھائیوں کو بھی یہ شادی ایک آنکھ نہیں بھا رہی تھی۔ وہ سپنا کو اس گھر کی بہو اور اپنی بھابھی بنانے کے لئے ذہنی طور پر تیار نہ تھے۔ اس لئے کہ سپنا کے خاندان کا کچھ پتہ نہیں تھا۔ جمال نے انہیں بتایا تھا کہ سپنا کے والدین کو کلکتہ میں حادثہ پیش آ گیا تھا جس میں وہ جاں بحق ہو گئے تھے۔ وہ تنہا رہ گئی تھی اس لئے وہ اسے اپنے ساتھ لے آیا۔

سپنا نے دو تین دنوں میں حویلی کے ماحول کو بدلتے دیکھا۔ گھر کے لوگوں کے رویۓ میں فرق آتے دیکھا۔ ویسے یہ تبدیلی کچھ لوگوں کے رویۓ میں تھی۔ اس کی شادی کی تیاریاں بڑے زور و شور سے جاری تھیں۔ ان لڑکیوں نے نہ صرف اپنے خاندان کی لڑکیوں بلکہ سہیلیوں کو بھی بلا لیا تھا وہ روز صبح آتی تھیں اور شام تک ہاتھ بٹاتی تھیں کچھ رک جاتیں یا بیلا انہیں روک لیتی تھی۔ کوئی بلاؤز کاٹ رہی ہے تو کوئی سلائی کر رہی ہے۔ کپڑوں پر سلمیٰ ستارے اور گوٹہ کناری ٹانکی جا رہی ہے۔ زیورات کے لئے جیولرز شاپ جایا جا رہا ہے۔ سینڈلوں کی اور چوڑیوں کی خریداری ہو رہی ہے۔ نہال سگے بھائی کی طرح پیش آتا تھا۔ بیلا اور دوسری لڑکیاں اسے سگی بہن کی طرح چاہ رہی تھیں۔ اس کا ہر طرح سے خیال رکھا جا رہا تھا۔ اس کی پسند اور رائے کو اولیت دی جاتی تھی۔ حویلی پر رنگ و روغن بھی ہو رہا تھا۔ کسی بات کی کسر اٹھا نہیں رکھی گئی تھی۔ پیسہ تھا کہ پانی کی طرح بہایا جا رہا تھا اور دوسری طرف نسیمہ، خدیجہ اور جمال کے بھائیوں کے چہروں پر حسد، جلن اور آنکھوں میں نفرت کی آگ دیکھ کر اس کا دل اندر سے جیسے ڈوبنے لگتا تھا۔ اس پر ایک عجیب سی اداسی چھانے لگی۔ وہ چاروں اسے بہت پراسرار اور خطرناک دکھائی دینے لگے۔ ان کی نگاہیں اسے کوئی جال بنتی دکھائی دیتی تھیں۔ اس کے دل میں ایک خوف سا دامن گیر ہو گیا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے شادی کے دن کوئی منحوس واقعہ رونما ہونے والا ہے جو شادی کی راہ میں دیوار بن جائے گا۔ خوف کسی پراسرار پرندے کی طرح تھا۔ یہ پرندہ ہر وقت دل کی دہلیز پر بیٹھا رہتا تھا۔ وہ سوچتی کہ اگر دیوار کھڑی ہو گئی تو پھر کیا ہو گا۔ وہ چاروں اس کے کس لئے دشمن ہیں۔ اس نے ان کا کیا بگاڑا ہے۔

''کفیل اور کمال بھائی! آپ دونوں سن رہے ہیں؟'' نسیمہ تلخی سے بولی۔ ''جمال کی شادی میں اب صرف چار دن باقی رہ گئے ہیں۔''

''یہ بات آپ ان سے کہہ رہی ہیں جو مٹی کے تودے ہیں۔'' خدیجہ نے طنزیہ

لہجے میں کہا۔ ''میں کہتی ہوں کہ انہیں چوڑیاں پہنا کر بٹھا دو۔''
''آخر تم دونوں کیا چاہتی ہو؟'' کفیل نے تیز و تند لہجے میں پوچھا۔ ''میں یہ شادی رکوا دوں؟''
''آپ کو بڑی جلدی اس بات کا خیال آیا۔ اتنے دنوں سے کیا میں فرانسیسی بول رہی ہوں جو آپ کی کھوپڑی میں نہیں آ رہا تھا۔''
''نسیمہ!'' کفیل نے مشتعل ہوئے بغیر کہا۔ ''بات اتنی آگے بڑھ گئی ہے کہ یہ شادی اب رک نہیں سکتی۔''
''بھائی جان ٹھیک کہتے ہیں۔'' کمال نے اپنے بھائی کی تائید کی۔ ''اس شادی کے رکوانے سے ہمیں کیا حاصل ہو گا؟ یہی نا کہ ایک غیر اور لاوارث لڑکی اتنے بڑے خاندان کی بہو بن رہی ہے۔ میں نے جمال کو بہت سمجھایا تھا' اماں کو بھی۔ ان دونوں نے میری ایک نہ سنی۔ اصل بات یہ ہے کہ ماں اور بیٹا اس لڑکی کے حسن و جمال پر ریجھ گئے۔ یہ لڑکی جادوگرنی ہے یا اس نے کچھ گھول کر انہیں پلا دیا ہے۔''
''صرف اماں اور جمال ہی نہیں بلکہ ہمارے بچے بھی تو اس کا کلمہ پڑھنے لگے ہیں۔ اس کا کیا کیا جائے؟'' کفیل نے سرد آہ بھری۔
''آپ دونوں بھائی صرف سوچتے ہی رہیں گے یا کچھ کریں گے بھی......؟'' خدیجہ نے تیزی سے کہا۔
''تم دونوں کے دل اور کھوپڑی میں جو ہے وہ بیان کرو۔ پہیلیاں مت بجھواؤ۔'' کمال کو غصہ آ گیا۔ ''آخر اس شادی سے ہمارا کیا نقصان ہے؟''
''جمال کی شادی ہو جائے گی تو تم دونوں اس کی دولت اور جائیداد سے محروم ہو جاؤ گے۔'' نسیمہ نے تنک کر کہا۔ ''اس کی شادی نہ ہونے اور موت کی صورت میں اس کی ساری دولت اور جائیداد جو دو کروڑ ٹاکا کی ہے وہ ہم دونوں کی ہو جائے گی۔''
''آخر اتنی ساری دولت ہمارے کس کام کی؟ ہمارے پاس بھی تو دولت کی کوئی کمی نہیں ہے۔'' کفیل بولا۔
''اس کی دولت تمہارے بچوں کے کام آئے گی۔'' نسیمہ یک لخت پھٹ پڑی۔ ''آخر تم دو بیٹیوں کے باپ ہو اور پھر زندگی کا آخری حصہ گزارنے کے لئے دولت ہی سہارا بنے گی۔ کوئی کام نہیں آتا۔ سوچ لو۔''
''جمال نے اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ ایک لڑکی پسند کی ہے۔'' کمال کہنے لگا۔

''اب اسے دنیا کی کوئی طاقت اس شادی سے نہیں روک سکتی ہے۔ اس لڑکی سے ہمیں نفرت صرف اس لئے ہے کہ اس کے خاندان کا کچھ پتہ نہیں۔ وہ خاندان سے باہر کی لڑکی ہے۔ ہم اس کی خوشیوں کو تاراج نہیں کریں گے۔ اسے بھی یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی مرضی اور خواہش کے مطابق زندگی گزارے۔''

خدیجہ نے آگے بڑھ کر نسیمہ کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولی۔ ''ہمارے مردوں کی عقل پر پردہ پڑ گیا ہے۔ چھت پر چلو۔ بیٹھ کر وہاں باتیں کرتے ہیں۔''

''چلو۔'' نسیمہ نے اپنے شوہر اور دیور کو تند نظروں سے گھورا۔ ''یہ تو بعد میں پچھتائیں گے۔''

وہ دونوں کمرے سے نکل کر صحن کی طرف بڑھیں۔ وہاں سے ایک زینہ اوپر کی طرف جاتا تھا۔ حویلی اندھیرے میں لپٹی ہوئی تھی۔ ہو کا عالم طاری تھا۔ نوکر چاکر سب اپنی اپنی کوٹھڑیوں میں جا کر سو گئے تھے۔ تمام کمروں میں اندھیرا تھا۔ صرف بیلا کے کمرے میں روشنی ہو رہی تھی۔ لڑکیوں کے ہنسنے، بولنے اور دھیمی سروں میں گانے کی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔ یہ آوازیں ان دونوں کے دلوں پر تازیانہ بن کر لگ رہی تھیں۔ پھر وہ دبے پاؤں زینے کی طرف بڑھیں اور چند لمحوں کے بعد وہ چھت پر تھیں۔

چھت کی منڈیر کے پاس پہنچ کر نسیمہ بولی۔ ''میں نہ کہتی تھی کہ ہمارے شوہروں پر بھائی کی محبت غالب آ جائے گی۔''

''مجھے ان سے ایسی امید نہ تھی کہ وہ بودے نکلیں گے۔'' خدیجہ نے تیکھے لہجے میں کہا۔

''اب نہ میں اور نہ تم شوہروں کو اعتماد میں لیں گے۔'' نسیمہ نے سرگوشی کی۔ ''اگر ایسی حماقت کی تو سارا معاملہ چوپٹ ہو جائے گا۔''

''اب جو بھی کام کرنا ہے وہ ہم دونوں کو مل کر کرنا ہے۔'' خدیجہ کا لہجہ پراسرار سا ہو گیا۔ ''نہ تو ان دونوں کو ہوا لگنے دینی ہے اور نہ شک ہونے دینا ہے کہ یہ سب کیا دھرا ہمارا ہے۔ یہ کارنامہ بہت خاموشی اور احتیاط سے انجام دینا ہو گا۔ میں تو چمپا یا کسی ملازمہ کو اعتماد میں لینے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ یہ پیٹ کی ہلکی ہوتی ہیں اور بڑی کمینی بھی، وہ ہمیں غیر محسوس انداز سے بلیک میلنگ کرنے لگیں گی۔''

''میں بھی اس وقت تمہارے ہی انداز سے سوچ رہی ہوں۔'' نسیمہ کہنے لگی۔ ''میں نے تو خواب و خیال میں بھی نہیں سوچا تھا کہ جمال کلکتہ سے لڑکی کو بھگا کر لے آئے

گا۔ لایا بھی کیسی حسین لڑکی کو ہے اس لڑکی نے تو سارے گھر کو اپنے حسن و جمال سے مسحور کر دیا۔ تمہارا بیٹا اور میری بیٹیاں اس کی گرویدہ ہو گئیں اور تو اور بیلا جیسی نک چڑھی لڑکی اس کے گلے کا ہار بن گئی۔ خدا کا شکر ہے کہ اس کا جادو ہم پر نہیں چڑھا۔ نہ اب چڑھے گا۔ میں نے پورے دس برس تک جمال کو کوئی لڑکی پسند نہیں آنے دی۔ اس کے پسند آنے پر لڑکی میں کوئی نہ کوئی نقص نکالتی رہی۔ صرف اس لئے کہ وہ شادی نہ کر لے۔ وہ شادی کر لے گا تو اس کے بچے ہوں گے۔ ساری جائیداد ہاتھ سے نکل جائے گی۔ اس نے بیزاری سے کہہ بھی دیا تھا کہ اب وہ ساری زندگی شادی نہیں کرے گا۔ اب جبکہ وہ شادی کر رہا ہے تو اس کے سارے خوابوں کو چکنا چور کرنا ہو گا۔ اس کے لئے اس فساد کی جڑ کو کاٹنا ہو گا۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔‘‘

’’فساد کی جڑ کون؟ جمال یا سپنا؟‘‘ خدیجہ نے معنی خیز لہجے میں پوچھا۔

’’فساد کی اصل تو جڑ تو ایک طرح سے جمال ہی ہے۔‘‘ نسیمہ نے آہستگی سے سفاک لہجے میں جواب دیا۔ ’’وہ زندہ رہے گا تو اس بات کا خطرہ ہے کہ کہیں پھر شادی نہ کر لے مگر سپنا کی موت کا صدمہ اس کے لئے ناقابل برداشت ہو گا۔ پھر وہ کبھی شادی کے بارے میں سوچے گا بھی نہیں۔ اگر اس نے پھر کسی لڑکی کو پسند کر لیا تو پھر ہمیں گہری سنجیدگی سے سوچنا ہو گا۔ اب ہمیں سپنا کی جڑوں کو کاٹنا ہے۔ اسے سہاگ رات بھی نصیب نہ ہو۔‘‘

’’تمہارے ذہن میں کیا منصوبہ ہے؟‘‘ خدیجہ نے تجسس سے پوچھا۔

’’میرے ذہن میں جو منصوبہ ہے وہ تو تمہیں بعد میں تفصیل سے بتاؤں گی۔‘‘ نسیمہ نے جواب دیا۔ ’’اب ہمیں اس شادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا ہے۔ سب سے آگے آگے رہنا ہے۔ اتنی محبت اور چاہت کا اظہار کرنا ہے کہ ہر کوئی انگشت بدنداں رہ جائے اور سپنا پر رشک کرنے لگے۔ وہ دلہن بن کر ہمارے گھر سے رخصت ہو گی۔ تم اسے اپنے ہاتھوں سے شادی کا جوڑا پہناؤ گی اور کفن بھی۔‘‘

’’مجھے شادی کے جوڑے سے زیادہ کفن پہناتے ہوئے خوشی ہو گی۔‘‘ خدیجہ وحشیانہ لہجے میں بولی۔ ’’مگر شادی کے کاموں میں اچانک غیر معمولی دلچسپی لینے سے سب کو شک تو نہیں ہو جائے گا۔ بعد میں ہم پر کوئی ناگہانی افتاد نہ آ پڑے۔‘‘

’’شک نہیں ہو گا بلکہ سب خوش ہو جائیں گے۔‘‘ نسیمہ کے ہونٹوں پر زہریلی ہنسی پھیل گئی۔ ’’شادی کی رات جو واقعہ رونما ہو گا اس کا الزام ہمارے سر نہیں آئے گا۔ ذرا اپنا کان لاؤ۔ میں بتاتی ہوں کہ میرا منصوبہ کیا ہے؟‘‘

☆......☆......☆

مایوں کی رسم سے ایک گھنٹہ پہلے زیب النساء نے سپنا کو اپنے کمرے میں کسی کام سے بلایا تو وہ بیلا کے ہمراہ ہو لی۔ زیب النساء کا کمرہ مہمان خانہ کے قریب تھا۔ وہ چند قدم پر تھی کہ ٹھٹھک کے رک گئی۔ ذرا سی دیر کے لئے اس کا دل دھڑکنا بھول گیا۔ اسے اپنی نظروں پر یقین نہیں آیا۔ اس نے وقار حسین کو مہمان خانے کی طرف جاتے دیکھا۔ بیلا کی نظر جیسے ہی وقار حسین پر پڑی۔ بیلا انکل، انکل پکارتی ہوئی اس کی طرف تیزی سے لپکی۔ وقار حسین نے رک کر بیلا کی طرف دیکھا تو اس کی نظر سپنا کی طرف بھی اٹھ گئی۔ سپنا نے جلدی سے دوسری طرف منہ پھیر کے ساڑھی کا پلو سر پر ڈال کر گھونگھٹ نکال لیا تاکہ وہ اس کا چہرہ نہ دیکھ سکے۔

''وقار حسین یہاں کہاں سے آ گیا؟'' اس نے خوفزدہ ہو کر دل میں سوچا۔ ''اس کی ماں اور اس کے باپ کے قاتل کا اس خاندان سے کیا تعلق؟'' وہ بت کی طرح کھڑی رہی۔ اپنی جگہ جامد سی ہو گئی تھی۔ اس میں اتنی سکت بھی نہیں تھی کہ وہ اکیلی زیب النساء کے کمرے کی طرف بڑھ جاتی چند لمحوں کے بعد وقار حسین مہمان خانے کی طرف بڑھ گیا تو بیلا اس کے پاس آئی۔ اس نے اپنا شک دور کرنے کے خیال سے پوچھا۔ ''یہ کون تھے؟''

''ان کا نام وقار حسین ہے۔'' بیلا نے جواب دیا۔ ''انکل ہمارے ابو کے دوست ہی نہیں بلکہ سگے بھائی کی طرح تھے۔ وہ بیس برس پہلے کسی وجہ سے یہاں سے چلے گئے تھے۔ اب پھر کسی کام سے آئے ہیں۔ چھ سات دنوں سے یہیں ہیں لیکن وہ بڑے پراسرار سے ہیں کسی بھی وقت چلے جاتے ہیں اور کب لوٹ کر آتے ہیں کچھ پتہ نہیں چلتا۔ وہ آج کسی کام سے کومیلا جا رہے تھے۔ میں نے انہیں روک لیا ہے کہ وہ شادی تک یہاں سے نہیں جائیں گے۔ انہوں نے شادی میں شرکت کا وعدہ کر لیا ہے۔''

''کیا تمہارے انکل کو میرے بارے میں بتایا گیا ہے کہ میں کون ہوں اور کہاں سے آئی ہوں؟'' سپنا کی زبان سے نہ چاہتے ہوئے بھی نکل گیا۔ ''کیا وہ ابھی میرے بارے میں دریافت کر رہے تھے؟''

''شاید جمال بھیا نے انہیں آپ کے بارے میں بتایا ہو'' بیلا نے جواب دیا۔ ''انہوں نے آپ کے بارے میں کچھ نہیں پوچھا۔ ویسے ان سے اس گھر کی کوئی بات چھپائی نہیں جاتی۔ انکل نے آپ کی ایک جھلک دیکھ لی تھی۔ وہ کہہ رہے تھے کہ ماشاء اللہ ہماری ہونے والی بہو بہت پیاری ہے۔ اللہ نظر بد سے بچائے۔ وہ یہ بھی کہہ رہے تھے کہ شادی کی

تقریبات میں وہ کسی وجہ سے مہمانوں کے سامنے نہیں آئیں گے۔ اس کے لئے انہیں مجبور نہ کیا جائے۔ ویسے وہ دلہن کو مہمانوں کی غیر موجودگی میں دیکھ جائیں گے۔“

سپنا نے سکون کا سانس لیا کہ اسے وقار حسین نے نہیں پہچانا۔ اس نے اپنے دل کو تسلی دی کہ شاید وہ اسے بھول چکا ہوگا۔ اس لئے کہ اس روز بڑی مختصر سی ملاقات رہی تھی۔ پھر بعد میں اس کا سامنا نہیں ہوا تھا۔ اس کی ایک بہت بڑی مشکل حل ہوگئی تھی۔ اب وہ اس قاتل سے بڑی آسانی سے انتقام لے سکتی تھی۔ شکار خود چل کر آ گیا تھا۔ شادی کے بعد ہی وہ کوئی منصوبہ بنا سکتی تھی۔ اب اس کے پاس انتقام لینے کے وسائل بھی نہیں تھے۔ موقع بھی نہیں تھا۔ وہ آج مایوں بیٹھ رہی تھی۔ اس کے گرد ہر وقت لڑکیاں رہیں گی۔ شادی کے دن تک یہی صورت حال رہے گی۔ کیا جمال کو وہ بتائے کہ اس کے انکل ہی اس کے والدین کے قاتل ہیں؟ اسے یہ سب کچھ بتانے کی کیا ضرورت ہے؟ جمال اس کی بات کو کبھی سچ نہیں مانے گا۔ وہ ٹھوس ثبوت مانگے گا۔ اس کے پاس ثبوت کہاں ہے؟

”دلہن رانی کیا سوچ رہی ہیں؟“ بیلا نے اس کا بازو ہلایا۔ ”یہ آپ کھڑے کھڑے کن خیالوں میں کھو گئی ہیں؟ کیا جمال بھیا کے......؟“ سپنا ایک وجہ سے چونکی اور زبردستی مسکرانے لگی تو بیلا بولی۔ ”کہئے تو جمال بھیا کے کمرے میں پہنچا دوں؟“

☆......☆......☆

وقار حسین اپنے کمرے میں پہنچ کر بستر پر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنے ذہن پر زور دیتے ہوئے سوچا کہ اس نے یہ چہرہ کہاں دیکھا تھا۔ اس چہرے میں رقیہ خانم کی کس قدر مشابہت ہے۔ پھر اسے اچانک یاد آ گیا کہ یہ چہرہ اس نے کومیلا میں دیکھا تھا۔ اس لڑکی نے ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر اس سے تھوڑی دیر تک بات کی تھی۔ اس نے اپنے بارے میں بتایا کہ وہ کالج میں پڑھتی ہے۔ اس کی ماں ایک اسکول میں استانی ہے۔ اس نے اپنی ماں کا نام کچھ بتایا تھا جو اس وقت اسے یاد نہیں آ رہا تھا۔ اس نے اپنے باپ کا نام مشتاق چودھری بتایا تھا۔ مگر یہ لڑکی وہ کیسے ہو سکتی ہے۔ جمال نے اسے جو بتایا تھا اس کے مطابق یہ لڑکی کلکتہ کی رہنے والی تھی۔ اس کے والدین ٹریفک حادثے میں چل بسے تھے مگر دو لڑکیوں میں اس قدر گہری مشابہت؟ جسامت، قد و قامت بھی بالکل ایک جیسا، نام بھی ایک ہی، وہ اس لڑکی کی تلاش میں تو کومیلا جا رہا ہے۔ جب وہ اس لڑکی کو جمال کی بیوی کے بارے میں بتائے گا تو کیا وہ اس کی بات کا یقین کر لے گی؟ وہ اس لڑکی کی شادی کی تصویر لے کر اب دکھائے گا۔ شاید تب اسے یقین آ جائے گا اور پھر اسے کس قدر حیرت ہوگی۔

جب رات کی تاریکی دبیز اور گہری ہو گئی' فضا خاموش اندھیرے کی چادر تان کر سو گئی تو وقار حسین نے ناول بند کر کے سرہانے رکھ دیا۔ بستر سے نکل کر اس نے بستر کی چادر درست کی۔ پھر چند لمحوں تک کمرے میں اضطراب کی حالت میں ٹہلتا اور سوچتا رہا۔ پھر بیڈ لیمپ بجھا کر وہ بستر پر لیٹ گیا مگر دیر تک اسے نیند نہیں آئی۔ آسمان پر کالے کالے بادلوں کی وجہ سے حبس ہو گیا تھا۔ ہوا بھی بند تھی۔ اس نے سوچا کہ ایئر کنڈیشنڈ آن کر لے۔ پھر وہ کسی خیال کے زیر اثر کھڑکی میں جا کھڑا ہوا۔ باہر ہلکی ہلکی ہوا کے جھونکے درختوں کے پتوں کا منہ چوم رہے تھے۔ فضا میں ہلکی سی سرسراہٹ پیدا ہو گئی تھی جیسے کوئی سرگوشیاں کر رہا ہو۔ پھر اس نے سوچا کہ چھت پر جا کر چہل قدمی کرنا چاہیے۔

وقار حسین کمرے سے نکلا تو گہرا اندھیرا تھا۔ اس نے اوپر کی منزل پر جانے والے زینے پر آہٹ سنی۔ اس نے اندازہ لگایا کہ نسیمہ اور خدیجہ شاید دلہن کے کمرے سے نکل کر اپنے اپنے کمروں کی طرف جا رہی ہیں۔ زینہ دور تھا اور اندھیرا بھی تھا۔ اس لئے وہ اسے نظر نہیں آ رہی تھیں۔ وہ یہ بھی سن نہ سکا کہ وہ آپس میں کیا باتیں کر رہی تھیں۔ چند لمحوں کے بعد وہ مہمان خانے کے حصے سے نکل کر چھت پر جانے والے زینے کی طرف بڑھا۔ اندھیرے میں لپٹی ہوئی حویلی اونگھ رہی تھی۔ کسی کمرے سے روشنی نہیں جھانک رہی تھی۔ ابھی وہ قریب نہیں پہنچا تھا کہ دالان کے اندھیرے میں ایک ہیولا سا دکھائی دیا۔ کون ہو سکتا ہے؟ وقار حسین نے ٹھٹھک کے رکتے ہوئے سوچا۔ وہ آنکھیں پھاڑ کے اندھیرے میں دیکھنے لگا۔ پھر اس نے دبے لہجے میں پوچھا۔ ''کون ہے؟''

اندھیرے میں اس ہیولے نے قریب آ کر سرگوشی میں آہستگی سے جواب دیا۔

''بڑے صاحب! میں چمپا ہوں۔''

''تم اس وقت کہاں جا رہی ہو؟'' وقار حسین نے تعجب سے کہا۔ ''خیریت تو ہے؟ کیا تمہیں کسی نے اس وقت بلایا ہے؟''

''میں مہمان خانے آپ ہی کے پاس جا رہی تھی۔'' چمپا رک رک کر وحشت زدہ انداز سے بولی۔ ''صبح آپ نہیں تھے۔ شام کو موقع نہیں ملا آپ کے پاس آنے کا۔ میں آپ کو کچھ بتانے ہی آ رہی تھی۔ کیا یہیں بتا دوں؟''

''کہو کیا کہنا ہے؟'' وقار حسین سنبھل کر کھڑا ہو گیا۔

''اس غریب دلہن کے خلاف بڑے زور کی کھچڑی پک رہی ہے۔'' چمپا نے بکھرے لہجے میں کہا۔ ''ایسا لگ رہا ہے کہ یہ شادی نہیں ہو سکے گی۔ اگر خیریت سے ہو گئی تو

پھر آنے والے دن خیریت سے گزر نہیں سکیں گے۔ دلہن پر ضرور کوئی بجلی گرے گی۔''

''یہ کھچڑی کون اور کس لئے پکا رہا ہے؟'' وقار حسین نے حیرت سے کہا۔''اس غریب اور معصوم نے کسی کا کیا بگاڑا ہے؟''

''چھوٹی اور بڑی بہومل کر اس کے خلاف سازش تیار کر رہی ہیں۔ وہ نہیں چاہتیں کہ یہ شادی کسی قیمت پر ہو۔''

''چھوٹی اور بڑی بہو؟'' وقار حسین کے لہجے میں بدستور حیرت تھی۔''جمال تو بتا رہے تھے کہ ان کی دونوں بھابیاں اس شادی میں پیش پیش ہیں۔''

''چھوٹے بھیا نے غلط نہیں کہا ہے۔'' اس کا لہجہ ٹوٹا ہوا سا تھا۔''دال میں کالا ہے۔ ان کے تیور اچھے نہیں ہیں۔ ان دونوں کو جب بھی موقع ملتا ہے وہ سر جوڑ کے خالی کمرے میں بیٹھ جاتی ہیں۔ میں نے آج سنا' نسیمہ بیگم اپنی دیورانی سے کہہ رہی تھیں کہ موت ہی اس کا واحد حل ہے۔''

''کیا تم چاہتی ہو کہ میں اس سازش سے تمہارے چھوٹے صاحب کو آگاہ کر دوں؟'' وقار حسین نے دریافت کیا۔

''جی بڑے صاب!'' چمپا نے سر ہلایا۔ وقار حسین نے اندھیرے میں اس کی آنکھوں کو چمکتے دیکھا۔''اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔''

''میں انہیں سازش کا ذریعہ کیا بتاؤں؟'' وقار حسین نے کہا۔''تمہارا نام لے دوں؟'' وہ سراسیمگی سے بولی۔''بڑی بہو اور چھوٹی بہو پر انہیں بڑا اعتماد ہے۔ وہ ایک نوکرانی کی بات کا یقین کیوں کرنے لگے۔''

چند لمحوں تک گہری خاموشی طاری رہی۔ پھر وقار حسین نے اسے دلاسہ دیا۔''تم فکر نہ کرو۔ میں اشارے کنایوں میں سمجھا دوں گا۔''

اس وقت سیڑھیوں پر قدموں کی آوازیں ابھریں۔ چمپا سراسیمہ ہوگئی۔''صاب! کوئی آ رہا......'' وقار حسین نے اس کے منہ پر جھٹ سے ہاتھ رکھ دیا۔''چپ رہو۔'' پھر وہ چمپا کے کان کے پاس منہ لے جا کر بولا۔''شاید وہ دونوں آ رہی ہیں۔''

وقار حسین نے محسوس کیا کہ وہ بڑی خاموشی اور پراسرار انداز سے آ رہی ہیں۔ اس نے چمپا کا ہاتھ پکڑا اور ستون کی آڑ میں ہو گیا۔ چند لمحوں کے بعد دو سائے زینے پر نمودار ہوئے اور چھت والے زینے کی طرف بڑھ گئے۔ چمپا ستون سے چپکی دم بخود تھی۔ وقار حسین بھی اپنے سانس روکے ہوئے تھا۔ اس نے ان دونوں کو پہچان لیا۔ وہ نسیمہ اور خدیجہ

تھیں۔ جب وہ چھت پر چلی گئیں تو اس نے چمپا سے سرگوشی میں کہا۔ ''اب تم جاؤ۔ کوئی نئی بات دیکھو، سنو تو مجھے آ کر اطلاع دینا۔'' اس نے اپنی جیب سے سو ٹاکا کا ایک نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔ ''لو اسے رکھ لو۔ اپنے بچے کے لئے کچھ خرید لینا۔''

چمپا نے آنکھیں پھاڑ کے نوٹ کی طرف دیکھا۔ اس نے نوٹ نہیں لیا۔ آہستگی سے بولی۔ ''نہیں صاب! میں کسی لالچ میں آ کر یہ کام تھوڑی کر رہی ہوں۔ میں اس گھر کو بچانا چاہتی ہوں۔ اس لئے کہ اس گھر کا نمک سولہ برس سے کھا رہی ہوں۔''

''تم بھی اپنی ماں پر گئی ہو۔'' وقار حسین نے تعریفی لہجے میں کہا۔ ''وہ بھی نیک اور مخلص تھی۔ یہ میں تمہیں نہیں تمہارے بچے کے لئے دے رہا ہوں، رکھ لو۔''

پھر اس نے جھجکتے ہوئے نوٹ لے لیا۔ جدھر سے آئی تھی اسی طرف تیزی سے لوٹ گئی۔ وقار حسین چھت والے زینے کی طرف بڑھ گیا۔ وہاں اسے تجسس لے گیا تھا۔ وہ دبے پاؤں اور بے آواز اوپر پہنچا۔ گھپ اندھیرے نے نسیمہ اور خدیجہ کو نگل لیا تھا۔ اس لئے وہ دکھائی نہیں دے رہی تھیں۔ پھر اس نے خدیجہ کی آواز سنی جو قریب سے سنائی دی۔ وہ سرگوشی میں کہہ رہی تھی۔ ''مناف سرکار نے کیا کہا؟ وہ راضی ہو گیا؟''

''وہ کیسے راضی نہیں ہوتا؟'' نسیمہ استہزائی لہجے میں بولی۔ ''میں نے اسے ایک ہزار ٹاکا جو دیئے ہیں۔''

''کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ کسی موقع پر بات اگل دے اور سارا الزام تمہارے سر آ جائے۔'' خدیجہ نے خدشہ ظاہر کیا۔

''اس بات کا اس کے پاس کیا ثبوت ہوگا۔'' نسیمہ تیزی سے بولی۔ ''تم ڈرتی کیوں ہو؟ اگر اس نے اپنی زبان کھولی تو وہ بھی لٹک جائے گا۔ مگر یہ راز کون افشا کرے گا؟ اس کے ہم تینوں راز دار ہیں۔ کسی کو افشا کرنے کی ضرورت بھی کیا ہے۔''

''بڑی احتیاط سے کام لینا۔'' خدیجہ خوف زدہ لہجے میں بولی۔ ''نجانے کیوں ابھی سے میرا دل بری طرح دھڑک رہا ہے۔''

''شادی میں ابھی پورے تین دن باقی ہیں اور تم ابھی سے حوصلہ ہار رہی ہو۔'' خدیجہ نے تنبیہہ کے لہجے میں کہا۔ ''اس روز تو تمہیں اپنے آپ کو پوری طرح قابو میں رکھنا ہے خدیجہ بیگم! کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہاری ذرا سی بد احتیاطی اور بدحواسی سارا کام خراب کر دے۔ خدانخواستہ ایسا ہوا تو پھر ہر کسی کو تم پر شک ہو جائے گا۔ پھر تم نہ صرف خود ڈوبو گی بلکہ مجھے بھی لے ڈوبو گی۔ جانتی ہو اس کی سزا کیا ہو سکتی ہے؟''

''میں پوری کوشش کروں گی کہ اپنے آپ کو قابو میں رکھوں۔'' خدیجہ نے اسے مضبوط لہجے میں یقین دلایا۔

وہ تھوڑی دیر تک آپس میں کھسر پھسر کرتی رہی تھیں۔ اسے کچھ الفاظ تو صاف اور واضح طور پر سنائی دیئے تھے۔ کچھ مبہم اور کچھ معنی خیز تھے۔ جب ان دونوں نے چلنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ وقار حسین تیزی سے چھت کے دوسرے کونے کی طرف بڑھ گیا اور ایک ستون کی آڑ میں کھڑا ہو گیا۔ پھر وہ چلی گئیں تو ستون سے نکل کر منڈیر کے پاس آیا اور اس پر بہت دیر تک بیٹھا رہا۔ ان کے فقروں اور جملوں پر غور کرنے لگا۔ ان کی تہہ میں پہنچنے کی کوشش کی مگر وہ ان کی گفتگو سے کوئی نتیجہ اخذ نہ کر سکا۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ شادی والے دن ان کا کیا منصوبہ ہے۔ چمپا کی باتوں کی روشنی میں وہ اتنا ہی جان سکا کہ کوئی گہری سازش اس معصوم لڑکی کے خلاف تیار کی جا رہی ہے۔ وہ جمال کو کس طرح سے آگاہ کرے۔ اس نے کچھ دیر بعد دل میں یہ فیصلہ کیا کہ وہ جمال سے اس موضوع پر کل کسی وقت بات کرے گا۔

شادی والے دن سورج طلوع ہوتے ہی پوری حویلی میں عید کا سا سماں تھا۔ پورے بیس برس کے بعد اس حویلی میں شادی بڑے تزک و احتشام سے ہو رہی تھی۔ بیس برس پہلے کمال کی شادی ہوئی تھی۔ حویلی کو دلہن کی طرح سجایا گیا تھا۔ ایسی چہل پہل اور رونق تھی کہ جو دیکھتا حیرت اور رشک سے دیکھتا رہ جاتا تھا۔ عورتوں اور بچوں کے بھڑک دار لباسوں نے ایک عجیب سا حسن پیدا کر دیا تھا۔ خدیجہ نے اپنے آپ کو پوری طرح قابو میں رکھا ہوا تھا۔ اس پر اسے خود حیرت ہو رہی تھی۔ ہر کام منصوبے کے مطابق ہو رہا تھا۔ کسی خوف و خدشے کی بات نہ تھی۔

سپنا کو دلہن بنانے اور اس کا سنگھار کرنے کے لئے بیوٹی پارلر والوں کی خدمات مستعار نہیں لی گئی تھیں۔ خدیجہ نے کہہ دیا تھا کہ وہ خود اسے اپنی چھوٹی بہن کی طرح تیار کرے گی۔ البتہ اس نے نوجوان سہاگنوں اور بیلا کی سہیلیوں کو ساتھ لے لیا تھا۔ ان سب نے مل کر نہایت ذوق و شوق سے خدیجہ کا ہاتھ بٹایا تھا۔ سپنا دلہن بن کر تیار ہو گئی تو وہ اس قدر حسین دکھائی دی کہ کسی کو یقین نہیں آیا۔ ایک لمحے کے لئے خدیجہ کے دل میں کوئی چیز چبھنے لگی کہ وہ کیوں اس معصوم اور نیک سیرت لڑکی کی زندگی کی دشمن ہو گئی۔ آخر اس لڑکی نے اس کا کیا بگاڑا ہے جو وہ اسے موت کے منہ میں دھکیل رہی ہے۔ آج اسے اپنے ہاتھوں سے سہاگ جوڑا پہنایا ہے کل اسے کفن پہناؤ گی۔ کتنے دکھ اور شرم کی بات کی ہے۔

رات کو جب اس کے کمرے میں موجود بیلا اور اس کی تمام سہیلیاں گہری نیند سو گئی تھیں تب سپنا بڑی دیر تک اپنی ماں کو یاد کر کے روتی رہی تھی۔ اسے اپنی ماں کی یاد آتی رہی تھی جس کے بارے میں اسے کچھ پتہ نہ تھا۔ اس کے باپ کا قاتل اس حویلی کے مہمان خانے میں موجود تھا۔ اس سے وہ انتقام لے سکتی تھی۔ اس کا موقع تھا مگر اس کے پاس قاتل کی زندگی کا چراغ گل کرنے کے لئے کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ پھر اس نے اپنے دل کو تسلی دی کہ ایسی بھی جلد بازی کی کیا ضرورت ہے۔ اس کے باپ کا قاتل اب اس کے ہاتھ سے بچ کر کہاں جائے گا۔

صبح وہ بیدار ہوئی تو اسے سب سے پہلے اپنی ماں ہی کی یاد آئی تھی۔ وہ بڑی جذباتی ہو گئی تھی۔ اس کی ماں اگر یہاں ہوتی اور اپنے گھر سے اسے رخصت کرتی تو کیسی خوشی کی بات ہوتی۔ اس کی شادی جس شاہانہ انداز اور دھوم دھام سے ہو رہی تھی اس طرح سے شادی کرنا اس کی ماں کے بس کی بات نہیں تھی۔ اصل خوشی تو ماں کی موجودگی تھی جس سے وہ محروم تھی۔ دوسری طرف اسے اس بات سے بھی خوشی ہو رہی تھی کہ وہ اتنی بڑی دنیا میں اکیلی نہیں ہے۔ نہال اس کا بھائی بنا ہوا ہے۔ بیلا بھی چھوٹی بہن کی طرح پیش آ رہی تھی۔ اس کا سارا وجود محبت کے سمندر میں غوطہ زن تھا۔

حویلی کے عقب خانے میں جو بہت بڑا میدان تھا اس میں بہت بڑا پنڈال لگایا گیا تھا۔ ایک خوبصورت اور نہایت آراستہ و پیراستہ اسٹیج تیار کیا گیا تھا۔ عصر کی نماز کے بعد نکاح پڑھایا گیا تھا۔ ایجاب و قبول کا مرحلہ بھی طے ہو گیا۔ نکاح کے بعد مہمانوں میں چھوہارے تقسیم کئے گئے۔

☆......☆......☆

بھائیوں‘ دوستوں اور رشتہ داروں نے جمال کو بڑی محبت‘ بڑے خلوص اور گرمجوشی سے گلے لگا کرنئی زندگی کے خوشگوار سفر کے آغاز کی مبارکباد دی تھی۔ جمال آج اتنا خوش تھا کہ اس کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا زندگی میں پہلی بار اس کی روح کو جو طمانیت اور اس کے قلب کو جو مسرت مل رہی تھی‘ وہ اس سے محروم تھا خدا نے اس کی جھولی خوشیوں سے بھر دی تھی آج اسے اپنی منزل‘ اپنے خواب اور کھویا ہوا سویرا مل گیا تھا اس نے ساری زندگی سپنا جیسی لڑکی کا سپنا دیکھا تھا اس لئے اس نے اب تک شادی نہیں کی تھی وہ کئی بار سوچ چکا تھا کہ دلہن کے روپ میں سپنا کیسی لگ رہی ہوگی جس وقت وہ دولہا بننے کی تیاری کر رہا تھا تب بیلا کسی کام سے اس کے کمرے میں آئی تھی اس نے ازراہ مذاق بیلا سے پوچھا تھا۔ ’’ایمانداری سے بتانا کہ میں زیادہ خوبصورت لگ رہا ہوں یا دلہن......؟‘‘

’’کہاں ذرہ کہاں آفتاب......‘‘۔ بیلا نے برجستہ جواب دیا۔ ’’آپ کہاں ہماری دلہن سے موازنہ کرنے چلے ہیں...... آپ ہماری دلہن کو دیکھیں گے تو پہلی ہی نظر میں بے ہوش ہو جائیں گے۔‘‘

’’لگتا ہے کہ دلہن کی طرف سے تمہیں بڑی بھاری رشوت ملی ہے جو تم اس کے قصیدے پڑھ رہی ہو۔‘‘ اس نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔

’’بھیا!‘‘ بیلا ایک دم سنجیدہ ہو گئی تھی۔ ’’آپ واقعی بہت خوش قسمت ہیں کہ آپ کو سپنا جیسی ہم سفر ملی۔‘‘

جمال نے بڑی کوشش کی تھی کہ رخصتی سے قبل کسی طرح سپنا کی ایک جھلک دیکھ لے اس کی ہر کوشش لڑکیوں نے ناکام بنا دی تھی اس نے انہیں جو رشوت دی تھی وہ بھی ہڑپ کر لی گئی تھی گھر کی لڑکیوں کو اسے ستانے میں بڑا لطف آ رہا تھا۔

رخصتی خدیجہ کے ہاں سے ہوئی تھی زیب النساء اور نسیمہ اسے رخصت کرا کے لے

جانے آئی تھیں سپنا کی رخصتی روایتی انداز سے ہوئی تھی جس وقت اسے ڈولی میں بٹھانے لے جایا جا رہا تھا عورتیں جذباتی ہو کر رونے لگی تھیں انہیں اپنی بیٹیوں کی رخصتی یاد آ گئی تھی خدیجہ نے سپنا کو ایک بیٹی کی طرح گلے لگا کر رخصت کیا تب سپنا کا دل آپ ہی بھر آیا تھا اسے اپنی ماں یاد آئی اس کی ماں ہوتی تو وہ اسی طرح رخصت کرتی۔

سپنا کو حجلۂ عروسی میں پہنچانے کے بعد جمال کو پھر بھی اندر داخل ہونے اور سپنا کو دیکھنے نہیں دیا گیا تھا اس لئے کہ لڑکیاں اور عورتیں کچھ رسومات کرنا اور سپنا کے ساتھ تصویریں کھنچوانا چاہتی تھیں جمال نشست گاہ میں بیٹھا مہمانوں اور دوستوں سے باتیں کرنے لگا جو اپنی فیملی کو لے جانے کے لئے بیٹھے تھے اس پر ایک ایک لمحہ صدی کی طرح بھاری ہو رہا تھا اسے ایسے لگ رہا تھا جیسے وقت کی نبض رک گئی ہو۔

جس وقت حجلۂ عروسی میں صرف گھر کی عورتیں رہ گئی تھیں تب وقار حسین اندر آیا تا کہ منہ دکھائی میں اپنی طرف سے کچھ پیش کر سکے وہ مسہری کے کنارے بیٹھی تھی اس کا سر جھکا ہوا تھا نگاہیں فرش پر جمی تھیں چہرے پر حیا کی چادر تنی ہوئی تھی وقار حسین نے حسن و جمال کے اس حسین مرقع کو دیکھا جمال نے اس کے بارے میں جو بتایا تھا' وہ اس معمے کو حل نہیں کر سکا تھا اسے تو کومیلا اور کلکتہ کی سپنا میں کوئی فرق دکھائی نہیں دے رہا تھا وہ یہ سمجھنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ وہ دونوں جڑواں بہنیں ہیں وہ آج بھی اس سپنا میں ایسی مقناطیسی کشش محسوس کر رہا تھا جو اس نے کومیلا کی سپنا کو پہلی بار دیکھ کر محسوس کیا تھا اسے ایسا لگ رہا تھا اس سپنا سے بھی اس کا کوئی گہرا پاکیزہ اور اچھوتا رشتہ ہے جیسے کسی اپنے سے ہوتا ہے۔

''سپنا بھابی!'' بیلا نے اپنا منہ اس کے پاس لے جا کر آہستہ سے کہا۔''وقار انکل آئے ہیں آپ سے ملنے۔''

''وقار انکل......؟''اس نے سراسیمہ ہو کر نظریں اٹھا کر وقار حسین کی طرف دیکھا جو اسے ایک باپ کی سی شفقت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا اس کی رگوں میں خون کی گردش تیز ہو گئی' دل تیزی سے دھڑکنے لگا اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی سلام کر دیا یہ شخص اس خاندان کے ایک اہم فرد کی طرح تھا ہر شخص اس کی بہت عزت کرتا تھا جمال تو اسے اپنے باپ کی جگہ سمجھتا تھا اسے موقع ہی نہیں مل سکا تھا کہ وہ جمال کو اعتماد میں لے کر اس شخص کے بارے میں بتا سکے اس کے اندر نفرت کی لہر اٹھی اسے اپنی ماں کی بازگشت کی آواز آئی۔''یہ تمہارے باپ کا قاتل ہے میں نے اس سے انتقام لینے کا فریضہ تمہیں سونپا ہے تم زندگی کے

اس نئے سفر میں اس سے انتقام لینا نہیں بھول جانا جواب تمہارا ورثہ ہے۔''

وقار حسین نے اس کے سلام کے جواب میں اس کے پاس جا کر اپنا ہاتھ بڑی محبت اور شفقت سے اس کے سر پر رکھا تو اس کے سارے بدن میں نفرت کی شدید لہر اٹھی سپنا نے ایک لمحے کے لئے سوچا کہ وقار حسین کے ہاتھ کو بری طرح سے جھٹک دے اور سب کے سامنے اس قاتل اور بے رحم شخص کا گریبان پکڑ کر پوچھے کہ آخر اس کے باپ نے ایسا کیا جرم کیا تھا جو اس نے اس کے معصوم اور بے گناہ باپ کو قتل کر دیا مگر وہ صرف سوچ کر اندر ہی اندر کھول کر رہ گئی آج اس کا موقع نہیں تھا یہ شخص بڑی آسانی سے اپنی بے گناہی ثابت کر دیتا اس کے پاس اس قاتل کے خلاف کوئی ثبوت بھی تو نہ تھا۔

وقار حسین نے اسے بہت ساری دعائیں دینے اور اس کی تعریف کرنے کے بعد اپنی جیب سے ایک ہار نکالا تو ہر کوئی اس خوبصورت اور بے حد شاندار ہار کو دیکھتا رہ گیا یہ ہیرے کا بیش قیمت ہار تھا اس سے سارا کمرہ جگمگا اٹھا سپنا کی آنکھیں بھی چندھیا گئی تھیں۔

''انکل!'' بیلا تحیر زدہ لہجے میں بولی۔''آپ نے تکلف کی حد کر دی اس قدر بیش قیمت ہار خرید کر دینے کی کیا ضرورت تھی؟''

''اگر آج میری کوئی بیٹی ہوتی تو کیا میں اسے اس کی شادی کے موقع پر کوئی قیمتی تحفہ نہیں دیتا۔'' وقار حسین مسکرایا۔''اللہ نے مجھے نہ بیٹی دی نہ کوئی بیٹا دیا جمال کو میں اپنے بیٹے کی طرح سمجھتا ہوں سپنا نہ صرف میری بہو ہے بلکہ بیٹی بھی ہے دیکھا جائے تو یہ تحفہ میری شہزادی جیسی بہو کے شایان شان بالکل نہیں ہے۔''

اسی لمحے خدیجہ کمرے میں داخل ہو کر بولی۔''اس غریب کا بھی کسی کو خیال ہے جو دوسرے کمرے میں اکیلا بیٹھا ہے چلو نکلو کمرہ خالی کرو رات کا ایک بجنے میں دس بارہ منٹ باقی ہیں کیا وہ ساری رات باہر بیٹھا رہے گا۔'' خدیجہ نے وقار حسین اور ایک ایک کر کے تمام لڑکیوں اور عورتوں سے کمرہ خالی کرنے کی درخواست کی جب کمرہ خالی ہو گیا تو وہ اور سپنا رہ گئیں وہ بھی لمحوں کے بعد کمرے سے نکل گئی تو نسیمہ بڑے پراسرار انداز سے کمرے میں داخل ہوئی اس نے ایک ٹرے اٹھا رکھی تھی جس میں دودھ کا ایک گلاس اور ایک پانی کا گلاس تھا ایک طشتری میں مٹھائی تھی وہ کچھ سراسیمہ سی تھی' چہرہ تمتما رہا تھا' پیشانی عرق آلود ہو رہی تھی وہ ٹرے میز پر رکھتے ہوئے بولی۔''سپنا بیٹی! جمال دودھ بالکل نہیں پیتا اسے بچپن سے دودھ بالکل پسند نہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ اسے دودھ بالکل موافق نہیں آتا ہے تم دودھ پی

لینا اسے نہیں دینا۔“

نسیمہ جس انداز سے آئی تھی اسی انداز سے واپس بھی چلی گئی جاتے ہوئے وہ دروازہ بند کرتی گئی تھی اس کے کمرے سے نکلتے ہی سپنا نے اپنے گلے کی طرف دیکھا اس کے گلے میں سونے کے ہار کے دو تین سیٹ اور بھی پڑے تھے اسے سونے کے بیش قیمت زیورات سے اوپر سے نیچے تک لاد دیا گیا تھا ان سب میں سب سے خوبصورت پیارا اور قیمتی ہار وقار حسین کا دیا ہوا تھا اس کے باپ کے قاتل کا تحفہ سب سے قیمتی اور پیارا بھی تھا ایسے لگ رہا تھا اس کے باپ کے قاتل نے اس کے گلے میں کوئی خوبصورت پھندا ڈال دیا ہو وہ جیسے اس پھندے سے اس کا گلا گھونٹ کر مار دینا چاہتا ہے اسے ایک دم سے گھٹن کا احساس ہونے لگا اس نے اپنا ہاتھ بڑھایا کہ اس ہار کو نوچ کر ایک طرف پھینک دے۔ دفعتاً اس نے کمرے کے باہر چھائے ہوئے سناٹے میں قدموں کی آوازیں سنیں شاید جمال آ رہا ہے؟ وہ سنبھل کر سکڑ اور سمٹ کر بیٹھ گئی۔

چند لمحوں بعد سپنا نے دروازے کے ہینڈل کو گھومتے ہوئے دیکھا تو وہ فوراً ہی مسہری سے اتر کر کھڑی ہو گئی اور پھر اس نے اپنا لمبا سا گھونگٹ نکال لیا یہ اس دیش کی ریت تھی دلہن شادی کی پہلی رات اس طرح سے اپنے ہم سفر کا انتظار اور استقبال کرتی تھی اس میں احترام کا جذبہ غالب ہوتا تھا اس طرح سے وہ اپنے شوہر کو مجازی خدا کا درجہ دیتی تھی وہ محسوس کر رہی تھی کہ جمال نے اندر داخل ہو کر دروازہ بند کر دیا ہے اور اب غیر محسوس انداز سے دروازے کی کنڈی لگا کر اس کی طرف آہستہ آہستہ بڑھ رہا ہے چند لمحوں کے بعد وہ اس کے روبرو پہنچ کر رک گیا۔

”حسن و محبت کے دربار میں اس غلام کا آداب عرض قبول کیجئے۔“ جمال نے بڑی آہستگی مگر شوخی سے کہا۔ ”آج تو آپ اس بندے کو بالکل ہی بھول گئی تھیں جو آپ کے دیدار کے لئے برسوں سے تڑپ رہا تھا سماج دیوار بن گیا تھا آپ سے اتنا بھی نہ ہو سکا کہ یہ دیوار ہی گرا دیں۔“

سپنا نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا فطری حیا مانع تھی اس نے اپنے دل میں مخاطب کر کے کہا میں بھی تو آپ کے انتظار کی آگ میں جل رہی تھی۔

جمال نے اپنی جیب سے ایک خوبصورت انگوٹھی نکال کر اس کی انگلی میں پہنا دی پھر دونوں ہاتھوں سے اس کا گھونگٹ الٹ دیا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے مسہری پر بٹھا دیا اسے

دیکھنے لگا جمال کو ایسا لگ رہا تھا کہ چودھویں کا چاند اس کے کمرے میں اتر آیا ہو دلہن کے روپ میں سپنا یکسر بدل گئی تھی سپنا کے اس نے کئی روپ دیکھے تھے یہ روپ ان سب سے مختلف تھا اس کے چہرے پر ایک عجیب اور بے حد دلکش نکھار آ گیا تھا وہ اس کے تصور سے کہیں حسین دکھائی دے رہی تھی چہرے پر گلاب کھل رہے تھے موہنی صورت اس کے دل پہ نقش ہوئی جا رہی تھی۔

شادی سے دو روحوں کا ملاپ ہوتا ہے ایک رومانی سفر کا آغاز ہوتا ہے آج وہ دونوں ایک دوسرے کو پا کر بہت خوش تھے وہ دونوں بہت دیر تک باتیں کرتے رہے باتیں تھیں کہ ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھیں لیکن وقت تھا کہ تیزی سے گزرتا جا رہا تھا جمال کو یک لخت احساس ہوا تو اس نے چونک کر دیوار گیر گھڑی کی طرف دیکھا رات کے تین بج چکے تھے اس نے گھڑی سے اپنی نگاہیں ہٹا کر سپنا کے چہرے پر مرکوز کر دیں سپنا کے خوبصورت چہرے پر ایک دل فریب مسکراہٹ بکھری ہوئی تھی اور چہرہ شگفتہ دکھائی دے رہا تھا مگر اس کی جھیل جیسی آنکھوں کے افق پر نیند کے بادل منڈلا رہے تھے جمال نے محسوس کیا کہ وہ تھکی تھکی سی ہے لیکن اس کا اظہار ہونے نہیں دے رہی ہے اسے اس بات کا اندازہ تھا کہ سپنا تین چار راتوں سے مسلسل دیر تک جاگ رہی ہے کیونکہ لڑکے لڑکیاں اور عورتیں سپنا کے کمرے میں جمع ہو کر تین چار بجے تک دھما چوکڑی مچاتی تھیں' شادی کے گیت گائے جاتے تھے' محفل موسیقی تو لازی چیز تھی' رقص کی محفل بھی جمتی تھی وہ نہ سوتی تھیں اور نہ سپنا کو سونے دیتی تھیں پھر صبح سات آٹھ بجے بیدار ہو کر پھر شور شرابا کرنے لگتی تھیں اس طرح وہ اسے اس بات کا احساس ہونے نہیں دیتی تھیں کہ وہ اس دنیا میں اکیلی ہے۔

جمال نے خجالت سے کہا۔''اگرچہ آج کی رات تو جاگنے کی ہے لیکن میں نے تمہیں دیر تک جگائے رکھ کر بڑا ظلم کیا ہے تم بہت زیادہ تھکی ہوئی ہو اس کا مجھے احساس ہی نہیں ہو سکا میں تمہیں اپنے سامنے پا کر نہ صرف اپنا ہوش کھو بیٹھا بلکہ خود غرض اور بے حس بھی ہو گیا آئی ایم سوری۔''

مسہری کے پاس والی میز پر دودھ اور پانی کا گلاس اور مٹھائی کی پلیٹ رکھی ہوئی تھی سپنا نے جب دودھ کا گلاس جمال کی طرف بڑھایا تو اس نے بغیر کسی جھجک کے گلاس لے لیا اس وقت سپنا کے ذہن میں نسیمہ کی بات بالکل نہ تھی جس وقت جمال دودھ کا گلاس اپنے منہ سے لگانے لگا تب اسے اچانک نسیمہ کی بات یاد آئی اس نے فوراً اپنا خوبصورت

ہاتھ جمال کی طرف بڑھا کر کہا۔ ’’پلیز! دودھ کا گلاس مجھے دے دیجئے۔‘‘

’’وہ کس لئے......؟‘‘ جمال نے اس کی طرف حیرت سے دیکھا اور پوچھا۔

’’اس لئے کہ آپ دودھ نہیں پیتے۔‘‘ سپنا نے سرخ ہوتے ہوئے جواب دیا۔ ’’دودھ آپ کی طبیعت کو موافق نہیں آتا ہے۔‘‘

’’چاہے کچھ ہو جائے میں دودھ ضرور پیوں گا۔‘‘ وہ سپنا کی مخمور آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔ ’’تم نے اپنے پیارے ہاتھوں اور بڑی محبت سے جو پیش کیا ہے۔‘‘

’’جب آپ کو دودھ نقصان کرتا ہے تو پھر کیوں پی رہے ہیں؟ خدانخواستہ کچھ ہو گیا تو؟ لائیے مجھے دے دیجئے۔‘‘

’’آج کی اس یادگار اور ناقابل فراموش رات میں کسی نقصان اور فائدے کو تھوڑی دیکھا جاتا ہے؟ تم زہر بھی پیش کرتیں تو اسے حلق سے اتار لیتا۔‘‘

سپنا نے جھٹ سے اس کے منہ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ ’’میں آپ کو زہر کیوں دینے لگی؟‘‘

’’تم نے مجھے زہر دیا ہے سپنا!‘‘ جمال ایک دم سے سنجیدہ ہو گیا مگر سپنا کا چہرہ سفید پڑ گیا اس نے کچھ کہنا چاہا تو وہ کہہ نہ سکی اس کے ہونٹ کانپنے لگے تو جمال زیرلب مسکرا دیا۔ ’’کیا تم نے مجھے محبت کا زہر نہیں دیا ہے تم کل کسی بھی لیبارٹری میں میرا خون ٹیسٹ کروا کے دیکھنا یہ زہر تمہیں نس نس میں سرایت کیا ہوا ملے گا؟‘‘

سپنا نے شرما اور لجا کے اپنا خوشنما سر جھکا لیا۔ جمال نے ایک اور دلکش نظارہ دیکھا حیا کی سرخی نے سپنا کا چہرہ تر و تازہ گلاب کی مانند شگفتہ اور تر و تازہ کر دیا تھا محبت اور جذبات کے طوفان سے گزرنے کے بعد تو اور بھی حسین دکھائی دے رہی تھی سارا کمرہ ایک عجیب سی خوشبو سے مہک رہا تھا رجنی گندھا اور کرشنا چورا کے پھولوں کی خوشبو بھی اس کے آگے ماند پڑ گئی تھی اس نے سپنا کی موہنی صورت پر نظریں مرکوز کر کے دودھ کا گلاس منہ سے لگایا اور چند لمحوں کے بعد اس کی طرف مٹھائی کی پلیٹ بڑھاتے ہوئے بولا۔ ’’نوش فرمائیے!‘‘

سپنا نے مٹھائی کا ایک ٹکڑا اٹھا کر منہ میں رکھا تو جمال نے بڑی سنجیدگی سے پوچھا۔ ’’سپنا! کیا تم مجھ سے شادی کر کے واقعی خوش ہو؟‘‘

’’کاش! میں آپ کو خوشی سے بھرا دل چیر کر دکھا سکتی۔‘‘ سپنا جذباتی ہو کر حیرت سے بولی۔ ’’آپ کے دل میں یہ خیال کس لئے آیا؟‘‘

''ایک طرف تو میں تمہیں پا کر اس قدر خوش ہوں کہ اس کے اظہار کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔'' جمال گہری سانس لے کر کہنے لگا۔ ''لیکن دوسری طرف میرا دل مجھے ملامت کر رہا ہے کہ میں نے تم سے جبر و زیادتی اور تمہاری کمزوری سے فائدہ اٹھا کر شادی کی ہے تم نے شاید مجھ سے اس لئے شادی کی کہ میں نے تمہیں شکنتلا کے چنگل سے نکالا اور تم سے وعدہ کیا کہ تمہارے باپ کے قاتل اور دس شیطانوں کے گروہ سے ٹکر اور انتقام لینے میں تمہارا ہر طرح سے ساتھ دوں گا تم نے مجھ سے اس مجبوری کی بناء پر شادی کی نا......؟''

''آپ آئندہ ایسی باتیں زبان پر نہیں لائیں گے۔'' سپنا نے اپنا سر اس کے سینے پر رکھ دیا۔

☆......☆......☆

خدیجہ نیند سے ایک دم ہڑبڑا کے بیدار ہوئی جیسے اس نے کوئی بے حد ڈراؤنا خواب دیکھ لیا ہو اس کا دل بہت تیزی سے دھڑک رہا تھا اس نے اپنا ہاتھ سینے پر رکھ کر کھڑکی سے باہر دیکھا صبح ہو چکی تھی دن کا اجالا پھیلا ہوا تھا اور دن خاصا نکل آیا تھا اس نے دیوار گیر گھڑی کی طرف دیکھا تو نو بج رہے تھے اس نے نسیمہ کی طرف دیکھا وہ بھی صوفے پر گہری نیند سو رہی تھی اور اس کے چہرے پر تھکن کے آثار ہی نہیں تھے بلکہ اس کے چہرے پر ایک خوف چھایا ہوا تھا جیسے وہ کوئی بھیانک خواب دیکھ رہی ہو حویلی پر ایک خوف چھایا ہوا تھا جیسے وہ کوئی بھیانک خواب دیکھ رہی ہو حویلی پر ایک گہرا سناٹا مسلط تھا دن نکل آنے کے باوجود چاروں طرف ہو کا سا عالم تھا جیسے اس حویلی میں کوئی نہیں ہے چونکہ گھر کے تمام افراد اور نوکر چاکر فجر کی اذان سے تھوڑی دیر پہلے سوئے تھے اور بے حد تھکے ہوئے تھے اس لئے شاید ابھی تک بیدار نہیں ہوئے تھے کوئی نوکر بھی اپنی کوٹھڑی سے نہیں نکلا تھا خدیجہ کو یک لخت دولہا دلہن کا خیال آیا تو اس کی رگوں میں لہو منجمد ہونے لگا پھر اس نے نسیمہ کو بری طرح جھنجھوڑ کے رکھ دیا نسیمہ اس طرح سے بڑبڑا کر اٹھ بیٹھی جیسے اسے کسی زہریلے کیڑے نے کاٹ لیا ہو۔

''صبح کے نو بج رہے ہیں۔'' خدیجہ نے دیوار گیر گھڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تشویشناک لہجے میں کہا۔ ''بہت دیر ہوگئی؟''

''نو بج رہے ہیں؟'' نسیمہ اچھل پڑی اور اس نے پھٹی پھٹی نظروں سے دیوار گیر

گھڑی کی طرف دیکھا۔تم نے مجھے جلدی جگایا کیوں نہیں؟“

”میری ذرا آنکھ لگ گئی تھی۔“ خدیجہ نے پشیمانی سے کہا۔”میں بھی تو ابھی ابھی جاگی ہوں تم کو جلدی کیسے جگاتی؟“

”کیا سپنا موت کے منہ میں چلی گئی ہو گی؟“ نسیمہ نے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔”کہیں ایسا تو نہیں کہ دودھ جمال نے پی لیا ہو؟“

”دونوں صورتوں میں اس وقت ایک قیامت برپا ہو جاتی۔“ خدیجہ دہشت زدہ ہو کر بولی۔”میرا خیال ہے کہ وہ دونوں ہی کمرے میں مرے پڑے ہوں گے۔“

”دونوں کیسے مر سکتے ہیں؟“ نسیمہ کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔”میں نے تو صرف دودھ میں زہر ملایا تھا۔“

”میں نے مٹھائی میں بھی زہر ملا دیا تھا۔“ خدیجہ کی آواز حلق میں پھنس رہی تھی۔

”یہ بات میں تمہیں بتانا بھول گئی تھی۔“

”تم سے میں نے تو نہیں کہا تھا کہ مٹھائی میں زہر ملاؤ۔“ نسیمہ نے اپنا سر پیٹ لیا۔”احمق! تم نے یہ کیا کیا؟ ہمارا منصوبہ جمال کو ختم کرنا نہیں تھا۔“”میں نے مٹھائی میں زہر اس لئے ملایا کہ جمال کا قصہ بھی جلد ختم ہو جائے۔“ خدیجہ کو اپنی آواز بے جان اور کھوکھلی سی لگ رہی تھی۔”ان دونوں کی موت سے ہم پر کوئی الزام نہیں آئے گا اگر اکیلی سپنا مر جاتی تو ہم میں سے کسی ایک پر شک ہو جانا لازمی تھا ان دونوں کے مرنے سے یہ سمجھا جائے گا کہ انہوں نے کسی وجہ سے خودکشی کر لی ہے ہم اس طرح سے بری الذمہ ہو جائیں گی۔“

”چلو......دلہن کو تیار کرنے کے بہانے سے چل کر دیکھتے ہیں۔“ نسیمہ بولی۔

نسیمہ نے دھڑکتے دل سے دروازے پر دستک دی پہلی دستک پر اور چند لمحوں تک دروازہ نہیں کھلا تو اس کے دل کی دھڑکن بگڑنے لگی اس نے خدیجہ کا چہرہ دیکھا وہ فق ہو رہا تھا اور اس کی آنکھیں خوف و دہشت سے پھٹی جا رہی تھیں نسیمہ نے دوسری بار دستک دی تو دوسرے لمحے دروازہ کھل گیا دروازے پر جمال کھڑا تھا اس کے چہرے پر ایک عجیب سی خوشی پھوٹی پڑ رہی تھی اور اس کی آنکھوں میں نیند کا خمار بھرا ہوا تھا اس نے ایک طرف ہٹ کر انہیں اندر آنے کا راستہ دیا۔”آیئے‘ آیئے ہم آپ دونوں ہی کا انتظار کر رہے تھے۔“

کیا سپنا بھی زندہ ہے؟ نسیمہ نے ششدر ہو کر سوچا اسے خیال آیا کہ شاید انہوں

نے نہ تو دودھ پیا اور نہ ہی مٹھائی کھائی ہے اس لئے تو وہ زندہ ہیں خدیجہ نے بھی یہی سوچا تھا ان دونوں نے کمرے میں آ کر میز کی طرف دیکھا دودھ کا گلاس خالی اور جھوٹا پڑا تھا مٹھائی کا ایک ٹکڑا بھی پلیٹ میں نہ تھا جمال کو مٹھائی بہت مرغوب تھی۔

جمال ان دونوں کو سکتے کی سی حالت میں دیکھ کر مسکرایا سپنا سنگھار میز کے سامنے کھڑی اپنے گیلے بالوں کو تولئے سے پونچھ رہی تھی اس نے اپنی دیورانی اور جٹھانی کو بڑے تپاک اور ادب سے سلام کیا۔ نسیمہ نے دیکھا سپنا کا چہرہ دمک رہا تھا اور اس کی آنکھوں میں طاقتور برقی قمقموں جیسی روشنی تھی سادگی کے عالم میں رات سے کہیں حسین لگ رہی تھی یہ دونوں زہر آلود دودھ اور مٹھائی سے مرے کیوں نہیں۔

''ہم دونوں کو زندہ سلامت پا کر آپ دونوں کو حیرت اور صدمہ ہو رہا ہے نا؟''

جمال نے سنجیدہ ہو کر ان دونوں سے طنزیہ لہجے میں کہا تو ان کے چہرے سفید پڑ گئے اور انہیں غش سا آ گیا سپنا نے چونک کر تحیر زدہ نظروں سے جمال کی طرف دیکھا اسے اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا جمال کی بات اس کی سمجھ میں بھی نہیں آئی تھی۔

نسیمہ نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا تو اسے اپنی آواز کہیں دور سے آتی ہوئی سنائی دے رہی تھی۔ ''جمال! یہ کیا بکواس ہے؟''

''نسیمہ بھابی کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ آپ نے دودھ میں زہر ملایا اور سپنا کو تاکید کی کہ دودھ مجھے پینے نہ دیا جائے آخر اس غریب نے آپ کا کیا بگاڑا تھا تمہیں اس سے کیا دشمنی تھی جو آپ اسے زہر دے کر ختم کر دینا چاہتی تھیں۔''

نسیمہ کیا جواب دیتی اس کی زبان پر جیسے فالج گر گیا تھا خدیجہ فوراً بول اٹھی۔ ''یہ جھوٹ اور سراسر بہتان ہے کس نے کہا کہ بھابی نے دودھ میں زہر ملایا ہے؟ کیا کوئی زہر آلود چیز پی کر زندہ رہ سکتا ہے؟ سپنا کس طرح سے زندہ ہے؟ اگر زہر دودھ میں ملایا گیا تھا۔''

''دودھ سپنا نے نہیں میں نے پیا ہے۔'' جمال تلخی سے بولا۔ ''اور آپ نے ساری مٹھائی میں زہر ملا دیا تھا ہم دونوں نے مل کر رات ساری زہر آلود مٹھائی کھا لی آپ دونوں کی سازش اور زہر بے اثر رہا کیا یہ غلط ہے؟ کیا اب بھی یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ اس منصوبے کو کس نے افشا کیا؟''

کاٹو تو لہو نہیں تھا ان دونوں کے جسموں میں خدیجہ نے کمزور اور ٹوٹے لہجے میں

دفاع کیا۔ ’’بڑے افسوس کی بات ہے جمال تم ہم پر الزام دھر رہے ہو اگر ہمیں زہر دے کر تم دونوں کو ختم کرنا ہوتا تو ہم یہ کام پہلے ہی کر چکی ہوتیں اس کے لئے شادی کے دن کا انتظار نہیں کرتیں کسی نے تمہارے کان بھرے ہیں ہمیں زہر مل بھی کہاں سے سکتا ہے؟‘‘

’’یہ ایک سچ اور حقیقت ہے۔‘‘ جمال کرب ناک اور دکھ بھرے لہجے میں بولا۔

’’آپ دونوں نے اس دولت کی خاطر کیا جو آپ اس دنیا سے نہیں لے جا سکتی تھیں آخر میرے دونوں بھائیوں کے پاس کس چیز کی کمی ہے جس نے آپ دونوں کو دولت کے حصول کے اندھے جنون میں مبتلا کر دیا؟ پیسہ خرچ کیا جائے تو ہر چیز آسانی سے دستیاب ہو جاتی ہے یہ زہر آپ نے مناف سرکار سے نہیں خریدا......؟‘‘

اب دونوں کے لئے فرار کا راستہ نہیں رہا تھا وہ مجرموں کی طرح سر جھکائے کھڑی تھیں سپنا کو یہ سب کچھ کسی بھیانک خواب کی طرح لگ رہا تھا وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ کوئی اسے قتل کرنے کا منصوبہ بھی بنا سکتا ہے سب سے زیادہ صدمہ اسے خدیجہ سے پہنچا تھا وہ کل اس سے سگی ماں کی طرح پیش آئی تھی اسے ذرہ برابر بھی احساس نہیں ہوا تھا کہ اس عورت کے دل میں ریا کاری اور منافقت بھری ہوئی ہے وہ دم بخود کھڑی انہیں دیکھ رہی تھی۔

’’مناف سرکار کی گواہی پر آپ دونوں قتل کے الزام میں جیل جا سکتی ہیں؟ کیا میں ٹیلی فون کر کے پولیس کو بلاؤں؟‘‘

’’نہیں، آپ انہیں معاف کر دیں۔‘‘ سپنا لپک کر جمال کے پاس پہنچ کر ملتجیانہ لہجے میں بولی۔

’’میں انہیں معاف کر دوں جو تمہاری موت کی خواہاں تھیں۔‘‘ جمال نے تعجب سے کہا۔ ’’کیا یہ دونوں معافی کے قابل ہیں؟‘‘

’’آپ نہ صرف ان دونوں کو معاف کر دیں بلکہ اس واقعہ کا تذکرہ کسی سے نہ کریں میں نہیں چاہتی کہ گھر کی خوشی کی فضا میں بدمزگی گھل جائے۔‘‘

’’ایک سپنا کی ہستی ہے اور آپ ہیں اور اس کا دل اتنا بڑا ہے کہ وہ اپنے دشمنوں کو صدق دل سے معاف کر رہی ہے کیا آپ نے کبھی اتنی عظیم عورت کہیں دیکھی ہے......؟‘‘

’’ہمیں معاف کر دو سپنا!‘‘ نسیمہ نے اس کے پاس آ کر شرمندگی اور ندامت سے کہا۔ ’’دولت کی ہوس نے ہمیں اندھا کر دیا تھا۔‘‘

’’میں نے آپ دونوں کو معاف کیا اور اللہ بھی آپ کو معاف کرے۔‘‘ سپنا بے اختیار نسیمہ کے سینے سے لگ گئی اس کی آنکھیں نم ناک ہو گئیں۔ ’’میں بن ماں باپ کی لڑکی

ہوں میں جب یہاں آئی تو آپ دونوں کو دیکھ کر سوچا کہ مجھے ایک نہیں دو مائیں مل گئی ہیں آج بھی آپ دونوں میری ماں کی طرح ہیں اس واقعہ کے باوجود میرے دل میں کچھ نہیں ہے وہ آئینے کی طرح صاف ہے پلیز! آپ مجھے اپنی مامتا سے محروم نہ کریں۔"

تھوڑی دیر کے بعد وہ نادم اور اپنی نظروں میں ذلیل وخوار ہو کر اور سپنا کی عظمت دل میں لے کر چلی گئیں تو جمال نے ہنستے ہوئے کہا۔ "تم نے اپنے دشمنوں کو اتنی جلد اور اتنی آسانی سے معاف کر دیا کہ مجھے یقین نہیں آ رہا ہے تمہارا دل واقعی بہت بڑا ہے اس لئے تم نے مجھے اپنے دل میں جگہ دے دی۔"

"اچھا آپ اب یہ بتائیں کہ زہر آلود مٹھائی اور دودھ نے ہم پر اثر کیوں نہیں کیا......؟" سپنا نے پوچھا۔ "ہم زندہ کیسے ہیں؟"

"بڑے زہر نے چھوٹے زہر کو بے اثر کر دیا اس لئے ہم زندہ ہیں۔" جمال نے شوخ لہجے میں جواب دیا۔

"کیا مطلب......؟" سپنا نے اپنی آنکھیں جھپکائیں۔

"تمہاری محبت کے بڑے زہر نے اس چھوٹے زہر کے اثر کو زائل کر دیا اس وجہ سے ہم دونوں زندہ سلامت ہیں۔"

"سچ سچ بتایئے کہ اصل بات کیا ہے؟" سپنا شکایتی لہجے میں بولی۔ "آپ مجھ سے کچھ چھپانے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

"میری دونوں بھابیاں میری شادی کے سخت خلاف تھیں اس لئے کہ میری دولت کی حقدار میری بیوی ہو جائے گی۔" جمال بتانے لگا۔ "ان دونوں نے ایک سازش کی اور تمہارے خلاف منصوبہ بنایا کہ شادی کی رات تمہیں کسی طرح زہر دے کر ہلاک کر دیا جائے اس سازش کی بو چچا اور ایک بزرگ نے سونگھ لی اس بزرگ نے ان دونوں کی گفتگو سن لی تھی انہوں نے مناف سرکار کو دھمکا کر اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ نقلی زہر دیگا اس وقت صرف تمہیں ہلاک کرنے کا منصوبہ بنایا گیا تھا عین وقت پر خدیجہ نے مٹھائی تیار کرتے وقت اس میں زہر ملا دیا تاکہ میرا پتا بھی صاف کیا جا سکے چچا نے انہیں زہر ملاتے ہوئے دیکھ لیا تھا اسی بزرگ کی وجہ سے تم اور تمہارا سہاگ محفوظ ہو گیا۔"

"اس بزرگ کا نام کیا ہے......؟" سپنا نے تجسس سے پوچھا۔

"انکل وقار حسین۔" جمال نے جواب دیا۔ "تمہارے اور میرے محسن ہیں۔"

"میرے باپ کا قاتل میرا محسن؟" سپنا بڑے زور سے چونکی اس کا خون کھولنے

لگا چہرہ سرخ ہو گیا۔

''انکل نے دور اندیشی اور ذہانت سے کام نہیں لیا ہوتا تو پھر میری دونوں بھابیاں اپنے گھناؤنے منصوبے میں کامیاب ہو جاتیں۔'' جمال اپنی رو میں کہتا گیا اس نے سپنا کے چہرے کے تاثرات کو محسوس نہیں کیا۔ ''انکل کا احسان ہم ساری زندگی نہیں بھلا سکیں گے وہ تمہارے لئے تو فرشتہ ثابت ہوئے۔''

''فرشتہ؟'' سپنا نے اپنے دل میں شدید نفرت سے سوچا اسے اتنا اندازہ ہو گیا تھا کہ جمال کو وقار حسین کے بارے میں کچھ نہیں معلوم ہے وہ اسے صرف اپنے باپ کے ایک دوست کی حیثیت سے جانتا ہے جمال اس کے اصل روپ اور اصل چہرے سے واقف نہیں ہے وہ جمال کو کیوں نہ صاف صاف بتا دے کہ وقار حسین کا تعلق دس شیطانوں کے گروہ سے ہے وہی اس کے باپ کا قاتل ہے شاید اس نے اس کی ماں کو بھی قتل کیا ہے جس روز اس نے وقار حسین کو کومیلا میں دیکھا اور رات اس کے گھر پر اس کی ماں سے ملنے آیا تھا اسی روز اس کی پرسکون زندگی پر جیسے کوئی بجلی سی آ گری تھی اب پھر کہیں ایسا نہ ہو کہ دس شیطانوں کے خلاف جو مشن وہ جمال کو لے کر شروع کرنے والی ہے اس کی راہ میں دیوار نہ بن جائے۔

''میں آپ کے انکل کے بارے میں کچھ کہوں تو آپ میری بات کا......'' اس نے اپنا جملہ پورا بھی نہیں کیا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ سپنا نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا جمال نے دروازہ کھولا تو بیلا اور چمپا دروازے پر ناشتہ لئے کھڑی تھیں۔

سارا دن پوری حویلی میں بڑی رونق، چہل پہل اور گہما گہمی سی رہی تھی پھر اسے جمال سے تنہائی میں باتیں کرنے کا موقع نہیں ملا تھا ادھر خدیجہ اور نسیمہ بھی ندامت اور احساس جرم کے تحت اس کے سامنے آنے سے کتراتی رہی تھیں دوپہر کے کھانے سے فراغت پانے کے بعد وہ دو بجے سونے کے لئے بستر پر لیٹی تو اس کی آنکھ شام چھ بجے کھلی تھی رات وہ صرف بمشکل ایک گھنٹہ سو پائی تھی شادی کی پہلی رات سونے کے لئے نہیں ایک نئے سفر کے آغاز اور عہد و پیماں کے لئے ہوتی ہے آج کی رات اسے جمال سے وقار حسین کے موضوع پر بات کرنے کو موقع نہیں ملا تھا جمال محبت کے موضوع کے علاوہ کسی اور موضوع پر بات کرنے کے موڈ میں نہیں تھا اس لئے اس نے وقار حسین کے موضوع کو چھیڑا نہیں تھا۔

سپنا جاگ رہی تھی اور ساری حویلی سے زیادہ بے خبر مٹی کے تودے اور کسی تھکے ہارے مسافر کی طرح جمال سو رہا تھا تاریک فضا پر گہرا سناٹا تھا ایسی خاموشی ماحول پر طاری

تھی جیسے سانپ سونگھ گیا ہو کمرے کی ہر چیز جیسے آسودہ تھی اور فرش سے چھت تک طوفان کے بعد والا سکوت طاری تھا اس کا ذہن جاگ اور سوچ رہا تھا وہ اس لمحے وقار حسین کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ کس طرح سے اس شخص سے اپنے باپ کا انتقام لے اس نے ماں سے وعدہ کیا تھا بلکہ قسم کھائی تھی کہ وہ موقع ملتے ہی ہر قیمت پر انتقام لے گی وہ ایک عجیب سی اذیت اور کشمکش میں بھی مبتلا تھی کہ کس طرح سے انتقام لے مگر اس شخص نے اس کی اور جمال کی زندگیاں بچا کر بلاشبہ احسان کیا تھا وہ جمال کو اعتماد میں لے کر وقار حسین کو قتل نہیں کر سکتی تھی اس لئے کہ جمال اور اس کے گھر والے وقار حسین کی جو عزت اور احترام کرتے تھے' وہ اس حویلی میں کسی اور کو نصیب نہ تھا۔

اس نے سوچا کہ اب اسے خود وقار حسین کے قتل کا منصوبہ بنانا ہوگا اسے یہ واردات تن تنہا کرنا ہوگی کوئی ایسا نہیں تھا اس حویلی میں کہ اسے اپنے اعتماد میں لیا جا سکے سوال یہ تھا کہ کس طرح وقار حسین کو قتل کیا جائے اس کے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا ایک ایسا ریوالور جس میں سائلنسر لگا ہوا ہو اس کا حصول ناممکن سا تھا صرف چاقو چھرے سے قتل کیا جا سکتا تھا تیز قسم کی چھری اور چاقو باورچی خانے میں مل سکتی تھی وہ اس سے وقار حسین کو قتل تو کر سکتی تھی مگر کیسے؟ وہ سوچنے لگی اس کے ذہن میں کچھ تدبیریں آنے لگیں۔

ایک ہفتہ پلک جھپکتے گزر گیا۔ جمال نے ولیمے کی تقریب بہت شاندار طریقے سے کی تھی پھر دعوتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا درمیان میں ایک دو دن کے لئے وقار حسین کہیں چلا گیا تھا وہ چلا گیا تھا تو اسے پچھتاوا سا ہوا تھا اس کا خیال تھا کہ شاید واپس نہ آئے مگر جب وہ واپس آیا تو اس نے فیصلہ کیا کہ اب وہ جلد سے جلد اس کا خاتمہ کر دے گی کیونکہ جمال نے اسے بتایا تھا کہ وقار حسین ایک لمبے عرصے کے لئے اس شہر کو چھوڑ کر جا رہا ہے سپنا نے چمپا سے غیر محسوس انداز سے وقار حسین کے بارے میں بہت کچھ معلوم کر لیا تھا اس حویلی میں چمپا ہی ایک ایسی ملازمہ تھی جو تمام ملازماؤں میں بہت تیز ذہین اور سمجھدار تھی وہ وقار حسین کی خدمت پر مامور تھی حویلی کے ایک گوشے میں جو مہمان خانہ تھا' وقار حسین کی اس میں سکونت تھی اس کے علاوہ اس مہمان خانے میں کسی اور مہمان کو ٹھہرایا نہیں گیا تھا وہ پراسرار انداز سے ٹھہرا ہوا تھا اور اس کی آمد و رفت بھی پراسرار تھی وہ کسی دن سویرے چلا جاتا تھا تو رات کو لوٹتا تھا کبھی کبھی ساری رات غائب ہو کر سویرے آتا تھا کہاں جاتا ہے؟ کس لئے جاتا ہے؟ یہ بات چمپا بھی نہیں جانتی تھی چمپا نے کئی بار کریدنے کی کوشش کی تو وقار حسین نے اس سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ وہ اپنے کام سے کام رکھے۔

ایک روز دوپہر کے وقت کھانے سے فراغت پانے کے بعد جمال کسی کام سے ہاگر ہاٹ چلا گیا وقار حسین اس کے جانے کے تھوڑی دیر کے بعد حویلی سے نکلا تو سپنا جیسے تاک میں تھی دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد سخت گرمی کی وجہ سے سبھی آرام کرنے اور سونے کے لئے اپنے اپنے کمروں میں جا دبکے تھے خاموشی چھا گئی تھی پھر بھی وہ بڑے محتاط انداز سے مہمان خانے میں پہنچ گئی وہ اپنے منصوبے کے تحت مہمان خانے کا جائزہ لینے آئی تھی وہ جلد سے جلد انتقام کی آگ کو سرد کرنا چاہتی تھی اس لئے کہ کسی بھی دن وقار حسین جا سکتا تھا پھر اس کا ہاتھ لگنا مشکل تھا۔

وقار حسین کی خوابگاہ میں ایک بریف کیس میز پر رکھا ہوا تھا۔ وہ مقفل تھا پھر بھی سپنا نے اسے کھولنے کی کوشش کی یہ بریف کیس عام بریف کیس کے مقابلے میں بہت مضبوط اور شاندار قسم کا تھا جب وہ کسی طرح کھل نہ سکا تو اس نے اپنی کوشش ترک کر دی معاً اس کی نظر بستر کے سرہانے پر پڑی اسے تکیوں کے نیچے سیاہ رنگ کی کوئی چیز جھانکتی ہوئی دکھائی دی تو اس نے اپنا شک دور کرنے کی غرض سے تکئے اٹھا کر دیکھے وہ ایک بھرا ہوا ریوالور تھا جس میں سائلنسر بھی نصب تھا وقار حسین شاید اسے عجلت میں ساتھ لے جانا بھول گیا تھا۔

ریوالور کو دیکھ کر سپنا کے سارے بدن میں خوشی کی لہر دوڑ گئی اس کی رگوں میں خون کی گردش تیز ہو گئی وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اس کی ایک بہت بڑی مشکل آپ ہی آپ حل ہو جائے گی یہ محض اتفاق تھا یا پھر قدرت اس کی مدد کر رہی تھی اب وقار حسین کو قتل کرنا اس کے لئے مشکل نہ تھا چھری چاقو سے قتل کرنا بڑا دشوار تھا اور اس میں ناکامی کے امکانات بھی تھے۔

سپنا بغیر سوچے سمجھے ریوالور لے کر اپنے کمرے میں آ گئی اور اس نے بستر کے نیچے اسے چھپا دیا پھر اسے خیال آیا کہ وقار حسین اپنا ریوالور غائب دیکھے گا تو اس کا ردعمل کیا ہوگا؟ نوکروں کی شامت آ جائے گی کہیں چمپا پر عتاب تو نازل نہیں ہو جائے گا شاید وقار حسین ہوشیار اور چوکنا ہو جائے وہ اس امکان کو بھی نظر انداز نہیں کرے گا کہ کسی ملازم نے چند روپوں کی خاطر اسے چرا لیا ہے۔

جمال رات گیارہ بجے باگر ہاٹ سے لوٹا تو وہ بہت تھکا ہوا تھا وہ کھانا کھاتے ہی سونے کے لئے بستر پر دراز ہوا تو گہری نیند میں ڈوب گیا تھوڑی دیر کے بعد اس نے جمال کو آوازیں دیں اور اس کا شانہ ہلایا تو وہ ٹس سے مس نہ ہوا بیس پچیس منٹ کے بعد اس نے کمرے کا دروازہ کھول کر باہر جھانکا اس نے راہداری سنسان اور ویران دیکھی تو پلنگ کے

پاس آ کر بستر کے نیچے سے ریوالور نکال لیا اور دھڑکتے دل سے کمرے سے نکل آئی۔

سپنا نے رات ایک بجے کمرے سے نکلنے کا منصوبہ بنایا تھا مگر اسے قرار نہیں آیا وہ بڑی تیزی اور اطمینان سے مہمان خانے جانے والے زینے کی طرف بڑھی اسے کوئی خوف نہیں تھا اندھیرے میں کوئی اسے شناخت بھی نہیں کر سکتا تھا اندھیرے میں لپٹی ہوئی حویلی اونگھ رہی تھی ہر طرف ہو کا عالم تھا حویلی کے تمام نوکر جلدی جلدی سے اپنے کام نمٹا کر اپنی اپنی کوٹھریوں میں جا کر سو گئے تھے انہیں فجر کی اذان کے وقت پھر بیدار ہونا پڑتا تھا جیسے جیسے مہمان خانہ قریب ہوتا جا رہا تھا اس کے دل کی دھڑکن بے قابو ہوتی جا رہی تھی۔

مہمان خانے کی نشست گاہ کا دروازہ بھڑا ہوا سا تھا اندر اندھیرا تھا وقار حسین نے اندر سے کنڈی لگانے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی وہ دروازہ بے آواز کھول کر اندر داخل ہوئی اور اس نے ریوالور پر اپنے ہاتھ کی گرفت سخت کر لی خوابگاہ کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور اندر روشنی ہو رہی تھی اس کی روشنی سے نشست گاہ کا اندھیرا کم ہو گیا تھا وہ دروازہ بھیڑ کے بے آواز قدموں سے آہستہ آہستہ خوابگاہ کی طرف بڑھی دہلیز پر پہنچ کر رک کر اس نے اندر جھانکا وقار حسین جاگ رہا تھا اور صوفے پر بیٹھا ہوئی کوئی چیز دیکھ رہا تھا وہ چیز اسے دکھائی نہیں دے رہی تھی اس لئے کہ اس کی پشت سپنا کی طرف تھی سپنا نے ریوالور سے اس کی کھوپڑی کی طرف شست باندھی اور لبلبی پر اپنی انگلی رکھ دی وقار حسین کی کھوپڑی میں سوراخ کرنے کے لئے صرف ایک گولی کافی تھی پھر اسے یک لخت خیال آیا اپنے باپ کے قاتل کو انجانے میں قتل کر دینا مناسب نہیں ہے اسے اس کا جرم بتا دینا چاہیے تاکہ مرتے وقت اسے یہ تو معلوم ہو کہ مقتول کی بیٹی نے آخر اپنے باپ کی موت کا بدلہ لے لیا ہے۔

کمرے میں داخل ہو کر وہ میز کی طرف بڑھی تو وقار حسین نے آہٹ سن کر اپنی گردن گھما کر دیکھا وہ سپنا کو دیکھ کر چونکا اس کے چہرے پر حیرت اور خوشی کی لہر دوڑ گئی وہ کھڑا ہو گیا۔ ''سپنا بیٹی! تم اس وقت؟ خیریت تو ہے......؟'' سپنا کے چہرے پر سفاکی اور ہاتھ میں اپنا ریوالور دیکھ کر وہ اچھل سا گیا اس کے ہاتھ میں جو تصویر تھی' وہ چھوٹ کر فرش پر گر پڑی۔ ''یہ کیا ہے؟'' وقار حسین ششدر ہو کر بولا۔

''انکل!'' وہ بولی تو نفرت اور غصے سے اس کی سانس پھولنے لگی۔ ''میں آپ سے حساب بے باق کرنے آئی ہوں۔''

''کیسا حساب بیٹی......؟'' وقار حسین پر سکتہ سا چھا گیا وہ دم بخود سا کھڑا تھا۔

''میں نے کیا کیا......؟''

''اپنے باپ کا حساب انکل!'' وہ بھڑک کر برہمی سے بولی۔''آپ نے میرے باپ کو بڑی بے رحمی سے قتل کیا ہے؟''

''تمہارے باپ کو؟'' وقار حسین کے چہرے پر گہرا استعجاب چھا گیا۔''یہ کب کی بات ہے؟''

''ہاں میرے باپ کو آپ نے بیس برس پہلے بڑی بربریت اور بے رحمی سے قتل کیا تھا میں آج آپ سے اس قتل کا انتقام لے رہی ہوں۔''

''تمہارا باپ کون تھا؟ کیا نام تھا اس کا؟'' وقار حسین کی حیرت دوچند ہو گئی۔

''عارف چودھری'' وہ نفرت کے زہر سے بجھے ہوئے لہجے میں حقارت سے بولی۔ ''آپ نے اسے گاڑی سے کچل کر مار نہیں ڈالا تھا؟''

''عارف چودھری......؟'' وقار حسین چکرا سا گیا۔''میں یہ نام پہلی بار تمہاری زبان سے سن رہا ہوں میں نے کبھی کسی بے گناہ کی جان نہیں لی۔''

''آپ جھوٹ بول رہے ہیں۔'' وہ بگڑ گئی اور شعلہ بار نظروں سے گھورنے لگی۔

''تم یقین کرو میں نے اس شخص کا نام تک نہیں سنا اور نہ میں جانتا ہوں۔'' وقار حسین بڑے سکون و اطمینان سے بولا۔''تمہیں یقیناً میرے بارے میں غلط فہمی ہوئی ہے مگر......'' اس نے توقف کیا اس کے چہرے پر حیرت سی چھا گئی۔''جمال نے تو مجھے یہ بتایا تھا کہ تمہارے والدین کلکتہ میں گاڑی کے ایک حادثے میں چل بسے تھے تم کہہ رہی ہو کہ میں نے تمہارے باپ کو قتل کیا ہے جمال نے مجھ سے شاید یہ بھی کہا تھا کہ دس شیطانوں کا گروہ تمہارے باپ کا دشمن تھا تم اس گروہ سے انتقام لینا چاہتی ہو انسپکٹر رشید چودھری کی مدد سے تم دونوں اس گروہ سے ٹکر لو گے جو کہ ناممکن سی بات ہے۔''

''آپ جھوٹ بول رہے ہیں کہ آپ میرے باپ کو نہیں جانتے؟ مجھے تو شبہ ہے کہ آپ نے میری ماں کو بھی قتل کر دیا ہے۔'' وہ ہذیانی انداز سے چیخ کر بولی۔''کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ آپ کا تعلق دس شیطانوں کے گروہ سے ہے؟''

''تم نے جمال کو کچھ اور بتایا مجھ سے کچھ اور بیان کر رہی ہو۔'' وقار حسین نے بڑے ٹھنڈے میٹھے لہجے میں کہا۔''میں تمہیں کیا بتاؤں تم سے کیا کہوں کہ جھوٹ کیا ہے سچ کیا ہے تم میری کسی بات کا یقین کرنے کے لئے تیار نہیں ہو مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ میں کبھی مافیا کا کارکن تھا مگر میں نے کنارہ کشی اختیار کر لی میں نہ تو تمہارے باپ کو جانتا ہوں اور نہ ماں کو میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں بشرطیکہ تم......''

''آپ مجھے اپنی باتوں سے ورغلانا چاہتے ہیں مگر میں کوئی بچی نہیں ہوں جو فریب کھا جاؤں؟ بس اب آپ چند لمحوں کے مہمان ہیں۔'' وہ ہیجانی لہجے میں بولی۔ اس کی آنکھیں شعلے برسا رہی تھیں۔ ''میں نے اپنی ماں سے عہد کیا تھا اور قسم کھائی تھی اب اپنے باپ کی موت کا انتقام لے رہی ہوں۔''

''تمہاری ماں اور تمہاری آرزو مجھ سے انتقام لینا ہے تو میں تمہاری یہ حسرت پوری کر دوں گا اب مجھے بھی زندگی کی تمنا نہیں رہی ہے میں جس کی تلاش میں اور جس مقصد سے گھوم رہا ہوں' پورے بیس برس کے بعد وہ اب پورا ہوتا نظر نہیں آتا اب جبکہ میری زندگی کا چراغ تمہارے ہاتھوں گل ہونے والا ہے' تم سے ایک التجا کرنا چاہتا ہوں کہ اگر تمہیں یہ عورت کبھی مل جائے۔'' اس نے توقف کر کے جھک کر فرش پر سے وہ تصویر اٹھائی جو اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑی تھی وہ اس کی طرف تصویر بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''تو کہہ دینا کہ ایک بدنصیب شخص نے اسے آخری سانس تک تلاش کیا اور اس کی یاد میں جلتا رہا تھا۔''

سپنا نے بہت سنبھل کر ہوشیاری سے اس کے ہاتھ سے تصویر لے لی کہیں وہ اس بہانے اس پر قابو پانے کی کوشش نہ کرے دشمن کا کوئی بھروسہ نہیں تھا اس کی ذرا سی کوتاہی غفلت اور بے پروائی اس کی موت کا سبب بن سکتی تھی یا پھر اس کی انتقام کی حسرت پوری نہیں ہو پاتی سپنا نے تصویر پر ایک سرسری نظر ڈالی اور اسے میز پر ڈالنے لگی تو اچھل پڑی اور اس تصویر کو غور سے دیکھنے لگی اسے جیسے یقین نہیں آیا اس کی نظروں کے سامنے دھند سی چھا گئی دھند چھٹی تو اس کے ہاتھ سے تصویر چھوٹ کر فرش پر گر پڑی وقار حسین نے حیرت سے سپنا کی طرف دیکھا اس کا چہرہ متغیر ہو گیا تھا اس کے گلابی ہونٹ کانپنے لگے تھے پھر اس نے جھک کر بجلی کی سی سرعت سے تصویر اٹھالی اور ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔

''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟'' سپنا کا سر تیزی سے چکرانے لگا وہ زیر لب بڑبڑانے لگی۔

''یہ جھوٹ ہے' نظر کا دھوکہ ہے' واہمہ ہے۔''

''میں یہ تصویر اس لئے دیکھنے لگا تھا کہ میری بیوی سے تم بڑی حد تک مشابہت رکھتی ہو یہ کیسا عجیب اتفاق ہے کہ تم رقیہ خانم کو جانتی ہو؟ تم اس تصویر کو دیکھ کر چونکیں تو مجھے ایسا لگا جیسے تم اسے جانتی ہو شاید تم نے اسے کلکتہ میں کہیں دیکھا ہو۔''

''شاید میں نے اسے کہیں دیکھا ہے؟'' وہ سراسیمہ ہو کر بولی۔ ''کیا آپ کی کوئی بیٹی بھی تھی؟''

☆......☆......☆

''نہیں، میری کوئی بیٹی نہیں تھی۔'' وقار حسین نے بڑے کرب اور بے قراری سے جواب دیا۔ ''رقیہ خانم سے میری کوئی اولاد نہیں تھی۔''

''مگر میں نے تو اس عورت کے ساتھ ایک جوان لڑکی کو دیکھا تھا۔'' سپنا نے صاف جھوٹ بولا۔ ''ایک محفل میں ہم دونوں نے ایک دوسرے کو بڑے تعجب سے دیکھا تھا شاید اس لئے کہ ہم دونوں میں خاصی مشابہت تھی۔ پھر وہ عورت مجھے کبھی دکھائی نہیں دی۔''

''بیس پچیس دنوں پہلے کی بات ہے۔'' اس نے ایک اور سفید جھوٹ بولا۔ ''کہیں وہ رقیہ خانم کی جڑواں بہن کی بیٹی تو نہیں تھی؟''

''رقیہ خانم کی کوئی سگی اور جڑواں بہن بھی نہیں تھی۔'' وقار حسین بڑے کربناک لہجے میں کہنے لگا۔ ''وہ لڑکی کوئی اور ہوگی۔ مشابہت بھی اتفاق ہوگی جیسے تمہاری مشابہت بھی محض ایک اتفاق ہے۔ مگر میرے دل و دماغ پر یہ کیسی بجلی آگری ہے۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔ میں نے رقیہ خانم کو کومیلا میں دیکھا تھا۔ ایک رات اس کے گھر پر بھی گیا تھا۔ اس نے میرے سامنے آکر بات کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ وہ اس بات سے برابر انکار کرتی رہی تھی کہ وہ رقیہ خانم ہے۔ اس نے مجھے اپنا نام بلقیس بانو بتایا تھا۔ مگر میرے کان کیسے فریب کھا سکتے تھے۔ میں نے اس کی بات کا یقین نہیں کیا تو اس نے مجھے قتل کرنے کی دھمکی دی۔ میں اس وقت لوٹ گیا۔ اس لئے کہ وہ سخت مشتعل تھی۔ میں نے دوسرے دن دس شیطانوں کے گروہ کے سفاک اور خطرناک بدمعاشوں کو دیکھا جو میری اور رقیہ خانم کی تلاش میں تھے۔ میں اسے ان کے بارے میں بتانے اس کے گھر پہنچا تو رقیہ خانم گھر کو تالا لگا کر غائب ہو چکی تھی۔ میں نے اپنے تئیں خیال کیا بدمعاشوں نے اسے اغوا کر کے قتل کر دیا ہوگا۔ پھر بھی ایک موہوم سی امید پر اس کی تلاش جاری رکھی۔ مگر تم بتا رہی ہو کہ تم نے اسے کلکتہ میں دیکھا۔ اگر وہ زندہ ہے تو پھر میں تم سے زندگی کی بھیک مانگتا ہوں تاکہ

میں اسے کلکتہ جا کر تلاش کروں اور اس کی مدد سے دس شیطانوں کے گروہ کو ٹھکانے لگا سکوں۔"

"کومیلا میں آپ نے اس رات جس بلقیس بانو کے گھر جا کر بات کی کیا وہ واقعی رقیہ خانم تھی؟" سپنا کی حالت غیر ہونے لگی۔

"ہاں بیٹی! وہ میری رقیہ خانم ہی تھی۔" وقار حسین نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔

"آپ نے تو اس رات اسے دیکھا نہیں تھا صرف بات کی تھی۔" سپنا کی آواز پست ہو رہی تھی۔ "ہوسکتا ہے کہ آپ آواز سے دھوکا کھا گئے ہوں؟"

"یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ایک شخص اپنی ہم سفر کی آواز کو پہچان نہ سکے اور دھوکا کھا جائے؟ میں نے تو اسے اس کی خوشبو سے پہچان لیا تھا کہ وہ میری رقیہ خانم ہے۔"

"آپ نے اس رات اس گھر میں کسی لڑکی کی موجودگی محسوس نہیں کی؟" سپنا کی آواز کانپنے لگی۔ "اس کی کوئی آواز نہیں سنی؟"

"نہیں۔" وہ بولا۔ "اگر وہاں کوئی لڑکی ہوتی تو میں ضرور اس کی آواز سنتا مگر وہاں کوئی لڑکی کیسے ہوسکتی تھی۔ مجھ سے اس کی کوئی اولاد نہیں تھی۔"

"آپ نے اس شہر یا پڑوس میں کسی سے دریافت نہیں کیا بلقیس بانو کے بارے میں؟"

"میں نے اس کی ضرورت نہیں سمجھی۔" وقار حسین نے جواب دیا۔ "اس لئے کہ میں نے اسے تنہا رکشہ میں جاتے دیکھا تو اس کا تعاقب کیا تھا۔ اس نے اپنے گھر پر رکشہ سے اتر کے گھر کا تالا کھولا تھا۔ اس گھر میں اس کے سوا کسی اور عورت کی موجودگی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔"

"وہ رقیہ خانم نہیں تھی بلکہ بلقیس بانو ہی ہوگی۔ آپ کو بلاوجہ شک ہوا۔"

"بالفرض محال وہ بلقیس بانو تھی تو وہ فرار کیوں ہوئی تھی؟ کس لئے؟ اسے کس بات کا خطرہ تھا؟"

"مگر میں آپ کو بتا دوں کہ اس عورت کا نام بلقیس بانو تھا اور اس کی ایک لڑکی تھی۔" سپنا سنبھل کر بولی۔ "تھوڑی دیر کے لئے اس عورت کو رقیہ خانم تسلیم کر لیا جائے تو پھر اس کی لڑکی کہاں سے آئی؟ کہیں وہ لڑکی اس کے کسی گناہ کا نتیجہ تو نہیں تھی؟" سپنا سانس لینے رکی۔ اس کے دل کی دھڑکنیں بگڑنے لگی تھیں۔ "شاید اسی وجہ سے اس نے آپ کا سامنا

نہیں کیا۔ وہ اپنے گناہ کو کیا ظاہر کرتی؟''

''نہیں، میری رقیہ خانم ہرگز ایسی عورت نہیں تھی۔'' وہ تڑپ کر وحشت زدہ لہجے میں بولا۔ ''یہ ضرور تھا کہ ہم دونوں کے مزاج میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ وہ تیز مزاج کی تھی۔ ایک غلط فہمی نے ہم دونوں کے درمیان نفرت کی خلیج حائل کر دی اور وہ ایک روز اچانک میری زندگی سے نکل گئی۔ مگر وہ ایسی گری ہوئی حرکت نہیں کر سکتی۔ وہ دل کی بہت اچھی عورت تھی۔''

''کیا معلوم اس نے آپ سے انتقام لیا ہو؟'' سپنا کے دل میں درد، کسک، چبھن سی ہونے لگی۔

''مگر ایسے انتقام سے کیا حاصل ہوتا۔ وہ ایک بے وقوف نہیں سمجھدار عورت تھی۔''

''شاید آپ کی رقیہ خانم نے کسی دوسرے مرد سے شادی کر لی ہو اپنے سہارے اور تحفظ کے لئے۔ اس سے اس کی کوئی اولاد ہوئی ہو؟''

''اگر اس نے شادی کی ہوتی تو اس کا شوہر یقیناً اس کے ساتھ ہوتا۔'' وقار حسین نے جواب دیا۔ ''وہ شادی اس لئے بھی نہیں کر سکتی تھی کہ دشمن ڈاکری کے حصول کے لئے شکاری کتے کی طرح اس کی تلاش میں تھا اور پھر میں نے اسے طلاق کہاں دی تھی؟''

وہ مضبوط اعصاب کی مالک نہ ہوتی تو غش کھا کر گر جاتی۔ زمین و آسمان اس کی نظروں کے سامنے گردش کرنے لگے۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے زبردست زلزلہ آ گیا ہو۔ ہر چیز کانپ رہی ہو، ڈول رہی ہو، گھوم رہی ہو، کہیں سچ مچ زلزلہ تو نہیں آ گیا؟ زلزلہ تو اس کے وجود میں آیا تھا۔ اس کا سارا وجود اندر سے تہہ و بالا ہونے لگا۔ اسے نادیدہ آواز کی بازگشت سنائی دی۔ یہ تدبیر کے نہیں تقدیر کے کھیل ہیں۔ شاید وہ اس لئے ایک ہی دائرے میں مقید ہو کر رہ گئی ہے اور اس کے چاروں طرف اندھیرا ہے۔ پھر وہ کون ہے؟ وہ کس کے کھاتے میں جائے گی؟ وہ جلد ہی حقیقت کی دنیا میں واپس آ گئی۔ بالفرض تھوڑی دیر کے لئے وقار حسین کی بات سچ مان لی جائے تو وہ شخص جس کے خون سے وہ اپنے انتقام کی آگ بجھانا چاہتی ہے اس کا اپنا ہی باپ ہے۔ اس کی ماں جسے اس کا باپ بتا رہی تھی وہ کون تھا؟ اس کی ماں نے کبھی اس کے باپ کی تصویر نہیں دکھائی تھی کیا ایسا ممکن تھا کہ اس کے باپ کی ایک تصویر بھی نہ ہو اور پھر اس کی ماں ایک بہت بڑی آرٹسٹ بھی تو تھی۔ کیا وہ اپنے شوہر کا ایک پورٹریٹ بنا کر گھر میں نہیں لگا سکتی تھی؟ پھر اسے بے شمار چھوٹی چھوٹی باتیں یاد آنے لگیں۔

جب بھی بھولے بھٹکے اس کے باپ کا ذکر زبان پر آ جاتا تھا تو اس کی ماں غیر محسوس انداز سے اس کے خلاف زہر اگلتی تھی۔ وہ اسے نفرت کا زہر صرف باپ کے خلاف ہی نہیں دنیا کے سارے مردوں کے خلاف پلا پلا کر پالتی رہی تھی۔

پھر اس نے اپنے باپ کے قاتل سے انتقام لینے کا عہد لیا تھا۔ اگر وقار حسین اس کا باپ ہے تو کیا اسے نہیں پتا کہ اس کی ایک اولاد بھی تھی۔ کیا کوئی باپ بیس برس میں اپنی اولاد کو بھول جاتا ہے۔ پھر ایک آوارہ سا خیال آیا کہ روپوش ہونے سے پہلے اس کی ماں امید سے ہوگئی ہوگی۔ اس کی ماں نے نفرت یا کسی اور وجہ سے یہ بات اپنے شوہر کو نہیں بتائی ہوگی؟

ایک منٹ کے ہزارویں حصے میں اس نے یہ سب کچھ سوچ لیا اور اپنے دل کو سمجھانے لگی کہ اصل بات یہی ہے۔ پھر اسے پرکاش آنند یاد آیا۔ اس کی ماں نے اس سے کئی بار کہا تھا اور پرکاش آنند نے بھی یہ بات کئی بار دہرائی تھی کہ وہ اسے گودوں میں کھلا چکا ہے۔ اس نے کلکتہ میں جنم لیا تھا۔ پرکاش آنند کے گھر میں اس کی ماں اکثر پرکاش آنند سے کہتی تھی کہ...... بھیا! آپ کے مجھ پر اتنے احسانات ہیں کہ میں ساری زندگی ایک احسان بھی اتارنا چاہوں تو اتار نہیں سکتی۔ اس کی ماں یہ بات کیوں کہتی تھی؟ اتنا مضبوط بندھن کس لئے تھا؟ صرف اس لئے کہ پرکاش آنند نے اس کی ماں کو اپنے ہاں پناہ دی تھی اور کڑے وقت میں پورا پورا ساتھ دیا تھا۔

اس کی ماں نے بچپن ہی سے اسے اپنے باپ کے خلاف نفرت، دشمنی اور عداوت کا سبق پڑھایا تھا اور وقار حسین کے خلاف اس کے ذہن کو اپنے انتقام کی آرزو پوری کرنے کے لئے ورغلایا اور اس سے غلط بیانی سے کام لیا تھا۔ اگر وہ اپنی ماں کی تصویر وقار حسین کے پاس نہ دیکھتی تو بیٹی کے ہاتھوں باپ کا قتل ہو جاتا جو اب اس کے سامنے کھڑا تھا۔ اسے خبر نہیں تھی وہ اس کی بیٹی ہے۔ اس کا خون ہے۔

جیسے جیسے کڑیاں ملتی گئیں ویسے ویسے تاریکی کے بادل ایک ایک کر کے چھٹتے گئے۔ ہر سمت اجالا ہونے لگا۔ پھر اسے یاد آیا کہ پہلی ملاقات میں ایک مقناطیسی کشش نے وقار حسین کی طرف جو کھینچا تھا وہ دراصل خون کی کشش تھی۔ تقدیر بھی کیسے عجیب عجیب کھیل کھیلتی ہے۔

سپنا نے یک لخت ریوالور فرش پر پھینک دیا۔ جب وہ اپنے باپ کی طرف دیوانہ

وار بڑھی تو خوشی سے اس کی زبان ہی نہیں قدم بھی لڑکھڑا رہے تھے۔ اس کے چہرے پر قوس قزح کے رنگ بکھر گئے۔ اس کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو موتی بن گئے۔ ’’یہ رقیہ خانم میری ماں تھی۔‘‘ اس نے تصویر دکھاتے ہوئے کہا۔

’’کیا؟‘‘ وقار حسین پر سکتہ سا چھا گیا۔ اسے اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا۔ وہ اپنی جگہ دم بخود سپنا کو دیکھنے لگا۔ پھر اسے اچانک بیس برس پہلے کی ایک رات کی بہت چھوٹی سی بات یاد آئی۔ وہ گہری نیند سے بیدار ہوا تو اس نے غسل خانے میں اپنی بیوی کو الٹی کرتے سنا۔ جب وہ غسل خانے سے آئی تو اس نے طبیعت کے بارے میں پوچھا تو وہ بولی تھی کہ رات مرغن کھانا کھانے سے اسے بدہضمی ہوگئی اور جی متلانے لگا۔ اسے دو الٹیاں بھی ہوگئی ہیں۔ اس کے دوسرے دن تو وہ روپوش ہوگئی تھی۔ آج اب اس الٹی کی وجہ سمجھ میں آئی تو پھر اس سے کچھ بھی پوشیدہ نہ رہا۔ دوسرے لمحے وہ حیرت اور خوشی سے اچھل پڑا۔ ’’تم...... میری بیٹی ہو۔ میری بیٹی...... اس نے یہ راز بھی مجھ سے چھپایا تھا۔‘‘

وقار حسین نے اسے اپنے بازوؤں میں بھر لیا تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ وقار حسین کی آنکھوں سے بھی آنسوؤں کا سیلاب امنڈ پڑا تھا۔ اس نے خواب و خیال میں بھی نہیں سوچا تھا کہ اس کی کوئی بیٹی ہے اور اسے اتنی بڑی خوشی بن کر مل جائے گی۔

سپنا نے اپنے باپ کو بلا کم و کاست اپنی کہانی سنائی کہ اس کی زندگی میں کیسے کربناک اور بے رحم واقعات پیش آئے۔ ایک کمزور لمحے نے آخر اسے اپنے باپ سے ملا دیا تھا۔ یہ کامیابی اور خوشی کی بہت بڑی سند تھی۔ اسے یہ سب کچھ سہانے سپنے کی طرح لگ رہا تھا۔ اسے یقین نہیں آیا۔ اس پر ایک عجیب سی سرشاری کی کیفیت طاری تھی۔ اس کی نس نس میں خون رقص کر رہا تھا۔ اس کی زندگی میں چپکے سے ایک ایسی بہار آ گئی جس کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔

پھر وہ اپنی ماں کو یاد کر کے دل گرفتہ سی ہوگئی تھی۔ اس کی ماں جیسی بھی تھی۔ گو اس کی ماں نے اس کے دل میں باپ اور مردوں کے خلاف نفرت اور انتقام کا زہر بھر دیا تھا اور آج اس کے باوجود اس نے اپنی ماں کو معاف کر دیا تھا۔ اس لئے بھی کہ اس کی ماں اس دنیا میں موجود نہ تھی۔

’’کاش! آج میری ماں زندگی ہوتی۔‘‘ سپنا نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

’’تمہاری ماں زندہ ہوگی بیٹی۔‘‘ وقار حسین نے اسے دلاسہ دیا۔ ’’میں جب سے

آیا ہوں اس کی تلاش میں سرگرداں ہوں۔ میرے آدمیوں کی اطلاع کے مطابق وہ دشمن کے ہتھے نہیں چڑھی ہے۔ ویسے وہ شکاری کتوں کی طرح اس کی تلاش میں ہیں۔"

"پھر وہ کہاں ہوں گی؟ انہیں کہاں تلاش کیا جائے؟" سپنا بولی۔ "آخر وہ کب تک اس طرح روپوش رہیں گی۔"

"میرے خیال میں وہ کلکتہ میں پرکاش آنند کے ہاں تمہارے انتظار میں ہوگی۔" وقار حسین کہنے لگا۔ "بالفرض محال وہ وہاں نہ ہوئی تو پھر یہ سمجھو کہ شیطانوں نے اسے موت کا نشانہ بنا دیا ہوگا۔ کاش! اس رات تمہاری ماں نے میری باتیں صبر و سکون سے سن لی ہوتیں۔ ضد اور ہٹ دھرمی سے کام نہ لیتی تو اس کی ساری غلط فہمی دور ہو جاتی۔ ان تلخ اور بھیانک واقعات کی نوبت ہی نہیں آتی۔ پھر وہ مجھے ڈائری دے دیتی میں اس ڈائری کی مدد سے اب تک ان دس شیطانوں کو ختم کر چکا ہوتا۔ کیا تمہاری ماں نے کبھی تم سے کسی ڈائری کا تذکرہ کیا تھا؟"

"نہیں۔" سپنا نے اپنا سر ہلایا۔ "امی نے کبھی مجھ سے کسی ڈائری کا تذکرہ نہیں کیا۔ اس رات جب آپ نے گھر پر آ کر امی سے ڈائری کے موضوع پر بات کی تھی اس کے دوسرے دن صبح میں نے ان سے اس ڈائری کے بارے میں دریافت کیا تھا تو وہ بڑی خوبصورتی سے ٹال گئی تھیں۔ اس رات انہوں نے کچھ کاغذات جلا دیئے تھے شاید اس ڈائری کو بھی ان کے ساتھ جلا دیا ہوگا۔ میں نے برسوں پہلے رات کے وقت انہیں اپنے کمرے میں بہت محتاط انداز سے ڈائری پڑھتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ مجھے اس وقت اپنے سامنے پا کر سراسیمہ ہوگئی تھیں اور انہوں نے وہ ڈائری تکیے کے نیچے چھپا دی تھی۔ پھر میں نے ان کے ہاتھ میں کبھی وہ ڈائری نہیں دیکھی اور نہ میرے دل میں اس کے لئے کوئی دلچسپی یا تجسس تھا۔"

"نہیں، تمہاری ماں نے وہ ڈائری نہیں جلائی ہوگی۔" وقار حسین نے کہا۔ "رقیہ خانم اتنی بڑی حماقت نہیں کر سکتی؟"

"ابو!" سپنا نے اپنے باپ کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ "آخر وہ کیا غلط فہمی تھی جس نے امی کے دل میں آپ کے خلاف نفرت کا زہر بھر دیا تھا اور وہ ڈائری لے کر روپوش ہوگئیں اور آپ کی زندگی سے سدا کے لئے نکل گئیں۔"

"تمہاری ماں کو یہ غلط فہمی ہوگئی تھی کہ میں پس پردہ دس شیطانوں کے گروہ کا آلہ

کار ہوں۔'' وقار حسین بتانے لگے۔ ''تمہاری ماں نے مجھے صفائی کا موقع نہیں دیا۔ کسی نے میرے خلاف اس کے کان بھر دیئے تھے۔ اس عورت نے یہ سوچنے کی زحمت تک گوارا نہیں کی کہ میں نے اندرونی طور پر اس تنظیم سے اپنا تعلق ختم کر لیا ہے۔ اس تنظیم کے شیطانوں کو شک ہو گیا تھا۔ اتنی سی بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی کہ گروہ میرا دشمن کس لئے ہو گیا ہے؟ مجھ پر دو مرتبہ قاتلانہ حملے کس لئے ہوئے ہیں۔ اگر مجھے اس کی شادی شدہ سہیلی سے محبت تھی تو پھر مجھے اس سے شادی کرنے کی ضرورت کیا تھی؟ وہم کا علاج تو حکیم لقمان کے پاس بھی نہیں تھا تو میرے پاس کہاں سے آتا۔ اس عاقب نااندیش عورت نے نہ صرف میری بلکہ اپنی زندگی بھی اجیرن کر ڈالی۔''

''کاش! میری امی زندہ ہوں اور وہ مجھے ایک بار مل جائیں تو میں انہیں سمجھاؤں گی کہ میرے ابو ہرگز ایسے نہیں ہیں جیسا آپ نے سمجھ رکھا ہے۔''

''میں کل ہی تمہاری امی کی تلاش میں کلکتہ جا رہا ہوں۔'' وقار حسین نے کہا۔ ''وہ یقیناً پرکاش آنند کے ہاں ہو گی۔ اس نے بڑی غلطی کی اور جلد بازی سے کام لیا کہ وہ تمہیں بیچ منجدھار میں چھوڑ گئی۔ جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ اب گزرے ہوئے وقت پر کمند ڈالنا بے سود ہے۔'' پچھتاوے سے کچھ حاصل نہ ہو گا میں اب اسے ہر قیمت پر سمجھا بجھا کر لے آؤں گا۔ جب وہ تمہارے بارے میں سنے گی چلی آئے گی۔''

''اب میں آپ کو اکیلا نہیں جانے دوں گی۔'' سپنا سراسیمہ ہو کر بولی۔ ''میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گی۔''

''تم فکر نہ کرو مجھے کچھ نہیں ہو گا۔'' وقار حسین نے بڑے اعتماد سے کہا۔ ''میں بھی اس گروہ کا سب سے خطرناک شاطر اور ذہین شخص تھا اس لئے یہ گروہ مجھ سے بہت زیادہ خائف اور پریشان ہے۔ میں تین چار دنوں میں لوٹ آؤں گا۔ تم ایسا کرو جمال کے ساتھ کو میلا ہو آؤ۔ شاید تمہاری ماں وہاں ہوں۔''

☆......☆......☆

جمال نے بیدار ہو کر سپنا کی طرف کروٹ لی تو وہ بستر پر نہیں تھی۔ ابھی رات تھی۔ وہ سمجھا کہ شاید غسل خانے میں ہو گی تھوڑی دیر تک اس کے انتظار میں بستر پر کروٹیں بدلتا رہا۔ معاً اس کی نظر کمرے کے دروازے پر پڑی تو وہ اسے کھلا ہوا سا لگا کمرے میں نائٹ بلب جل رہا تھا۔ اس کی ہلکی روشنی میں ہر چیز صاف نظر آ رہی تھی۔ اس نے اپنا واہمہ

سمجھا۔ چند لمحوں کے بعد بستر سے نکل کر اس نے دروازے کے پاس جا کر دیکھا تو وہ واقعی کھلا ہوا تھا۔ اس نے کسی خیال کے زیر اثر غسل خانہ کا دروازہ کھولا اور اندر جھانکا۔ وہ بھی خالی پڑا تھا۔ پھر اس نے دستی گھڑی دیکھی۔ رات کے دو بج رہے تھے۔ اتنی رات وہ کہاں اور کس کے پاس گئی ہوگی؟ کہیں وہ اس کی امی کے کمرے میں تو نہیں۔ صبح اس کی امی کی طبیعت ناساز تھی۔ شاید امی کی طبیعت اچانک بگڑ گئی ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو اسے ضرور جگایا جاتا۔

اس کے دل کے کونے میں ایک خیال آیا تو وہ اچھل پڑا۔ کہیں سپنا کو دس شیطانوں کے گروہ کے لوگ تو اٹھا کر نہیں لے گئے ہیں۔ وہ اس کے دشمن تھے۔ سپنا نے اسے بتایا تھا کہ وہ کس قدر خطرناک گروہ ہے اور وہ خود بھی جانتا تھا۔ انسپکٹر رشید چودھری نے بھی اسے بتایا تھا کہ اس گروہ کے لئے کوئی بات ناممکن نہیں ہے۔ اس خیال کے آتے ہی اس کے سارے بدن میں سنسنی سی دوڑ گئی اور سرد لہر بن کر اس کی ریڑھ کی ہڈی میں اتر گئی۔ خوف و دہشت سے اس کی رگوں میں لہو منجمد ہونے لگا۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو وہ وقار حسین کو اس واقعے کی اطلاع دینے مہمان خانے کی طرف سراسیمگی سے لپک گیا۔

اس نے سپنا کو وقار حسین سے اس وقت باتیں کرتے دیکھا تو اسے یقین نہیں آیا۔ اس کی جان میں جان آ گئی۔ ''تم یہاں ہو؟ میری تو جان نکل گئی تھی۔''

''تمہاری بیوی میری جان لینے آئی تھی۔'' وقار حسین نے ہنستے ہوئے کہا اور ریوالور کی طرف اشارہ کیا جو میز پر رکھا ہوا تھا۔ سپنا نے خجل ہو کر سر جھکا لیا۔

''وہ کس لئے؟'' جمال نے حیرت سے پوچھا اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔

''اس لئے کہ میں سپنا کی ماں اور اس کے باپ کا قاتل ہوں۔'' وقار حسین نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔

''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟'' جمال بولا۔ ''سپنا کو یقیناً آپ کے بارے میں غلط فہمی ہوئی ہے۔''

''اس دنیا میں کیا کچھ نہیں ہو سکتا ہے۔'' سپنا فوراً بول اٹھی۔ ''اللہ نے بروقت اس غلط فہمی کو دور کر دیا۔ یہ میرے ماں باپ کے قاتل نہیں بلکہ میرے ابو نکلے۔ اللہ نے آج مجھے اتنی بڑی مسرت دی ہے کہ میں اس کا جتنا شکر کروں کم ہے۔ یہ آپ کے سسر ہیں۔ آپ انہیں آداب کریں۔''

☆......☆......☆

دوسرے دن صبح گیارہ بجے کی فلائٹ سے جمال اور سپنا کومیلا روانہ ہو گئے۔ صبح نو بجے وقار حسین بنگلہ دیش کا بارڈر عبور کر کے ہندوستان پہنچنے کے لئے جے پور روانہ ہو گیا تھا۔ وہ کومیلا جا رہی تھی تو اس کے دل کے کسی کونے میں کوئی ڈر اور خوف نہیں تھا۔ اس لئے کہ اس کا ہم سفر اس کے ہمراہ تھا۔

سپنا کومیلا ایئر پورٹ سے سیدھے اپنی بچپن کی سہیلی افروزہ کے ہاں پہنچی۔ افروزہ اور اس کے گھر والوں نے حیرت اور خوشی اور بڑی گرم جوشی سے اس کا اور جمال کا استقبال کیا۔ افروز نے اسے آڑے ہاتھوں لیا کہ اس نے اپنی شادی پر اپنی عزیز جان سہیلی کو مدعو بھی نہیں کیا۔ اس پر سوالات کی بوچھاڑ ہو گئی۔ اس کی ماں کے بارے میں پوچھا گیا تو اس نے یہ بتایا کہ وہ کھلنا میں ہے۔ طبیعت کی ناسازی کی وجہ سے آ نہیں سکی ہے۔

سپنا کے پاس گھر کی چابی نہیں تھی۔ اس کے پاس جو چابی تھی وہ اس دستی بیگ میں رہ گئی تھی جو اس نے ریل گاڑی میں غنڈوں سے اپنی عزت بچانے کے لئے کھڑکی سے باہر پھینک دی تھی۔ پھر اسے یاد آیا کہ گھر کی ایک چابی اس کی ماں نے مولوی عبدالسبحان کے پاس رکھوائی تھی۔ اس نے افروزہ کے بھائی کو ان کے پاس بھیجا کہ وہ ان سے اس کے گھر کی چابی لے آئے۔ مولوی عبدالسبحان اس کے ہمراہ گھر آ گئے۔

مولوی عبدالسبحان نے اسے دیکھا تو بہت خوش ہو گئے۔ اس کی ماں کے بارے میں پوچھا۔ اس نے اپنی ماں کے بارے میں انہیں بھی وہی بتایا جو اس نے افروزہ کے گھر والوں کو بتایا تھا۔ وہ اسے چابی دیتے ہوئے بولے۔ ''تم اپنے گھر پہنچو' میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔''

سپنا' جمال کے ہمراہ اپنے گھر پہنچی۔ جمال نے تالا کھولا۔ وہ دونوں اندر داخل ہوئے۔ سپنا نے دیکھا۔ اس کا گھر اسی حالت میں تھا جس حالت میں اسے چھوڑ گئی تھی۔ جمال اور وہ دونوں نشست گاہ کی صفائی کرنے لگے۔ گھر کی حالت اور افروزہ کے گھر والوں کی باتوں سے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کی ماں ایک بار یہاں نہیں آئی۔ وہ کس لئے آتی۔ سپنا نے سوچا۔ اب اس گھر میں رکھا کیا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد مولوی عبدالسبحان ایک بڑا پھولا ہوا لفافہ لے کر آئے۔ انہوں نے سپنا سے کہا۔ ''اب تم مجھے سچ سچ بتاؤ' تمہاری ماں کا پتا چلا؟''

''نہیں۔'' وہ حیران ہو کر بولی۔ ''کیا آپ کو سارے واقعات کا علم ہے؟''

''ہاں بیٹی!'' وہ بولے۔ ''تمہاری ماں نے مجھے بہت کچھ بتایا تھا۔'' انہوں نے توقف کر کے لفافے میں سے ایک چھوٹا لفافہ نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔ ''یہ خط تمہارے نام ہے جو تمہاری ماں میرے پاس رکھوا کر گئی تھی کہ تم سے ملاقات ہو تو دے دوں۔ یہ ڈائری بھی دے گئی تھیں۔ انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ میں تمہارے سوا کسی کو نہ دوں۔''

''ڈائری۔'' سپنا نے ان کے ہاتھ سے ڈائری لی تو خوشی سے اس کی حالت غیر ہونے لگی۔ اسے جیسے یقین ہی نہیں آیا کہ ڈائری اسے اس آسانی سے مل جائے گی۔ مولوی عبدالسبحان تھوڑی دیر کے بعد چلے گئے تو اس نے اپنے کانپتے ہاتھوں سے ماں کا خط لفافہ چاک کر کے نکالا تو اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ وہ خط پڑھنے لگی۔ اس کی ماں نے لکھا تھا۔

میری پیاری بیٹی سپنا!

جب یہ خط تمہیں ملے گا تو میں اس بے رحم اور ظالم دنیا سے بہت دور جا چکی ہوں گی۔ اس لئے کہ دس شیطانوں کے خطرناک گروہ کے شکاری کتوں نے آخر میرا پتا چلا ہی لیا ہے۔ اب وہ مجھے کسی قیمت پر زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ وہ اپنے دشمن کو کسی قیمت پر معاف نہیں کرتے ہیں اور اسے اس قدر اذیت سے موت کا نشانہ بناتے ہیں کہ تم تصور بھی نہیں کر سکتی ہو۔ میں اس لئے بھی فرار ہو رہی ہوں کہ تم پر کوئی آنچ نہ آئے۔ موت کے منہ میں جانے سے پہلے میری آخری خواہش ہے کہ وقار حسین سے بھیانک انتقام لوں اس شخص کی موت اس لئے بھی ضروری ہے کہ بیس برس کے بعد اس کی واپسی نے ہماری پرسکون زندگی پر بجلی گرا دی۔ ان شیطانوں نے یہ سمجھ لیا تھا کہ وہ ڈائری لے کر واپس چلا گیا ہے اور انہیں میری ذات سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ کل رات وقار حسین اس ڈائری کے لئے گھر آیا تو انہیں اندازہ ہو گیا کہ ڈائری میرے پاس ہے۔ وہ آج کسی بھی وقت ڈائری کے حصول اور مجھے خاک کا پیوند بنانے آ سکتے ہیں۔ میں یہ خط اور ڈائری مولوی عبدالسبحان کے پاس امانت رکھوا کر فرار ہو رہی ہوں۔ میں تمہیں اپنے ہمراہ لے جانے سے اس لئے گریز کر رہی ہوں کہ وہ تمہیں بھی میرے ساتھ ختم کر دیں گے۔ میں وقار حسین سے انتقام نہ لے سکی اور بدقسمتی سے دشمن کے ہتھے چڑھ گئی تو خودکشی کر لوں گی۔ اس لئے میں نے زہر کی پڑیا اپنے گریبان میں رکھ چھوڑی ہے۔

میں تمہیں تمہارے باپ کے بارے میں بتانا چاہتی ہوں۔ تمہارا باپ عارف

چودھری نہیں تھا اور نہ اس شخص کا کوئی وجود ہے۔ تمہارا باپ وقار حسین ہے۔ اس کے علم میں یہ بات بالکل نہیں ہے کہ اس کی کوئی اولاد ہے۔ اس لئے کہ جب میں امید سے ہوئی تھی میں نے اسے بتایا نہیں تھا اور اس کے کچھ دنوں کے بعد میں کلکتہ پرکاش آنند کے پاس چلی گئی اور میں نے تمہیں وہاں جنم دیا۔ تمہارا باپ آج بھی ان دس شیطانوں کا آلہ کار ہے جنہوں نے اس ملک کے بازو کو الگ کرنے میں پس پردہ بہت بڑا کردار ادا کیا ہے۔ یہ انہوں نے اس لئے کیا کہ ان کے مفادات وابستہ تھے اور یہ بیرونی طاقتوں کے ایجنٹ ہیں۔ تمہارے باپ نے مجھ سے شادی کی لیکن وہ ایک شادی شدہ عورت سے محبت کرنے لگا جو میری بچپن کی سہیلی تھی۔ وہ شادی سے قبل اس گروہ میں دولت اور خواب ناک زندگی کے حصول کے لئے شامل ہوا تھا۔ اس نے شادی کے بعد مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اس گروہ سے قطع تعلق کر لے گا مگر اس نے ایسا نہیں کیا۔ اس لئے کہ وہ ناجائز طریقوں سے دولت حاصل کر رہا تھا۔

جس روز مجھ پر یہ انکشاف ہوا تھا کہ میں ماں بننے والی ہوں' میرے اندر تمہارے خلاف نفرت کی لہر اٹھی۔ میں نے سوچا کہ میں جس شخص سے نفرت کرنے لگی ہوں جو ساری دنیا کا مجرم ہے اس کی نشانی میرے وجود میں پرورش پائے۔ مجھے اسے ختم کر دینا چاہیے۔ اس رات ایک پولیس انسپکٹر عبدالماجد جو وقار حسین کا کزن تھا وہ وقار حسین کی تلاش میں گھر آیا تھا۔ وہ دہشت زدہ اور سراسیمہ تھا۔ اس نے کہا کہ اس کے محکمے کے آدمی اس کو ختم کرنے کے درپے ہیں۔ وہ دس شیطانوں کے اشارے پر میری زندگی کا چراغ گل کر دینا چاہتے ہیں۔ اس لئے کہ میں نے ان شیطانوں کا ایسا راز پالیا ہے جو کوئی نہیں پا سکتا۔ اس نے مجھے ڈائری دیتے ہوئے کہا کہ میں نے اس ڈائری میں ان دس شیطانوں کے بارے میں بڑی تفصیل سے درج کر دیا ہے ہر شیطان کے اپنے اپنے پالتو غنڈے اور بدمعاش ہیں۔ یہ بدمعاش اور دوسرے ساتھی یہ نہیں جانتے ہیں کہ دوسرے شیطان کون ہیں اور ان کے نام کیا ہیں۔ وہ ایک آہنی دیوار کے پس پردہ ہیں۔ تم اپنے شوہر سے کہنا کہ وہ اس گروہ کو ہر قیمت پر ختم کر دے۔ یہ اس دیش اور انسانیت کے ماتھے پر ایک بدنما داغ ہیں۔ مگر میں نے وہ ڈائری تمہارے باپ کو اس لئے نہیں دی کہ مجھے اس پر بھروسہ اور اعتماد نہیں رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ اس ڈائری کو کسی ایسے شخص کو دوں گی جو مخلص' بہادر اور ذہین ہو۔ اس گروہ کا قلع قمع کر سکے مگر مجھے کوئی ایسا شخص بیس برس میں بھی نہیں ملا۔ اس انسپکٹر کو دوسرے دن

بہیمانہ طریقے سے قتل کرایا گیا تھا۔ اس نے مرنے سے دو گھنٹے قبل کسی نہ کسی طرح تمہارے باپ کو یہ پتا دیا کہ وہ ڈائری مجھے دے کر آیا ہے۔ تمہارے باپ نے مجھ سے ڈائری طلب کی تو میں نے اس کے حوالے کرنے سے صاف انکار کر دیا جس پر اس نے پہلے تو مجھے سمجھانے کی کوشش کی۔ میں راضی نہ ہوئی تو اس نے مجھے زدوکوب کیا۔ پھر مجھے بری طرح مارا پیٹا بھی اور میری دو ایک سہیلیوں کے آنے کی وجہ سے گھر سے نکل گیا۔ میں اسی روز فرار ہو کر کلکتہ پہنچ گئی۔

جب تم نے جنم لیا تو میرے دل میں آیا کہ تمہارا گلا گھونٹ کر تمہیں ختم کر دوں۔ تمہارے باپ کی بے وفائی سے مجھے ایسا لگا تھا کہ جیسے تم میری ناجائز اولاد ہو۔ مگر تمہاری پیاری صورت اور رونے کی آواز نے میرے دل کی ساری نفرت اور کثافت دور کر دی۔ میں نے تمہیں سینے سے چمٹا لیا تو ایسے لگا جیسے میرے دل کا خلاء پر ہو گیا ہے۔ تم اپنے باپ پر کبھی یہ ظاہر نہ ہونے دینا کہ تم اس کی بیٹی ہو ورنہ تم اس کے ہاتھوں موت کا نشانہ بن جاؤ گی۔ اس شخص سے ضرور بھیانک انتقام لینا۔ اگر وہ تمہارے اور میرے انتقام سے خوش قسمتی سے بچ گیا تو یہ ڈائری کسی ایسے پولیس افسر کو دے دینا جو فرض شناس اور دیانت دار ہو۔ اس لئے کہ ان دس شیطانوں کے گروہ پر ہاتھ ڈالنا ہر کسی پولیس افسر کے بس کی بات نہیں ہے۔ اس بات کو بھی اچھی طرح سے ذہن میں رکھنا کہ یہ ڈائری اس گروہ کے لئے موت سے کہیں خطرناک ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ اگر ان کا راز فاش ہو گیا تو ان میں سے ایک شخص بھی زندہ نہیں بچ سکے گا۔ عوام انہیں کتوں کی موت ماریں گے۔ آج بھی یہ دس شیطان ایک اکائی کی طرح ہیں اور پوری طرح فعال ہیں۔ ایسے ایسے عہدوں پر فائز ہیں کہ عزت کے علاوہ بے پناہ دولت کے بھی مالک ہیں۔ کتنی دولت ہے وہ خود بھی بغیر حساب کئے بتانے سے قاصر ہیں۔ انہیں اس ملک میں جو عزت اور مقام حاصل ہے وہ شاید ہی کسی کو حاصل ہو گی۔ اگر ان شیطانوں کو ختم نہیں کیا گیا تو آنے والی نسلوں کا مستقبل تاریک ہو جائے گی۔

تمہاری بدنصیب ماں رقیہ خانم۔

سپنا نے اپنی ماں کا خط دو مرتبہ پڑھا۔ اس کی ماں نے اس کے باپ کے بارے میں جو باتیں خط میں لکھی تھیں وہ پہلے ہی اس کے علم میں آ چکی تھیں۔ اگر اس کے باپ کو اس کمزور لمحے نے ملا دیا نہیں ہوتا اور اصل حقیقت آشکارا نہیں ہوئی ہوتی وہ انجانے میں ماں کے انتقام کی حسرت کل رات پوری کر چکی ہوتی اس لئے کہ اس نے اپنی ماں سے عہد کیا ہوا

تھا اور اسے ایک مقدس فریضہ سمجھ کر قسم کھالی تھی۔

اس کی ماں نے اس کے باپ کے بارے میں خط میں جھوٹ بول کر اس کے دل میں نفرت کا زہر بھرنے کی کوشش کی تھی' کیا دنیا میں ایک بیوی اپنے شوہر سے ایسا بھیانک انتقام لینے کے بارے میں سوچ بھی سکتی ہے۔ ماں نے اسے بھی اپنے ساتھ انتقام کے اندھے جنون میں مبتلا کر دیا تھا۔ آج حالات نے ثابت کر دیا کہ اس کی ماں غلطی پر تھی۔ اس خط سے یہ ثابت ہو گیا کہ وہ وقار حسین ہی کی بیٹی ہے۔ اس نے جو اندازہ لگایا تھا وہ درست ثابت ہوا تھا۔

سپنا نے خط پڑھ کر جمال کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے خط پڑھ کر سپنا کی طرف لوٹاتے ہوئے کہا۔ ''مجھے اندازہ نہ تھا کہ تمہاری امی اس قدر جذباتی اور ضدی عورت تھیں۔ کیا کوئی عورت اپنے شوہر سے ایسے بھیانک انتقام کے بارے میں سوچ بھی سکتی ہے۔''

''میں خود حیران اور پریشان ہوں کہ انہوں نے میرے فرشتہ صفت باپ کے خلاف اتنا بڑا فیصلہ کس لئے کیا تھا۔ جبکہ وہ ایک تعلیم یافتہ عورت تھیں اور درس و تدریس کے باعزت اور باوقار پیشے سے وابستہ تھیں۔''

''بعض اوقات نفرت کا زہر انسان کی سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت کو ختم کر دیتا ہے۔''

''اچھا آپ یہ ڈائری تو مجھے دکھائیں جو سارے فساد کی جڑ ہے۔'' سپنا نے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا۔

''میرا مشورہ یہ ہے کہ ڈائری دیکھنے اور پڑھنے میں وقت ضائع کرنے سے بہتر ہے کہ ہم یہاں سے فوراً نکل چلیں۔''

''وہ کس لئے؟'' سپنا نے تعجب سے پوچھا۔

''اس لئے کہ ہمارا یہاں ٹھہرنا بے مقصد اور خطرے سے خالی نہیں ہے۔'' جمال کہنے لگا۔ ''ہم یہاں تمہاری امی کی تلاش میں آئے تھے۔ وہ یہاں نہیں ہیں اور نہ ان کا کوئی پتا ہے۔ وہ ڈائری مل گئی ہے جس کے ملنے کا دور دور تک کوئی امکان نہ تھا۔ کیسا عجیب اتفاق ہے۔ لہٰذا واپس چلتے ہیں' کہیں ایسا نہ ہو کہ دشمن جو ڈائری کی بو سونگھتا پھر رہا ہے وہ یہاں نہ پہنچ جائے۔ کوئی بھی بات کسی وقت بھی ممکن ہو سکتی ہے۔ خدانخواستہ یہ ڈائری دشمن کے ہاتھ لگ گئی تو پھر ہم میں سے کوئی بھی بچ نہ سکے گا۔''

سپنا نے ایک لمحے کے لئے سوچا' جمال غلط نہیں کہہ رہا تھا۔ اس کے خدشات بے بنیاد نہیں تھے۔ سپنا نے اس کے ہاتھ سے ڈائری نہیں لی۔ دفعتاً گلی میں ایک گاڑی کے تیز رفتاری سے داخل ہونے کی آواز سنائی۔ پھر وہ گاڑی اس مکان کے سامنے رکی تو ان کے دل دھڑک اٹھے۔ ان کی رگوں میں لہو منجمد ہونے لگا۔ دشمن ان کی بو سونگھتا ان کے تعاقب میں آ پہنچا تھا۔ سپنا حیران تھی کہ اسے ان کی یہاں آمد کے بارے میں کیسے پتا چلا۔ دروازہ اور کھڑکیاں بند ہونے کی وجہ سے وہ گاڑی نہیں دیکھ سکے گی۔ جمال انہیں دیکھنے کے لئے کھڑکی کی طرف بڑھا تو سپنا نے اس کا ہاتھ پکڑ کے روک لیا۔ وہ اسے پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھتی ہوئی بولی۔ ''نہیں۔''

دو ایک مردوں کے بولنے' ہنسنے اور قہقہے لگانے کی آوازیں سنائی دیں۔ انہیں ایسا لگا جیسے وہ ان کے حصار میں آ جانے کی وجہ سے خوش ہوئے ہیں اور استہزائی انداز سے ہنس رہے ہوں۔ سپنا نے جواب دیا۔ جمال کا خوف اور خدشہ درست ثابت ہوا۔ یک لخت اسے ڈائری کا خیال آیا تو وہ جمال سے سرگوشی میں گھٹی ہوئی آواز میں بولی۔ ''ڈائری جلدی سے کہیں چھپا دو۔ ہمیں ہر قیمت پر اس کی حفاظت کرنا ہے۔''

جمال یک دم چونکا۔ وہ کوئی ایسی محفوظ جگہ تلاش کرنے لگا جہاں کسی بدمعاش کی نظر نہ پڑ سکے۔ ادھر سپنا کا دہشت سے برا حال تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ کیسی ستم ظریفی ہے کہ ڈائری ملنے اور وہ دیکھنے بھی نہ پائی تھی کہ بدمعاش اسے چھین کر لے جانے کے لئے پہنچ گئے تھے۔ جمال دوسرے کمرے کی طرف بڑھا تو اس نے سنا کہ گاڑی تیز رفتاری سے گلی سے نکل کر واپس جا رہی ہے۔ اس کے انجن کی آواز سنائی دینا بند ہو گئی تو وہ دھپ سے کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس نے اپنا ہاتھ پیشانی پر لے جا کر ہتھیلی سے پسینہ پونچھا۔ اس کی پیشانی عرق آلود ہو رہی تھی۔ پھر اس نے اپنا ایک ہاتھ سینے پر رکھ لیا۔ اس کی سانسیں بری طرح پھول رہی تھیں۔ جمال اس کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔

''اللہ تیرا شکر ہے کہ تو نے آئی بلا کو ٹال دیا۔'' وہ پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان بولی۔ ''جمال! یہاں سے جلد نکل چلو مجھے خوف آ رہا ہے۔''

''چلو۔'' جمال نے کہا۔ ''کہیں وہ بدمعاش پھر نہ آ جائیں۔ اب یہاں ایک منٹ رکنا بھی خطرے سے خالی نہیں ہے۔''

جمال نے ڈائری جیب میں رکھ لی۔ وہ سپنا کے ہمراہ دروازے کی طرف بڑھا تو

کسی نے بڑی بدتمیزی سے دروازے پر دستک دی۔ سپنا کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ جمال سراسیمہ ہو گیا۔ ان دونوں نے ایک دوسرے کو متوحش نظروں سے دیکھا۔ سپنا' جمال سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کا بدن دہشت سے لرزنے لگا۔ خود پر قابو پانے کی جدوجہد بے سود ہو رہی تھی۔

''کون ہے؟'' جمال نے حوصلہ کر کے تیز و تند لہجے میں پوچھا مگر اس کی آواز کا ارتعاش نمایاں تھا۔

''میں موسیٰ ہوں۔'' باہر سے جواب ملا۔ ''افروزہ بی بی نے بھیجا ہے۔ آپ کو کھانے پر بلایا ہے۔''

ان دونوں کی جان میں جان آئی۔ جمال نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ وہ اندر آیا تو سپنا اس سے بولی۔ ''اپنی بیگم صاحبہ سے کہو کہ فلائٹ کا وقت ہو رہا ہے۔ ہم کھانا نہیں کھائیں گے۔''

نوکر کے گھر سے نکلتے ہی جمال نے باہر نکل کر گلی میں جھانکا۔ جب اس نے دیکھا کہ اس نوکر کے سوا گلی میں کسی گاڑی یا آدمی کا کوئی نام و نشان نہیں ہے تو اس نے سپنا کو باہر آنے کا اشارہ کیا۔ سپنا باہر نکلی' جمال نے دروازہ بند کر کے تالا لگا دیا۔ پھر ان دونوں نے تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے گلی کو پار کیا۔ نکڑ پر ایک خالی آٹو رکشہ کھڑا ہوا تھا۔ اس میں سوار ہو گئے۔ جمال بولا۔ ''ایئر پورٹ۔''

آٹو رکشہ بڑی تیزی سے اپنا سفر طے کر رہا تھا مگر یہ مسافت ان پر کسی صدی کی طرح بھاری ہو رہی تھی۔ سپنا کا خوف و دہشت سے برا حال تھا۔ جو گاڑی بھی مخالف سمت سے آتی اور عقب سے اوورٹیک کرتی ہوئی گزرنے لگتی تو اسے اس گاڑی پر دشمن کا دھوکہ ہوتا۔ اسے ہر طرف نادیدہ دشمن کی آنکھیں اپنی طرف دیکھتی ہوئی لگ رہی تھیں۔ ان کا رکشہ جب ایک ویران اور سنسان سڑک سے گزرنے لگا تو فضا کا ہولناک سکوت ایک سرگوشی بن گیا تھا۔ جس کی بازگشت ہر سمت پکارتی تھی کہ موت ان کے گرد اپنا حصار قائم کر رہی ہے۔ عدم تحفظ کا منحوس سایہ اب جیسے ان کے پیچھے لگ گیا تھا۔ ایک انجانا خوف اس کے اعصاب کو شکستہ کر رہا تھا۔ وہ اپنی خود اعتمادی بحال رکھنے کے لئے جمال سے باتیں کرنے لگی۔

سپنا اور جمال جب کھلنا میں اپنی حویلی میں پہنچے تو انہیں ایسا لگا جیسے وہ کرب'

اذیت اور اضطراب کے جہنم سے گزر کے آئے ہوں۔ جہاز میں بھی ان دونوں نے ڈائری کے موضوع پر کوئی بات نہیں کی تھی۔ انہوں نے حویلی پہنچتے ہی سب سے پہلے اپنی ڈائری کا ایک ایک ورق اچھی طرح سے دیکھا اور پڑھا۔ اس ڈائری کے چالیس بیالیس صفحات پر دس شیطانوں کے نام' ان کے پیشے' خفیہ ٹھکانے بیس برس پہلے کا ان کا ماضی اور حال اور ان کے جرائم کی فہرست تھی۔ ان کے جرائم قابل معافی نہ تھے۔ ان کی سزا یہ تھی کہ انہیں تختہ دار پر چڑھا دیا جائے۔ ان بیس برسوں میں بھی انہیں کوئی بھی کیفر کردار تک پہنچا نہ سکا تھا بلکہ ان کے جرائم میں نجانے کتنے سو گنا اضافہ ہو گیا تھا۔ انہیں جتنی بھی سخت سے سخت سزا دی جائے وہ کم تھی۔

''کوئی سوچ بھی نہیں سکتا ہے کہ یہ دس شیطان جنہیں لوگ عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اصل میں کیا ہیں۔'' سپنا بولی۔ ''دنیا انہیں فرشتہ سمجھتی ہے۔ یہ ڈائری نہیں ملتی تو میں بھی انہیں فرشتے ہی سمجھتی۔''

''اس لئے تو یہ نہیں چاہتے ہیں کہ یہ ڈائری عوام کی نظروں میں آ جائے۔'' جمال نے کہا۔ ''وہ بیس برس سے اس کے حصول کے لئے شکاری کتوں کی طرح تمہاری ماں اور باپ کی تلاش میں خاک چھانتے پھر رہے تھے۔ یہ ڈائری ان کے لئے نہ صرف اہم اور خطرناک ہے بلکہ تباہ کن بھی ہے۔ اس ڈائری اور ان کے جرائم کی فہرست جو ٹھوس ثبوت کے ساتھ اس میں درج ہے تختہ دار تک پہنچایا جا سکتا ہے لیکن یہ اتنا آسان بھی نہیں ہے۔ اس لئے کہ یہ تمام شیطان بہت با اثر' بے رحم اور طاقتور ہیں۔ تمہارے ابو ہی اس گروہ کا قلع قمع کر سکتے ہیں۔

☆......☆......☆

وقار حسین کلکتہ پہنچا تو وہ بہت خوش تھا۔ یہ خوشی اس لئے تھی کہ اسے اپنی بیٹی مل گئی تھی جس کے بارے میں اسے رقیہ خانم نے بتایا تھا۔ اس کی بیوی اس قدر سنگدل ہو گی اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔ اس نے اپنی بیٹی کو پانے کے بعد رقیہ خانم کو معاف کر دیا تھا۔ اب تو اس کے دل میں نفرت کی رمق بھی نہیں رہی تھی۔ اس نے دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ رقیہ خانم کو اس بات کا یقین دلانے میں کامیاب ہو جائے گا کہ اس نے اپنی زندگی میں اس سے زیادہ کسی سے پیار نہیں کیا اور اس کے پیار کی خاطر ہی اس نے اپنے آپ کو قربان کرنا منظور کر لیا تھا اور اس دس شیطانوں کے گروہ سے علیحدگی اختیار کر لی تھی اب وہ اس کا دل جیتنے

کے لئے جوا کھیلنے کے لئے تیار تھا۔ آج اب اس کے پاس ایک بہت بڑا ٹرمپ کارڈ تھا۔ اسے امید تھی کہ اس کارڈ کی وجہ سے رقیہ خانم اپنی ہار مان لے گی۔

وہ پرکاش آنند کے گھر پہنچا تو پتا چلا کہ وہ مع فیملی تصویروں کی نمائش اور فروخت کے لئے امریکہ اور یورپ کے دورے پر بحری جہاز سے روانہ ہو گیا ہے اس کی واپسی میں ایک برس کا عرصہ لگ جائے گا یہاں سے مایوس ہو کر وقار حسین نے اسے ایک دو جگہ اور تلاش کیا جن کا نام اور پتا اسے سپنا نے دیا تھا۔ یہ عورتیں اس کی ماں کی دوست تھیں اور اس شہر کی نامور آرٹسٹ بھی تھیں۔ انہوں نے اسے بتایا کہ کئی برسوں سے نہ تو رقیہ خانم کو دیکھا اور نہ ہی اس کا کوئی خط آیا۔ وہ اس کے بارے میں کچھ نہیں بتا سکتی ہیں۔ وقار حسین اب رقیہ خانم کے وجود سے مایوس اور دل شکستہ سا ہو گیا تھا۔ اس بات میں کوئی شک نہیں رہا تھا کہ رقیہ خانم کو دس شیطانوں کے گروہ نے ختم کر دیا ہے۔ اب اس کی تلاش بیکار ہے۔ وہ زندگی میں پہلی بار رقیہ خانم کو یاد کر کے بے حد جذباتی ہو گیا اور پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ کاش! وہ زندہ ہوتی۔ بیٹی مل گئی تھی بیوی بھی مل جاتی تو اس کی خوشیاں دوبالا ہو جاتیں۔ اب اس کے آنسو بہنا بند ہوئے اور جی ٹھہرا تو اس نے سوچا۔ اب اس کے لئے ایک سپنا ہی سہارا رہ گئی ہے جو اس کی بیوی کی نشانی ہے۔ وہ اس کے سہارے جی لے گا مگر دس شیطانوں کے گروہ کا قلع قمع کیسے کر سکے گا۔ کاش! وہ ڈائری ہی کسی کو دے جاتی۔

دوسرے دن صبح گیارہ بجے وہ ہوٹل سے نکلا تاکہ اپنے کچھ دیرینہ دوستوں سے مل کر واپس چلا جائے۔ اب اس شہر میں ٹھہرنے سے کچھ حاصل نہ تھا۔ جب وہ چورنگی پر ٹیکسی سے اتر کر کرایہ ادا کر رہا تھا تو اس نے ایک عورت کو جیولرز شاپ سے نکلتے دیکھا تو ٹھٹھک گیا۔ اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا' ہیئر اسٹائل' میک اپ' چہرے پر رنگین شیشوں کا چشمہ' دائیں رخسار پر مندمل ہو جانے والے زخم کے نشان سے اس عورت کو کوئی پہچان سکتا تھا کہ یہ رقیہ خانم ہے مگر اس کے دل نے پہچان لیا تھا کہ یہ رقیہ خانم ہے۔ رخسار پر اسے زخم کا نشان مصنوعی لگا تھا۔ وہ حیرت اور فرط مسرت سے اچھل پڑا۔ اسے ایک لمحہ ایسا لگا جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہا ہو۔ یہ خواب نہیں حقیقت تھی۔ وہ رقیہ خانم تھی۔ اس کی بیوی تھی۔

☆......☆......☆

رقیہ خانم اور اس کے درمیان کوئی پچیس تیس گز کا فاصلہ تھا۔ وہ اس کی طرف تیزی سے بڑھا اور ایک دم سے ٹھٹھک کے رک گیا ایک سرد لہر کسی خنجر کی نوک کی طرح اس کی ریڑھ کی ہڈی میں اتر گئی بیک وقت دو باتیں ہوئی تھیں رقیہ خانم سڑک کے کنارے کھڑی جس ٹیکسی کی طرف بڑھ رہی تھی اسی ٹیکسی کے پیچھے ایک اور ٹیکسی کھڑی تھی اس میں سے دو آدمی اتر کر جیولرز شاپ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ انہوں نے رقیہ خانم کو دیکھا تھا اور نہ رقیہ خانم نے انہیں دیکھا تھا وہ انہیں دیکھتی تو ہرگز پہچان نہیں پاتی لیکن اگر وہ رقیہ خانم کو دیکھتے تو شاید پہچان لیتے وقار حسین نے ان دونوں کو پہچان لیا تھا اگر وہ دونوں اسے دیکھتے تو پہچان لیتے اس لئے وقار حسین رک گیا اور تیزی سے ایک دکان کے شوکیس کی طرف منہ کر کے کھڑا ہو گیا وہ رقیہ خانم کی ٹیکسی کے پاس پہنچا تو وہ اور رقیہ خانم ان کی نظروں میں آ جاتے اور ان کے لئے ایک مصیبت کھڑی ہو جاتی۔ وہ اس وقت کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا اس کے لئے یہ مسرت اور طمانیت کا باعث تھا کہ اس کی بیوی زندہ ہے وہ اسے تلاش کرے گا مگر اسے یہ پسند نہیں تھا کہ جلد بازی کی وجہ سے وہ اور رقیہ خانم زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھیں۔

اس نے دونوں شیطانوں کو پہچان لیا تھا وہ اپنے گروہ کے صرف تین شیطانوں کے نام اور ان کے چہروں سے واقف تھا باقی سات شیطانوں کے بارے میں اسے کچھ پتا نہیں تھا کہ وہ کون ہیں اور ان کے نام کیا ہیں اس گروہ میں بڑی راز داری برتی جاتی تھی چونکہ وہ ایک زبردست شخصیت کا مالک تھا اس لئے اس سے یہ تینوں شیطان کام لیتے تھے تیسرا شیطان ڈاکٹر احمد جعفر تھا جو اس تنظیم کا سرغنہ بھی تھا ان دونوں شیطانوں نے بہروپ بھر رکھے تھے شاید اس لئے کہ غیر قانونی طور پر سرحد عبور کر کے آئے تھے اس نے ان دونوں کو بیس برس کے بعد بھی پہچان لیا تھا چیف سیکرٹری انصار احمد کو اس کی چال سے پہچان لیا تھا وہ لنگڑا کر اور ایک طرف جھک کر چلتا تھا دوسرا شیطان انٹیلی جنس کا ڈائریکٹر وحید بیگ

تھا اس کی طوطے جیسی ناک پر ایک بہت بڑا مسا تھا۔

رقیہ خانم ٹیکسی میں بیٹھ کر چلی گئی مگر وہ کھڑا رہا وہ ایک ایسی دکان کی آڑ میں کھڑا ہو گیا جہاں سے وہ جیولرز شاپ پر نظر رکھ سکتا تھا اسے ان دو شیطانوں کے نکلنے کا انتظار تھا اس نے ایک ٹیکسی اس مقصد سے رکوا بھی رکھی تھی ان کے انتظار میں وہ ان کے قتل کا منصوبہ بنانے لگا انہیں ڈھاکہ شہر کے مقابلے میں یہاں قتل کرنا نسبتاً آسان تھا اس کی جیب میں سائلنسر لگا ہوا ریوالور تھا جو اس نے حفظ ماتقدم کے طور پر رکھا ہوا تھا جو وہ سرحد عبور کرتے وقت ساتھ رکھتا تھا۔

وہ نصف گھنٹے کے بعد دکان سے نکلے تو ان کے پیچھے پیچھے دو آدمی زیورات کے ڈبے شاپنگ بیگ میں لئے آ رہے تھے تھوڑی دیر کے بعد اس کی ٹیکسی غیر محسوس انداز اور کسی قدر فاصلے سے ان کی ٹیکسی کا تعاقب کر رہی تھی اس نے ٹیکسی ڈرائیور کو سمجھا دیا تھا ان کی ٹیکسی امپیریل ہوٹل پر رکی۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے ہوٹل کے اندر داخل ہو کر ریسپشن پر لڑکی کے ہاتھ پر سو سو کے دو نوٹ رکھے تو وہ بھونچکی سی ہو گئی۔ جب اس نے اس لڑکی کو اپنا مطلب بتایا تو اس نے خوشی خوشی ان دونوں کے بارے معلومات فراہم کر دیں ان کے نام رام لعل اور بادل گھوش ہیں۔ انہوں نے ایک ہفتے کے لئے سوٹ لیا ہوا ہے سوٹ نمبر 15 ہے۔ یہ دونوں بمبئی سے کل یہاں آئے ہیں یہ دونوں بمبئی کے بہت بڑے تاجروں میں سے ہیں ان کے ہمراہ شاید دو ملازمین بھی آئے ہوئے ہیں ایک تو چائنا ہوٹل کمرہ نمبر 620 میں ٹھہرا ہے اس لئے کہ وہ ایک دوسرے سے کل سے مسلسل رابطہ رکھے ہوئے ہیں ان دونوں کی دو مرتبہ آمد و رفت ہو چکی ہے دوسرا کہاں ٹھہرا ہے مجھے کچھ پتا نہیں اگر آپ کو مزید معلومات درکار ہیں تو اپنے نام پتا اور ٹیلی فون نمبر دے جائیں میرا نام سوہنی مکرجی ہے میں آپ کی ہر خدمت بجا لانے کے لئے تیار ہوں۔ وقار حسین زیر لب مسکرا دیا اس نے اپنی جیب سے سو سو کے دو نوٹ نکال کر رکھ دیئے۔ ''میں پھر کسی وقت آؤں گا مزید معلومات کے لئے اس کا صلہ الگ ہو گا مگر میرے بارے میں انہیں معلوم نہ ہو اس لئے کہ میں دہلی سے آیا ہوں اور ان کا کاروباری رقیب ہوں بزنس میں تو جوڑ توڑ کرنا ہی پڑتا ہے۔''

وقار حسین دو دن سے رقیہ خانم کی تلاش میں خوار ہوتا رہا اور ان دو دنوں میں چار مرتبہ وہ بہروپ بدل کر امپیریل ہوٹل اور ان دونوں شیطانوں کو قتل کرنے کے ارادے سے گیا تھا مگر وہ ہوٹل میں موجود نہیں تھے اس نے سوہنی مکرجی سے پھر ملاقات نہیں کی تھی۔

آج جب وہ چورنگی پر ٹیکسی سے اترا تو اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی اس نے رقیہ خانم کو اسی جیولرز شاپ سے باہر آتے دیکھا دوسری بار رقیہ خانم کا اس جیولرز شاپ میں آنا حیران کن بات تھی یہ وقت ان باتوں کو سوچنے کا نہیں تھا آج وہ اسے ہر قیمت پر پا لینا چاہتا تھا۔

رقیہ خانم نے اسے دیکھا نہیں تھا وہ سڑک کے دوسری طرف فٹ پاتھ پر کھڑی ہاتھ کے اشارے سے ایک خالی ٹیکسی کو روک رہی تھی جتنی دیر میں وہ سڑک پار کر کے اس طرف پہنچا رقیہ خانم ٹیکسی میں بیٹھ چکی تھی اسنے دوسری ٹیکسی روکی اوراس میں بیٹھ کراس کے تعاقب مین روانہ ہوگیا۔ اس نے ٹیکسی ڈرائیور سے کہا کہ وہ اس ٹیکسی کا غیر محسوس انداز سے تعاقب کرے پھر وہ سوچنے لگا کہ رقیہ خانم کس لئے آج بھی جیولرز شاپ گئی تھی کہیں وہ اپنے زیورات بیچ کر گزر بسر تو نہیں کر رہی ہے؟ وہ یہاں کیا کر رہی ہے؟ کیسی ظالم اور سنگدل ماں ہے وہ اپنی بیٹی کی خبر لینے تک نہیں گئی۔

رقیہ خانم کی ٹیکسی ہوٹل ڈیلکس انٹرنیشنل پر رکی تو وقار حسین کی حیرت کی انتہا نہ رہی یہ ایک بہت بڑا ہوٹل تھا چار سو کمروں پر مشتمل تھا کسی قدر مہنگا بھی تھا اس ہوٹل میں ایک متوسط شخص کا کمرہ لینا اور وہاں ڈیڑھ دو ماہ قیام کرنا اس کی بساط سے باہر تھا رقیہ خانم کے پاس اتنی دولت کہاں سے آ گئی کہ وہ اس قدر ٹھاٹ باٹ سے ہوٹل میں رہ رہی ہے شاید وہ اسی لئے اپنے تمام زیورات ایک ایک کر کے بیچ رہی ہے آخر کب تک بیچتی رہے گی زیورات ختم ہونے کے بعد کیا کرے گی۔

وقار حسین ٹیکسی کا کرایہ ادا کر کے ہوٹل کے اندر داخل ہوا تو اسے رقیہ خانم کہیں دکھائی نہیں دی وہ لفٹ میں سوار ہو کر اوپر جا چکی تھی وہ ریسیپشن کاؤنٹر کی طرف بڑھا چینی نژاد لڑکی نے پیشہ ورانہ مسکراہٹ سے اس کا استقبال کیا۔ ''کیا آپ کو کوئی کمرہ چاہیے؟''

''نہیں مجھے آپ سے کچھ معلوم کرنا ہے۔'' وقار حسین نے جواب دیا۔ ''بلقیس بیگم یا رقیہ خانم نام کی کوئی عورت آپ کے ہوٹل میں ٹھہری ہے؟''

''ایک منٹ ابھی بتاتی ہوں۔'' اس نے کمپیوٹر کے بٹن آن کئے پھر چند لمحوں کے بعد بولی۔ ''سوری! ان ناموں کی کوئی عورت ہوٹل میں نہیں ٹھہری ہے۔''

وقار حسین نے جیب سے سو روپے کا ایک نوٹ نکالا کاؤنٹر پر کھڑے لوگوں اور ریسیپشنسٹ لڑکیوں کی نظریں بچا کر اس کے نرم و نازک اور گورے ہاتھ پر رکھ دیا اس لڑکی

نے نوٹ کو جلدی سے اپنی اسکرٹ کی جیب میں رکھ لیا تو وقار حسین نے کہا۔ ''آپ اس عورت کا نام بتا سکتی ہیں جس کے چہرے پر زخم کا نشان ہے اور...... وہ چند لمحے پہلے اپنے کمرے کی چابی لے کر اوپر گئی ہے۔''

''اس کا نام رتنا دیوی ہے اور وہ کل شام نیپال سے آئی ہے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''وہ کمرہ نمبر تین سو تین میں ٹھہری ہوئی ہے وہ کل شاید کمرہ خالی کر دے گی۔''

وہ شکریہ کہہ کر کاؤنٹر سے ہٹ گیا لفٹ کی طرف بڑھتے ہوئے ٹھٹھک کے رک گیا اس نے طاہر کو دو آدمیوں کے ساتھ کافی ہاؤس کی طرف جاتے دیکھا اس نے ان دونوں کو بھی پہچان لیا یہ دونوں کلکتہ کے خطرناک بدمعاش تھے پیشہ ور قاتل تھے ایک کا نام بلاقی تھا دوسرے کا نام آنند پال تھا۔

کیا یہ تینوں رقیہ خانم کو ٹھکانے لگانے کے لئے آئے ہیں؟ وقار حسین نے سوچا۔ کیا انہوں نے اس بہروپ میں بھی رقیہ خانم کو شناخت کر لیا ہے کیسا عجیب اتفاق ہے کہ وہ یہاں پہنچ گیا ورنہ اسے اپنی بیوی کی لاش ملتی وہ اپنی بیوی کو بچا سکتا ہے اسے یہاں سے جتنا جلد ہو سکے نکال کر لے جانا چاہیے وہ تیزی سے لفٹ کی طرف بڑھ گیا۔

وہ چند لمحوں کے بعد کمرہ نمبر تین سو تین کے سامنے کھڑا تھا اس نے دروازے پر بڑی آہستگی سے دستک دی چند لمحوں کے بعد اندر سے رقیہ خانم کی آواز آئی۔ ''کون ہے؟'' اس نے آواز بدل کر کہا۔ ''روم سروس۔''

رقیہ خانم نے دروازہ کھول دیا وہ تیزی سے بولی۔ ''مجھے اس وقت کسی......'' وقار حسین پر نگاہ پڑتے ہی وہ بھونچکی سی ہوگئی اس پر ایک لمحے کے لئے سکتہ سا چھا گیا دوسرے لمحے وہ سنبھل کر اور بیگانہ سی بن کر بولی۔ ''کون ہو تم؟''

''وقار حسین۔'' وہ زیر لب مسکرایا اس کی آنکھیں مسرت سے چمکنے لگیں وہ سرشاری سے بولا اور آخر میں نے تمہیں پا لیا نا رقیہ بیگم! میں......'' رقیہ نے دروازہ بند کرنے کی کوشش کی تو وقار حسین نے فوراً ہی دروازے کے بیچ اپنی ٹانگ پھنسا دی پھر وہ دروازے کو اندر کی طرف دھکیلتا ہوا داخل ہوا تو رقیہ خانم کی طاقت اور مزاحمت دم توڑ گئی وہ دیوار سے جا لگی وقار حسین دروازہ بند کر کے اس کی طرف پلٹا تو وہ نفرت سے گھورتی ہوئی جذباتی لہجے میں چیخی۔ ''میں کہتی ہوں تم کمرے سے نکل جاؤ نہیں تو شور مچا دوں گی۔''

''اگر تم ایسا کرو گی تو اپنے پیروں پر کلہاڑی مارو گی رقیہ!'' وہ نرمی سے بولا۔ ''تم

نے اپنی زندگی میں اتنی حماقتیں کی ہیں کہ ان کا کوئی شمار نہیں ہے اگر آج تم پھر کوئی حماقت کرو گی تو پھر یہ حماقت بہت مہنگی پڑے گی۔"

"تم مجھے قتل کرنے آئے ہو نا؟" وہ زہر سے بجھے ہوئے لہجے میں بولی۔ "مگر میں تمہاری یہ حسرت کبھی پوری نہیں ہونے دوں گی۔" رقیہ خانم پلنگ کی طرف لپکی۔ پلنگ پر رکھا ہوا اپنا پرس اٹھا لیا۔ اس نے ریوالور نکال کر پلٹ کر دیکھا وقار حسین کرسی پر بڑے اطمینان سے بیٹھا اسے دیکھ رہا تھا۔

"مجھے تمہیں قتل کرنا ہوتا تو میں یہاں نہیں آتا اور نہ میں اپنے ہاتھوں سے تمہیں قتل کرتا۔" وقار حسین نے نپے تلے لہجے میں بڑے پرسکون انداز میں کہا۔ "کلکتہ شہر میں ایسے کرائے کے قاتلوں کی کوئی کمی نہیں ہے جو معمولی رقم کے عوض کسی کی بھی جان لے سکتے ہیں۔"

تم ڈائری لینے کے لئے آئے ہو تو سن لو میں نے اسی رات اسے جلا دیا تھا جس رات تم میرے گھر پر آئے تھے۔" رقیہ خانم کا لہجہ حقارت آمیز ہو گیا۔

"کیا کہا تم نے ڈائری جلا دی؟" وقار حسین کو ایسا محسوس ہوا جیسے رقیہ خانم نے اس کے سینے میں چھرا گھونپ دیا ہو۔ اس نے اپنا سینہ دبا لیا۔ چند لمحوں کے بعد وہ کربناک لہجے میں بولا۔ "یہ تم نے کیا کیا بے وقوف عورت؟ اسے بیس برس تک اپنے پاس حفاظت سے رکھنے کے بعد جلا دیا۔ اسے جلانا' ضائع کرنا تھا تو تم نے بیس برس پہلے ہی کیوں نہیں کیا۔ اب اسے جلا کر تم نے کیا پایا؟"

"اسے جلا کر میں نے تمہارا دل ہی نہیں بلکہ تمہارا سارا وجود جلا کر خاکستر کر دیا۔" رقیہ خانم کی آنکھوں میں شعلے لپکنے لگے۔ "تم نے مجھے بھی تو اسی طرح سے جلایا تھا نا؟"

"میں نے تمہیں جلایا نہیں تھا بلکہ ہم دونوں کو ایک سازش کے تحت بدظن کیا گیا تھا۔" وقار حسین اسے سمجھانے کے انداز میں کہنے لگا۔ "یہ سچ تھا کہ میں نتاشا سے محبت کرتا تھا۔ یہ تو تم بھی جانتی ہو۔ حالات نے ہمیں ایک دوسرے کا جیون ساتھی بننے نہیں دیا۔ جب میں نے تم سے شادی کی تو میں نے تمہیں اسی محبت اور جذبے سے چاہنے کی کوشش کی جس طرح ایک مرد چاہتا ہے لیکن تم نے میری محبت میں کھوٹ محسوس کی۔ میں شادی کے بعد ایک بار بھی نتاشا سے نہیں ملا لیکن کسی نے بے پر کی اڑانا شروع کی کہ میں اس سے چوری چھپے ملتا ہوں۔ اس کے علاوہ میری اس گروہ کی خوبرو لڑکیوں سے گہری دوستی ہے۔ میں نے قتل و

غارت گری اور منشیات فروشی شروع کر دی ہے حالانکہ میں نے ایک قتل بھی نہیں کیا۔ البتہ اس گروہ کی منشیات غیر ممالک پہنچاتا رہا ہوں۔ جب میں نے دیکھا کہ اس گروہ کی جڑیں کھوکھلی ہوتی جا رہی ہیں اور ان کی خون آشامی درندوں کو بھی شرمندہ کر رہی ہے تو میں نے اسے چھوڑ دیا اور پس پردہ اس کے خاتمے کی کوشش کی مگر تمہیں اس کا اعتبار نہیں؟ تم نے مجھ پر بے وفائی کے الزام کے علاوہ بڑی تہمتیں لگائیں۔ پھر ایک روزہ وہ ڈائری مجھے دینے کے بجائے اچانک غائب ہوگئیں۔ پھر میں نے تمہیں بہت تلاش کیا جب یہ دس شیطان میرے سخت دشمن ہو گئے تو مجھے ملک چھوڑنا پڑا۔ میں یہاں سے جاتے وقت اپنے ساتھ منشیات لے گیا تھا جس سے میں نے کروڑوں کمائے۔ میں نے بے پناہ دولت پا کر دل کا چین و سکون نہیں پایا۔ کسی عورت کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھا۔ تمہیں یاد کرتا رہا اور بالآخر تمہاری قسمت یہاں کھینچ لائی۔ میں یہاں اس گروہ کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے لئے ہی آیا ہوں۔ اس لئے کہ ان کا ظلم و ستم اور بربریت حد سے بڑھتی جا رہی ہے۔''

''میں نے تم سے کہا تو نہیں کہ اپنی داستان سناؤ۔'' وہ بے زاری سے بولی۔ ''مجھ سے اپنی محبت کا اظہار مت کرو...... اب میرے دل کے کسی کونے میں تمہارے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ اب وہ ڈائری بھی نہیں رہی ہے جس کی بنا پر تم اس خطرناک گروہ سے ٹکراؤ۔''

''تم نے اس ڈائری کو کبھی پڑھا ہوگا۔ ان دس شیطانوں کے نام اور ان کے جرائم کی فہرست بھی دیکھی ہوگی۔ بس تم مجھے ان سب کے نام بتا دو...... مجھ سے تعاون کرو۔''

''مگر تم ان سے کیسے مقابلہ کرو گے؟ وہ آج اس قدر اونچے منصب پر ہیں۔ انہیں جو عزت اور مقبولیت حاصل ہے اسے کیسے ختم کرو گے؟''

''ان ہاتھوں سے۔'' وقار حسین نے اسے اپنے ہاتھ دکھاتے ہوئے کہا۔ ''اور ہاں میری ایک بات غور سے سنو تین پیشہ ور قاتل تمہیں قتل کرنے کے لئے ہوٹل میں آئے ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ شیطان بھی اس شہر میں موجود ہیں۔ انہوں نے شاید تمہارا پتا چلا لیا ہے۔ شاید میرے بارے میں انہیں علم ہو چکا ہوگا۔ پہلا نمبر تمہارا ہے۔''

''تم جھوٹ بول رہے ہو تاکہ میں خوف زدہ ہو کر تمہارے جال میں پھنس جاؤں۔'' رقیہ خانم کو اس کی بات پر اعتبار نہیں آ رہا تھا۔

''دیکھو وہ تمہارے ہی نہیں میرے بھی دشمن ہیں۔'' وقار حسین نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ''تم نفرت اور جذبات کی زد میں بہہ کر بات مت کرو۔ میں صرف اس مافیا

تنظیم کو ختم کرنے کے لئے تم سے تعاون کا خواہاں ہوں۔ اس کے خاتمے کے بعد ہمارے راستے الگ الگ ہو جائیں گے۔'' اس نے توقف کر کے سانس لیا۔ ''تم بچوں جیسی باتیں کیوں کر رہی ہو؟ تم نے ان بدمعاشوں کو دیکھا ہے یا انہیں شناخت کر سکتی ہو؟ وہ تمہیں ہوٹل میں قتل نہیں کریں گے۔ جب تم باہر نکلو گی وہ تمہیں بڑی آسانی سے کہیں بھی موت کی نیند سلا سکتے ہیں۔''

''ہو سکتا ہے وہ کسی اور کو قتل کرنے آئے ہوں۔'' وہ بھنا کر بولی۔ ''مجھے اس بہروپ میں شناخت کرنا ناممکن ہے اور پھر انہیں کس نے بتایا کہ میں اس ہوٹل میں مقیم ہوں۔ میں ڈیڑھ دو مہینے اس شہر سے باہر رہ کر دو دن پہلے تو آئی ہوں۔ انہیں میرا سراغ کیسے لگ گیا؟''

''پھر تم نے بچگانہ باتیں شروع کر دیں؟'' وقار حسین نے تیکھے لہجے میں کہا۔ ''تم اپنی دانست میں سمجھ رہی ہو کہ تمہیں کوئی شناخت نہیں کر سکتا۔ میں نے تمہیں جس طرح شناخت کر لیا اسی طرح انہوں نے بھی کر لیا ہو گا تمہارا یہ بہروپ ایسا نہیں ہے کہ بدمعاشوں کی نگاہیں دھوکہ کھا جائیں۔ جس طرح میں نے یہ معلوم کر لیا کہ تم دو دن پہلے نیپال سے آئی ہو اور رتنا دیوی کے نام سے ٹھہری ہو اور کل واپس جا رہی ہو انہوں نے معلوم نہیں کر لیا ہو گا؟''

''تم یہاں سے جاتے ہو یا میں ہوٹل کے منیجر کو ٹیلی فون کر کے پولیس کو بلاؤں؟'' وہ ٹیلی فون کے پاس پہنچ کر رکی اور اس نے اپنا بایاں ہاتھ ریسیور پر رکھ دیا۔ اس کے دائیں ہاتھ میں بدستور پستول تھا اور اس پر سائلنسر لگا ہوا تھا چہرے پر سفاکی تھی اور آنکھوں سے حقارت جھانک رہی تھی۔

وقار حسین کی جیب میں بھی ایک ریوالور تھا جس میں سائلنسر لگا ہوا تھا وہ اس کی مدد سے بڑی آسانی سے اپنی بیوی پر قابو پا سکتا تھا لیکن اس سے اس کے زخمی ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ اس خون خرابے میں دونوں ہی کا نقصان تھا۔ اسے غصہ آ رہا تھا کہ بے وقوف عورت اس کی بات کو سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کر رہی ہے۔ اسے اندازہ نہ تھا کہ اس کی بیوی کی نس نس میں نفرت کا زہر سرایت کر چکا ہے۔ وہ تریاق کہاں سے لائے۔ اس کے جی میں تو آیا ان بدمعاشوں کے ہاتھوں مرنے کے لئے چھوڑ جائے پھر اسے خیال آیا کہ وہ آخر اس کی بیوی ہے۔ اس نے اپنی بیٹی سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اسے ہر قیمت پر اپنے ساتھ لائے گا۔

اس نے ایک اور کوشش کر لینے کی خاطر ضبط سے کام لیا۔تم مجھ پر اعتماد کس لئے نہیں کر رہی ہو؟''

''اس لئے کہ تم اس گروہ کے آج بھی آلہ کار ہو اور تمہیں اس لئے یہاں بلایا گیا ہے کہ مجھ سے ڈائری حاصل کر کے انہیں دے دو۔'' وہ پھنکاری......وقار حسین کو اچانک سپنا کا خیال آیا ابھی سپنا کا ذکر ہی نہیں آیا تھا۔ رقیہ خانم تم نے یہ راز آج تک اس سے چھپا کر رکھا تھا۔ اس نے ابھی تک سپنا کا کوئی ذکر نہیں کیا تھا۔ وہ زیر لب مسکرا دیا۔''تم نے یہ راز مجھ سے چھپا کر رکھا کہ میری کوئی بیٹی ہے؟''

رقیہ خانم اچھل پڑی۔ اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔''یہ جھوٹ ہے۔تم سے کس نے کہا کہ تمہاری کوئی بیٹی ہے؟''

''خود میری بیٹی سپنا نے!'' وقار حسین مسکرانے لگا۔''وقت اور حالات نے ہمیں ملا دیا۔تم نے اس کے دل میں میرے خلاف اس قدر شدید نفرت بھر دی تھی اور اس سے یہ کہہ کر انتقام کے اندھے جنون میں مبتلا کر دیا تھا کہ میں اس کے باپ کا قاتل ہوں۔ اگر وقت ہماری مدد نہ کرتا تو ایک باپ اپنی بیٹی کے ہاتھوں قتل ہو چکا ہوتا۔ ساری بساط الٹ چکی ہے۔میری بیٹی مجھ سے اتنی محبت کرتی ہے کہ تم تصور بھی نہیں کر سکتی ہو۔''

''کہاں ہے میری بیٹی!'' رقیہ خانم ایک دم سے تڑپ اٹھی۔ اس کی آنکھوں سے ممتا جھانکنے لگی۔

''تم کیسی خود غرض اور ظالم ماں ہو کہ اپنی جوان بیٹی کو بیچ منجدھار چھوڑ کر فرار ہو گئیں؟ کیا تم نے ممتا پر بھی داغ نہیں لگا دیا؟''

''میں نے اس کی عزت اور زندگی بچانے کے لئے یہ قدم اٹھایا تھا۔'' وہ دل گرفتہ لہجے میں بولی۔''اس لئے کہ شیطان اس ڈائری کے لئے میرے دشمن تھے اس کے نہ تھے مجھے یہ خوف دامن گیر تھا کہ کہیں اسے میرے ہمراہ ہونے کی صورت میں نشانہ نہ بنا دیا جائے۔ میں نے اسے باریسال بھیج دیا تھا تا کہ وہ کچھ دن وہاں رہے اور زلیخا اسے کلکتہ پرکاش آنند کے پاس پہنچا دے۔ چونکہ شکاری کتے میرے تعاقب میں تھے اور کلکتہ میں آ پہنچے تھے اس لئے میں نیپال چلی گئی میں نے وہاں سے پرکاش آنند کو خط لکھ کر سپنا کے بارے میں دریافت کیا کہ وہ پہنچ گئی یا نہیں۔ پرکاش آنند کا جواب آیا کہ سپنا کلکتہ نہیں آئی ہے۔ وہ جیسے ہی اس کے پاس پہنچے گی وہ اسے پہنچا دے گا یا خط لکھ کر مطلع کر دے گا۔ میں

یہ سوچ کر مطمئن ہو کر بیٹھ گئی کہ وہ باریسال میں زلیخا کے ہاں محفوظ ہے آرام وسکون سے ہے۔ اس لئے وہ کلکتہ نہیں گئی ہے میں نے زلیخا کو نیپال سے خط لکھا کہ وہ سپنا کو اپنے پاس ہی رکھے۔ میں اسے ایک دو مہینے کے بعد آ کر لے جاؤں گی۔ میں نے زلیخا کو اپنا پتہ نہیں لکھا اور خط بھی پرکاش آنند کو بھیج کر کلکتہ سے پوسٹ کرایا تھا۔ اس لئے کہ میرا پتا کہیں دشمن کے ہاتھ نہ لگ جائے۔ میں اب اس لئے واپس آئی کہ باریسال جا کر سپنا کو ہمراہ لیتی آؤں اور نیپال لے جاؤں مجھے نیپال کے شاہی خاندان میں استانی کی ملازمت کے علاوہ طعام اور قیام کی بھی سہولت مل گئی ہے۔''

''تمہیں کچھ پتا ہے اس ڈیڑھ دو مہینے کے عرصے میں میری بدنصیب بچی پر کیا قیامت ٹوٹ پڑی۔'' وقار حسین نے ایک سرد آہ بھری اس نے رقیہ خانم پر نفسیاتی دباؤ ڈالنے کے لئے جھوٹ بولا۔ ''اسے اپنے شوہر کو ہلاک کرنے کے الزام میں گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا گیا......'' اس نے ردعمل دیکھنے کے لئے دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''کیا؟'' رقیہ خانم کے ہاتھ سے پستول چھوٹ کر فرش پر گر پڑا۔ اس پر سکتہ چھا گیا۔ وہ دم بخود سی رہ گئی۔ دوسرے لمحے چونک کر حیرت وخوف اور دہشت سے بولی تو اسے اپنے حلق میں گولہ اٹکتا محسوس ہو رہا تھا۔ ''سپنا کی شادی ہوگئی اور اس نے اپنے شوہر کو ہلاک کر دیا؟ اس کی شادی کس سے ہوئی، کس نے کرائی اور اس نے کیوں قتل کیا؟'' ایک دم سے رقیہ خانم کا سر چکرایا اور اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ اس کی حالت غیر ہونے لگی۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے زہر میں بجھی ہوئی چھری سینے میں اترتی جا رہی ہو اسے اپنے پیروں پر کھڑا ہونا دشوار ہو رہا تھا۔ وہ سہارا لینے کے لئے دیوار کی طرف بڑھی تو لڑکھڑانے لگی۔ وقار حسین نے لپک کر اسے سہارا دیا اس نے کسی نفرت کا اظہار نہیں کیا اور نہ کوئی مزاحمت کی۔ شاید اس لئے کہ اسے سہارے کی ضرورت تھی۔ اس کے دل کی ساری نفرت اور کثافت جیسے دھل گئی تھی اور غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا تھا۔ وہ اس کے بازوؤں میں جھول گئی۔

وقار حسین نے اسے بستر پر بٹھا دیا اس کے جھوٹ نے ایک پتھر کو ریزہ ریزہ کر دیا تھا۔ وقار حسین نے اسے ایک گلاس پانی پلایا تو اس کی حالت کسی قدر سنبھل گئی مگر اس کی آنکھیں چھلک پڑیں۔ وہ وقار کے شانے پر اپنا سر رکھ کر سسک پڑی۔ وقار حسین اس کے بالوں کو سہلاتا ہوا بولا۔ ''تم نے میری پوری بات نہیں سنی...... یہ ایک لمبی کہانی ہے جو میں

تمہیں کسی اور وقت سناؤں گا۔ اس لئے کہانی سنانے کے لئے وقت بالکل نہیں ہے کچھ دن پہلے وہ جیل سے باعزت طور پر رہا کر دی گئی ہے لیکن شہر میں اپنی سابق سسرال یا میرے گھر میری منتظر ہو گی اب تم یہاں سے فوراً چلنے کی تیاری کرو مجھے اب یہ محسوس ہو رہا ہے کہ وہ بدمعاش تمہیں قتل کرنے کے لئے کسی وقت بھی یہاں آ سکتے ہیں۔ انہیں تمہیں کمرے میں قتل کرنا باہر قتل کرنے کی نسبت زیادہ آسان ہے۔ چلو اٹھو...... جلدی سے اپنے آنسو پونچھو۔''

رقیہ خانم کی جان میں جان آ گئی۔ یہ جان کر کہ اس کی بیٹی خیریت سے ہے اس کے ذہن میں کتنے ہی سوال اٹھ کھڑے ہوئے تھے مگر ان کے پوچھنے کا وقت بالکل نہیں تھا۔ اس نے کسی مجرم کی طرح اپنا سر جھکا کر بڑی خجالت اور شرمندگی سے کہا۔ ''مجھے معاف کر دو میرے سرتاج!''

''اب ان باتوں کا وقت نہیں ہے۔'' وقار حسین نے فرش سے اس کا پستول اٹھا کر اس کے حوالے کر دیا۔ ''تمہارا سامان کہاں ہے؟''

''تم نے تو ابھی کہا ہے کہ دشمن ہوٹل میں میری گھات میں ہے۔'' وہ اپنا پستول پرس میں رکھتی ہوئی بولی ''ہم کیسے نکل کر جا سکیں گے؟ میرے پاس سامان صرف ایک اٹیچی اور پرس ہے کیا یہاں سے نکلنے کا کوئی اور راستہ ہے؟''

''ایک ایسا راستہ ہے جس سے ہم ان کی نظروں میں دھول جھانک کر جا سکتے ہیں۔'' وقار حسین نے اسے تسلی دی۔ ''تم اپنے کمرے میں رہو۔ میں ابھی جائزہ لے کر آتا ہوں۔''

وقار حسین کمرے سے نکلا تو سرشار سا ہو رہا تھا کہ ایک کمزور لمحے نے اسے رقیہ خانم کی نفرت دور کرنے میں مدد دی تھی۔ اس نے پھر سے اپنی کھوئی محبت اور بیوی کو پا لیا تھا۔ اس کے سینے میں جیسے ٹھنڈک سی پڑ گئی تھی اور ساری جلن ختم ہو گئی تھی۔ وہ لفٹ سے نیچے آیا تو اس نے ایک بدمعاش کو ایک صوفے پر اخبار پڑھتے دیکھا۔ طاہر اور دوسرا بدمعاش کاؤنٹر پر کچھ پوچھنے کے لئے کھڑے تھے۔ اب اس کے پاس بالکل وقت نہیں تھا وہ اس کی بیوی کا کمرہ نمبر دریافت کر رہے تھے۔ اس وقت کاؤنٹر پر درجن بھر مرد اور عورتیں کھڑی تھیں یہ غیر ملکی سیاح تھے۔ وقار حسین اس لفٹ سے بارہویں منزل اتر کر چھت پر پہنچا تو وہاں کوئی نہ تھا۔ اوپر کاٹھ کباڑ پڑا ہوا تھا۔ اس ہوٹل کے ساتھ ہی عقب میں ایک عمارت کی چھت تھی جس میں پرائیویٹ فرموں کے دفاتر تھے۔ ان دونوں کے درمیان چار فٹ کا فاصلہ تھا اور

منڈیر بھی نہ تھی۔ اس پر آسانی سے چھلانگ لگا کر پہنچا جا سکتا تھا۔ کیا رقیہ خانم چھلانگ لگا سکے گی؟ اس نے سوچا پھر اسے یاد آیا وہ کالج میں کھیلوں کے مقابلے میں حصہ لیتی تھی اس کے لئے چھلانگ لگانا کچھ مشکل نہ ہوگا۔

وہ تھوڑی دیر کے بعد نیچے آیا اور دروازے پر پہنچ کر ٹھٹھک کے رک گیا۔ اسے دروازہ بھڑا ہوا سا لگا۔ اس نے کان لگا کر سنا تو اسے ایک مرد کا استہزائی قہقہہ سنائی دیا۔ وقار حسین نے راہ داری میں دیکھا سنسان پڑی تھی اس نے اپنی جیب سے ریوالور نکال کر اس پر اپنے ہاتھ کی گرفت سخت کر لی پھر اس نے چند لمحوں کے بعد غیر محسوس انداز سے دروازے کو اندر کی طرف دھکیلا دروازہ بے آواز اتنا کھل گیا کہ ایک آدمی بآسانی اندر داخل ہو سکتا تھا۔ وہ محتاط انداز سے اندر داخل ہوا۔ اس نے مخالف سمت دیکھا رقیہ خانم پتھر کے مجسمے کی طرح کھڑی تھی اس کی آنکھیں خوف و دہشت سے پھٹی ہوئی تھیں چہرہ سفید پڑا ہوا تھا لہو کی ایک بوند بھی نہیں رہی تھی جیسے سارا ن خون نچوڑ لیا گیا تھا۔ اس کے سامنے بلاقی بدمعاش اپنے ہاتھ میں ایک خوفناک خنجر لئے کھڑا تھا وہ وقار حسین کی آمد سے بے خبر تھا اس کی پشت وقار کی طرف تھی۔ وہ رقیہ خانم سے استہزائی لہجے میں کہہ رہا تھا۔ مجھے اس بات کا منہ مانگا معاوضہ دیا گیا ہے کہ تمہارے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے غسل خانے کے ٹب میں ڈال دوں......"

"تمہاری لاش بھی تو اس ٹب میں ڈالی جا سکتی ہے؟" وقار حسین نے دروازہ بند کرتے ہوئے تیکھے لہجے میں کہا۔

بلاقی بڑی تیزی سے اس کی طرف گھوما وقار حسین کے ہاتھ میں ریوالور دیکھ کر اس کا چہرہ متغیر ہو گیا وقار حسین نے بغیر کسی تاخیر کے اس کے دل کا نشانہ لے کر فائر کر دیا کمرے میں ٹس کی آواز گونج کر رہ گئی۔ یہ آواز نہ تو برابر کے کمرے میں جا سکی اور نہ راہ داری میں سنائی دے سکتی تھی۔ اس کے لئے ایک ہی گولی کافی تھی۔ خنجر اس کے اپنے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گر پڑا۔ وہ لڑکھڑایا اور تیورا کر فرش پر ڈھیر ہو گیا اسے اتنی جلدی دم توڑتے ہوئے دیکھ کر وقار حسین کو بڑی حیرت ہوئی۔ اس نے فوراً ہی غسل خانے کا دروازہ کھولا اس کی لاش کو گھسیٹ کر غسل خانے میں لے گیا اور اسے اسی ٹب میں ڈال دیا جس ٹب میں وہ رقیہ خانم کی لاش کے ٹکڑے ڈالنے آیا تھا۔

وقار حسین نے غسل خانے سے نکل کر اس کا دروازہ بند کیا اور فوراً ہی "مداخلت نہ کیجئے" کا بورڈ دروازے کی پشت کے ہک سے نکالا...... پھر دروازہ کھول کر اسے باہر لگا دیا اور

دروازہ بند کر دیا اس نے رقیہ خانم کی طرف دیکھا وہ دیوار سے پشت ٹکائے کھڑی تھی......خاموش اور سراسیمہ تھی۔ وہ اس کے قریب پہنچا تو وہ اس کے سینے سے آ لگی اور سسک پڑی۔ ''تم بروقت نہ آتے تو یہ شیطان مجھے ذبح کر دیتا۔'' اس کی آواز کانپ رہی تھی۔

''اب تمہیں میری بات کا یقین آیا۔'' وقار حسین نے اسے اپنے بازوؤں میں بھر لیا۔

''ہم یہاں سے نکل کر محفوظ جگہ پر چلے جائیں گے۔'' وقار حسین کہنے لگا۔ ''تم یہاں رتنا دیوی کے نام سے ٹھہری ہو۔ تم وہاں چل کر بہروپ بھر لو گی کہ کوئی تمہیں پہچان نہیں سکے گا۔ مجھے بھی بہروپ بھرنا پڑے گا۔ اس لئے کہ ریسپشن کے کاؤنٹر والی چینی نژاد لڑکی مجھے دیکھ چکی ہے اس کے علاوہ اور بھی شکاری کتے میری تلاش میں ہوں گے۔ ہم کل ہی بنگلہ دیش کے لئے روانہ ہو جائیں گے۔''

چند لمحوں کے بعد دروازے پر کسی نے بڑی شائستگی سے دستک دی تو رقیہ خانم نے حیرت اور خوف سے اس کی شکل دیکھی۔ وقار حسین نے اپنی جیب سے فوراً ہی ریوالور نکال کر اس کے کان میں سرگوشی کی۔ ''دوسرا بدمعاش آیا ہے مداخلت نہ کیجئے کا بورڈ دیکھ کر بھی صیاد اپنے دام میں آ گیا۔ تم پوچھ کر دروازہ کھولنا اور ایک دو قدم پیچھے ہٹ جانا یہ ہماری خوش نصیبی ہے کہ اسے موت کا فرشتہ یہاں لے آیا ہے۔''

وقار حسین لپک کر دروازے کے پاس کھڑا ہو گیا رقیہ خانم نے دروازے کے پاس پہنچ کر پوچھا۔ ''کون ہے؟''

''مس رتنا دیوی؟ نیپال سے آپ کے نام ٹیلی گرام آیا ہے۔ اسے وصول کر لیجئے۔'' باہر سے بڑی شائستگی سے جواب دیا گیا۔

''اسے دروازے کے نیچے سے ڈال دیجئے۔'' رقیہ خانم نے جواب دیا۔

''آپ کے وصول یابی کے دستخط چاہئیں۔'' وہ بہت چالاک اور شاطر لگ رہا تھا۔

وقار حسین نے رقیہ خانم کو اشارہ کیا کہ وہ دروازہ کھول دے۔ دوسرے لمحے رقیہ خانم نے دروازہ کھول دیا۔ دروازے پر دوسرا بدمعاش کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا اور اس پر سائلنسر لگا ہوا تھا۔ اس کی نالی رقیہ خانم کو گھور رہی تھی۔ ''یہ ہے ٹیلی گرام۔'' وہ اندر داخل ہوا تو رقیہ خانم تیزی سے پیچھے ہٹنے لگی۔ اسے خبر ہی نہیں ہو سکی کہ اس کے عقب

میں وقار کی صورت میں موت کھڑی ہنس رہی ہے۔ ''سنو مسٹر!'' وقار حسین نے اسے طنزیہ لہجے میں مخاطب کیا۔ وہ تیزی سے پلٹا وقار حسین نے اسے کوئی مہلت نہیں دی۔ پے در پے اس نے دو فائر کر دیئے ایک گولی اس کے حلق کو پھاڑتی ہوئی نکل گئی۔ دوسری گولی اس کے سینے میں دل کی جگہ پر اتر گئی۔ وہ اپنے ریوالور سمیت فرش پر آ رہا۔

وقار حسین نے اس کی لاش بھی اپنے ریوالور سمیت ٹب میں پہلے والے بدمعاش پر ڈال دی۔ غسل خانے کا دروازہ بند کر کے اس سے بولا۔ ''میں تمہاری اٹیچی لے کر چھت پر جا رہا ہوں۔ لفٹ کے سامنے ہی چھت پر جانے کا راستہ ہے تم بے دھڑک اوپر چلی آنا مگر ہوشیار اور چوکنا رہنا۔ ابھی ایک سب سے خطرناک کمینہ اور بے رحم شکاری باقی ہے۔ اگر وہ میرے اوپر جانے کے بعد آ جائے تو اسے تم بلا تامل گولی مار دینا پھر راستے میں کوئی پتھر نہیں رہے گا۔''

''ہوٹل کا ویٹر یا کوئی ملازم کسی کام سے آ گیا تو میں کیا کروں؟'' رقیہ خانم نے سراسیمگی سے کہا۔ اس کے چہرے پر پسینہ پھوٹ پڑا تھا۔ ''دروازے پر مداخلت نہ کیجئے کا جو بورڈ لگا ہوا ہے اس کی وجہ سے کوئی تمہیں ڈسٹرب نہیں کرے گا۔ صرف تھوڑی دیر کی تو بات ہے۔''

وقار حسین اسے دلاسہ دے کر اور اس کی ہمت بڑھا کر اس کی اٹیچی لے کر کمرے سے نکلا اور تیزی سے لفٹ کے پاس پہنچا۔ پھر وہ لفٹ سے بارہویں منزل پر آ کر چھت کے زینے کی طرف بڑھ گیا۔ چھت پر پہنچ کر وہ کاٹھ کباڑ کے پاس کھڑا ہو گیا چھت پر کوئی نہیں تھا حالات اور واقعات مہربان ہو رہے تھے یہاں کوئی خطرہ نہیں تھا وہ اٹیچی فرش پر رکھ کر رقیہ خانم کا انتظار کرنے لگا۔

''کیا آپ اپنی موت کا انتظار کر رہے ہیں مسٹر وقار حسین!'' عقب سے اس کے کانوں میں ایک مانوس اور زہر میں ڈوبی ہوئی آواز گونجی۔

وقار حسین نے تیزی سے پلٹ کر دیکھا تو اس کی رگوں میں لہو منجمد ہونے لگا۔ طاہر اپنے ہاتھ میں ایک خوفناک قسم کا ریوالور لئے کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر سفاکی تھی اور آنکھوں میں وحشیانہ چمک تھی۔ ''طاہر تم؟ تم مجھے قتل کرو گے؟'' وقار حسین نے حیرت اور دکھ سے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

''میں آپ کو قتل کرنے تو یہاں آیا ہوں آپ کا چوکھٹا دیکھنے نہیں۔'' وہ زہر آلود

لہجے میں بولا۔

''کیا میں نے اس دن کے لئے تمہارے باپ کی جان بچائی تھی اور تمہاری ماں کو ہسپتال میں سسک سسک کر مرنے سے بچایا تھا۔ یہی نہیں اس گروہ کے شیطان کے ہاتھوں تمہاری دونوں جوان بہنوں کو نہیں بچاتا تو وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل رہتیں۔''

''آپ نے میرے باپ' میری ماں اور میری بہنوں پر احسان کیا ہے مجھ پر تو نہیں۔'' اس کا لہجہ ہر قسم کے جذبات سے عاری تھا۔ ''میرا باپ اور میری ماں اس دنیا میں موجود نہیں ہیں۔ میری دونوں بہنوں نے اس ملک کو چھوڑ دیا۔ وہ اپنے شوہروں اور بچوں کے ساتھ گلف میں ہیں میں حکم کا غلام ہوں میں آپ کو قتل نہیں کروں گا تو میرا باس مجھے قتل کر دے گا میرے دونوں ساتھی آپ کی اہلیہ کے کمرے میں جشن منا رہے ہیں۔ جب وہ وہاں سے نکلیں گے تو اپنی فتح ونصرت کا نشان ایک ایسی لاش کی صورت میں چھوڑ آئیں گے جو سر بریدہ ہوگی اور اس کے جسم کے تمام پارٹس الگ الگ ٹب میں پڑے ہوں گے۔ افسوس تو اس بات کا ہے کہ آپ اس دل کش نظارے کو دیکھ نہیں سکیں گے۔''

''مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم اس قدر کمینے اور ذلیل شخص ثابت ہو گے۔'' وقار حسین نے حقارت آمیز لہجے میں کہا۔ ''اچھا یہ بتاؤ کہ تم میری جان بخشی کا کیا معاوضہ لو گے۔ بیس ہزار' تیس ہزار...... چالیس ہزار......''

''کیا اتنی بڑی رقم آپ کے پاس موجود ہے؟'' طاہر کا چہرہ دمک اٹھا۔ اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ ''اس میں اور اضافہ نہیں ہوسکتا ہے؟''

''میرے بٹوے میں بیس ہزار کی رقم ہے اور اٹیچی میں ساٹھ ہزار کی رقم۔ میں تمہیں پچاس ہزار دینے کے لئے تیار ہوں۔''

''پہلے تو آپ اپنا بٹوا میرے قدموں میں ڈال دیں۔'' وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔ ''اس کے بعد دوسری بات ہوگی۔''

وقار حسین نے جیب میں ہاتھ ڈالتے وقت اپنا ریوالور نکالنا چاہا لیکن وہ نکال نہ سکا۔ دشمن بہت چوکنا اور ہوشیار تھا۔ اس کی تیز اور متجسس نظریں اس کے ہاتھ پر جمی تھیں۔ اس نے یہ سوچ کر خاموشی سے اپنا بٹوا جیب سے نکال کر دانستہ اس سے چار پانچ قدم دور اچھال دیا۔ وہ بٹوا اٹھانے کے لئے بڑھے گا تو اس مہلت سے فائدہ اٹھا کر وہ ریوالور نکال لے گا یا پھر اٹیچی کھولتے وقت وہ ریوالور نکال سکے گا۔ طاہر اس کا بٹوا اٹھانے کے لئے اس

کی طرف بڑھا نہیں۔ وہ قہقہہ مار کر بولا...... ''اب مجھے آپ کی پیش کش قبول کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے اب یہ بٹوا اور اٹیچی میری ہے میں آپ کو ختم بھی کر دوں گا اور ساری رقم بھی لے جاؤں گا۔ آپ کو میں نے کتنی خوبصورتی سے بے وقوف بنایا ہے۔'' وہ ہنسنے لگا۔

''مجھے تم سے اسی کمینگی کی توقع تھی۔'' وقار حسین نے بھڑک کر کہا۔ ''مجھے اب لگ رہا ہے کہ تمہارا باپ تمہیں کسی نالی سے اٹھا کر لایا ہے۔''

''اچھا اب آپ اباؤٹ ٹرن ہو جائیں اور چھت کے کنارے کی طرف خراماں خراماں چل پڑیں۔'' مشتعل ہوئے بغیر وہ سفاک لہجے میں بولا۔

''وہ کس لئے؟'' وقار حسین نے انجان بن کر اسے اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ ''تم مجھے یہاں بھی گولی مار کر ختم کر سکتے ہو؟''

''میں آپ کو آپ کے احسانات کے بدلے گولی نہیں ماروں گا بلکہ چھت سے نیچے دھکا دے دوں گا۔ یہ موت ذرا آسان ہوگی۔ چلئے۔'' اس کا لہجہ تحکم آمیز تھا۔

طاہر کا حکم ماننے کے سوا چارہ بھی نہیں تھا۔ اب اسے ایسی تدبیر سجھائی نہیں دے رہی تھی جس سے وہ مہلت پا کر یک لخت اپنا ریوالور نکال سکے اس کی بیوی کا پتا نہیں تھا۔ وہ اوپر آنے کے بعد اسے بچا نہیں سکتی تھی۔ پستول رکھنا اور بات تھی۔ اتنی دور یعنی زینے سے اس بدمعاش کا نشانہ لینا مذاق نہیں تھا۔ اس کا نشانہ چوک جانے کی صورت میں وہ بھی موت کا نشانہ بن سکتی تھی اس کا اوپر نہ آنا بہتر تھا۔

وقار حسین آگے چلنے لگا اور طاہر اس کے پیچھے تھا اور اس نے اپنے ریوالور کی نال وقار کی گدی پر رکھ دی تھی۔ وہ لحظہ بہ لحظہ موت سے قریب ہوتا جا رہا تھا۔ اب صرف آٹھ دس قدم رہ گئے تھے۔ اس کے جسم سے ساری طاقت جیسے سلب ہو کر رہ گئی تھی۔ نس نس میں خون برف کی طرح یخ ہو گیا تھا۔ سردی نہیں تھی لیکن اس کے سارے بدن میں سردی کی لہر پھیل گئی تھی۔ اس کا ذہن بڑی تیزی سے کوئی تدبیر سوچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ موت سے نہیں ڈرتا تھا مگر اسے ایسی موت پسند نہیں تھی وہ کسی بہادر کی طرح لڑتے ہوئے اپنی جان' جان آفریں کے سپرد کر دینا چاہتا تھا۔ اب اس کی زندگی چند لمحوں کی مہمان تھی۔

چھت پر گہرا سناٹا تھا اور تیز ہوا چل رہی تھی۔ یہاں سے کلکتہ شہر کا نظارہ کیا جا سکتا تھا۔ وہ اس شہر کو دیکھ رہا تھا جہاں ہر طرف آدمیوں کا ہجوم' بلند و بالا عمارتیں اور سڑکوں پر

ٹریفک کا سیلاب رواں نظر آ رہا تھا۔ وقت کی نبض یک لخت جیسے رک گئی اس نے یکے بعد دیگرے دو ہلکی آوازیں فضا میں سنیں اس نے سرعت سے پلٹ کر دیکھا طاہر لٹو کی طرح گھومتا ہوا دھڑام سے منہ کے بل فرش پر ریوالور سمیت آ رہا۔ اس کے منہ سے کراہنے کی آواز تک نہیں نکلی تھی اس کا بدن اچھلا' تڑپا اور ٹھنڈا ہو گیا وہ بڑے صبر و ضبط سے اس دنیا سے رخصت ہو گیا تھا وقار حسین کو جیسے یقین نہیں آیا کہ اسے نئی زندگی بھی مل سکتی ہے اس کی پیشانی ہی عرق آلود نہیں ہو رہی تھی بلکہ سارا جسم پسینے سے بھیگ گیا تھا۔ اس نے زینے کی طرف دیکھا رقیہ خانم پستول لئے کھڑی تھی۔ اس کی حیرت دوچند ہو گئی۔ وقار حسین مسکرا دیا اور اس نے جیب سے رومال نکال کر پسینہ پونچھا۔ جیب میں رومال رکھ کر وہ لاش کے پاس پہنچا اس کی پشت پر جو دو سوراخ ہو گئے تھے اس میں سے خون بہہ رہا تھا۔ اس نے اپنے پیر سے لاش کو سیدھا کیا۔ لاش کے منہ سے بھی خون بہہ رہا تھا بدمعاش کے چہرے پر ہی نہیں بلکہ آنکھوں میں بھی حیرت کا عنصر تھا۔

رقیہ خانم اپنے پرس میں پستول رکھتی ہوئی اس کے پاس آ کھڑی ہوئی۔ وہ تعجب اور سرشاری سے بولا۔ ''رقیہ؟ تم نے میرا احسان اتارنے میں دیر نہیں کی تمہارا کن الفاظ میں شکریہ ادا کروں میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے تمہارا نشانہ اتنا اچھا ہو گا میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔''

''کیا رفیق سفر ایک دوسرے کے کام آئیں تو وہ احسان ہوتا ہے؟'' اس نے پرخیال نظروں سے اپنے شوہر کی طرف دیکھا۔ ''میں نے یہ پستول محض اپنے پاس رکھنے اور کسی کو خوف زدہ کرنے کے لئے نہیں خریدا تھا یہ میں نے تمہیں قتل کرنے کے لئے خریدا تھا اور ایک ڈیڑھ مہینے تک نشانے بازی کی تھی۔ رات دن مشق کی تھی آج میرا نشانہ تمہارے کام آ گیا اور اس نے تمہاری جان بچالی۔ تم نہیں جانتے کہ آج مجھے تمہاری جان بچا کر کیسی عجیب سی خوشی ہو رہی ہے اتنی خوشی تمہاری جان لے کر بھی محسوس نہیں ہوتی۔''

وقار حسین نے لپک کر پہلے اپنا پرس اٹھایا۔ پھر اس نے اٹیچی اٹھائی اور بولا۔ ''آؤ چلیں۔ تین چھوٹے شیطان اپنے انجام کو پہنچ گئے ہیں۔''

وقار حسین اسے اپنے ہمراہ لے کر زینے کے بجائے دوسری اور قریب والی عمارت کی طرف بڑھا تو وہ سمجھ گئی کہ وقار حسین اس عمارت کی چھت پر جا کر اس کے زینے سے نیچے جانا چاہتا ہے۔ وہ چلتے چلتے رک گئی تو وقار حسین نے بھی رک کر اس کی طرف حیرت

سے دیکھا۔ ''خیریت تو ہے؟''

''اب تو کوئی خطرہ نہیں رہا۔'' اس نے کہا۔ ''اب ہم لفٹ سے نیچے جا کر باہر نکل سکتے ہیں۔''

''لفٹ سے نیچے جانے میں اب بھی خطرہ وجود ہے۔'' وقار حسین نے کہا۔ ''کیا معلوم ان خبیثوں کے ساتھی بھی نیچے موجود ہوں۔ اس عمارت سے نیچے جانے کے سوا چارہ نہیں ہے اور اسی میں ہماری سلامتی بھی پوشیدہ ہے۔''

''اگر ہوٹل والوں کو شام تک میرے کمرے کے غسل خانے کے ٹب میں پڑی ہوئی لاشوں کا پتا چل گیا تو کیا پولیس ہماری تلاش شروع نہیں کر دے گی؟''

''پولیس سے تم اس طرح بچ سکتی ہو کہ یہ بہروپ اتار کر دوسرا بہروپ بھر لو۔'' وقار حسین نے کہا۔

وقار حسین نے اٹیچی قریب والی عمارت کی چھت پر پھینک دی۔ پھر وہ چھلانگ لگا کر اس چھت پر پہنچ گیا۔ رقیہ خانم نے اس چھت پر چھلانگ لگانے سے پہلے دونوں عمارتوں کے بیچ خلا کو دیکھا اس کے بدن پر جھرجھری سی آئی چھلانگ ٹھیک سے نہ لگانے کی صورت میں اس کی ہڈیاں سلامت نہ رہیں اور وہ موت کی آغوش میں جا سکتی تھی اس نے پیر سے سینڈل نکال کر سامنے والی عمارت پر پھینک دیئے پھر وہ چھ سات قدم پیچھے گئی پھر تیزی سے دوڑتے ہوئے اس نے چھلانگ لگائی۔ چھلانگ لگاتے وقت اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اسے ایسا لگا جیسے وہ خلا میں پستی کی جانب تیزی سے گرتی جا رہی ہو۔ موت کی آغوش میں سما رہی ہو۔

اس نے اپنی آنکھیں کھولیں تو اپنے آپ کو چھت کے فرش پر کھڑا پایا۔ وقار حسین اسے مسکرا کے دیکھ رہا تھا۔ ''تمہیں تو اولمپک گیمز میں شرکت کرنا چاہیے میرا خیال ہے کانسی کا تمغہ تو لے آؤ گی۔''

''میرے لئے تم سے بڑا تمغہ کوئی نہیں ہے۔'' وہ محبت پاش لہجے میں بولی۔

☆......☆......☆

وقار حسین اسے اپنے ہمراہ لے کر فوراً ہی اپنے ہوٹل کے بجائے اپنے دیرینہ دوست حبیب احسان کے پاس پہنچا۔ حبیب یہ دیکھ کر بہت حیران اور خوش ہوا کہ اس کے دوست کی بیوی ڈرامائی طور پر مل گئی ہے۔ وقار حسین کو یہ سب کچھ کسی سندر سپنے کی طرح لگ رہا تھا۔ اس کی زندگی میں پھر سے بہار آ گئی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد جب انہیں تنہائی نصیب ہوئی تو رقیہ خانم نے اسے محبت پاش نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا تم مجھے پا کر واقعی بہت خوش ہو؟''

''کیا تمہارے دل میں اب بھی میرے خلاف کوئی شک وشبہ موجود ہے؟'' وقار حسین نے جواب دیا۔ ''اب بھی تمہیں میری محبت کا یقین نہیں آیا ہے؟''

''اسی احساس سے میرا سینہ کٹ رہا ہے کہ میں نے تم سے سخت نفرت کی اور تمہیں قتل کرنے کے درپے رہی۔'' رقیہ خانم سنجیدہ ہوگئی۔ ''ایسی صورت میں تم سے پہلی جیسی محبت کی توقع کیسی کرسکتی ہوں۔''

''میرے دل میں تمہارے خلاف کبھی نفرت نہیں رہی۔'' اس نے سرشاری سے کہا۔ ''میں یہ بات اچھی طرح سے جانتا تھا کہ جب تم میرے سامنے آ ؤ گی تمہاری ساری نفرت کو میری محبت دھو کر رکھ دے گی اور انتقام کی بھڑکتی آگ کو بجھا دے گی کیونکہ محبت کرنے والے ایک دوسرے سے نفرت کر ہی نہیں سکتے ہیں۔''

''تمہیں میری تلاش تھی یا ڈائری کی؟ سچ سچ بتاؤ؟'' رقیہ خانم نے پرخیال نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''دونوں کی۔'' وقار حسین کہنے لگا۔ ''تمہاری اس لئے کہ تم میری کائنات تھی۔ ڈائری کی تلاش اس لئے تھی کہ میں اپنے ملک کی قدر کرنا چاہتا ہوں۔ میری یہ زندگی میرے دیش کے لئے ہے۔ میرا فرض بنتا ہے کہ انسانیت کی خدمت کروں شاید اسی طرح گناہوں کا کفارہ ادا ہو جائے۔''

''اب جبکہ ڈائری نہیں ہے تو تم کیا کرو گے؟'' رقیہ خانم نے اسے ٹٹولنے کی غرض سے دریافت کیا۔

''میں کسی نہ کسی طرح ان شیطانوں کا پتا چلا کر انہیں ختم کر دوں گا۔'' وہ بولا۔ ''د شیطان تو امپیریل ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ میں ابھی انہیں جہنم رسید کرنے جا ر ہوں۔ اس سے اچھا موقع پھر نہیں ملے گا۔ پھر ہم یہاں سے بنگلہ دیش جائیں گے۔ تم نے شاید ڈائری پڑھی ہو گی اور شیطانوں کے نام سے واقف ہو گی۔ میں تمہاری مدد اور تعاون سے ان سے نمٹوں گا۔''

''اگر ایسی بات ہے تو تمہیں یہ خوش خبری سنا دوں کہ ڈائری محفوظ ہے اور کومیا کے ایک پیش امام مولوی عبدالسبحان کے پاس بطور امانت رکھی ہے۔ میں نے انہیں یہ تاکید کر دی تھی کہ یہ ڈائری وہ سپنا کے علاوہ کسی اور کو نہ دیں۔ میں نے سپنا کے نام ایک خط لکھ کر ان کے پاس چھوڑ دیا تھا۔ دراصل میں اپنی زندگی سے مایوس ہو چکی تھی۔ میں نے اس خ میں اسے بتا دیا تھا کہ وہ کس کی بیٹی ہے۔''

''ڈائری موجود ہے۔'' وقار حسین کا چہرہ دمک اٹھا اور اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہنے لگا۔ ''یہ تم نے مجھے بہت بڑی خوش خبری سنائی ہے۔ آج میری جھولی خوشیوں سے بھر گئی ہے اور میری منزل میرے لئے آسان ہو گئ ہے۔''

رقیہ خانم بے حد سنجیدہ ہو کر سوچنے لگی تو وقار نے سکوت توڑتے ہوئے پوچھا۔ ''ا اب تم کیا سوچنے لگی ہو؟''

''میں یہ سوچ رہی ہوں کہ کیوں نہ اب ہم اس دیش سے نکل کر کسی اور ملک میر جا بسیں۔''

''وہ کس لئے؟''

''اس لئے کہ ان شیطانوں سے ٹکر لینا آسان نہیں ہے وہ کس قدر خطرناک او طاقتور ہیں کیا تمہیں اس کا اندازہ نہیں؟ تم ان کا بال تک بیکا نہیں کر سکو گے؟'' رقیہ خانم نے توقف کر کے گہری سانس لی۔ ''اب جب کہ تمہیں بیوی اور بیٹی مل گئی ہے تو اپنے آپ خطرے میں ڈال کر کیوں ایک گھر اور خوشیوں کو اجاڑتے ہو۔''

''وہ کتنے ہی طاقتور اور خطرناک سہی مگر قانون سے بالاتر نہیں ہیں۔ میں ان خوشیوں کو پا کر خود غرض نہیں بنوں گا۔ تم ساتھ دو یا نہ دو میں تنہا ان سے بھڑ جاؤں گا۔''

رقیہ خانم ہنس پڑی۔ ''میں یہ دیکھ رہی تھی کہ کہیں تمہارے جذبات پر بیٹی اور بیوی کی محبت تو غالب نہیں آئی۔ تم خود غرض تو نہیں ہو گئے ہو۔ میں تمہارا ہر قدم پر ساتھ دوں گی۔ چاہے مجھے اپنی جان ہی قربان کیوں نہ کرنا پڑے۔''

☆......☆......☆

وقار حسین نے پروفیسر کے بھیس میں اپنے آپ کو سنگھار میز کے بڑے آئینے میں ناقدانہ نظروں سے دیکھا تو وہ خود کو بھی نہ پہچان سکا۔ وہ ہوٹل بھیس بدل کر جانا چاہتا تھا۔ اس کے علم میں یہ بات آ چکی تھی کہ اس گروہ کے ایک ایک بدمعاش کے پاس اس کی تازہ ترین تصویر موجود ہے اور انہیں حکم ہے کہ اسے دیکھتے ہی گولی مار دی جائے۔ وہ صرف بدمعاشوں ہی کی نہیں بلکہ ہوٹل والوں کی نظر میں بھی آنا نہیں چاہتا تھا۔

وہ ہوٹل پہنچا تو رات کے دس بج رہے تھے اور اس کا خدشہ درست نکلا۔ اس نے دو خطرناک بدمعاشوں کو انتظار گاہ میں صوفوں پر براجمان دیکھا۔ وہ بظاہر اخبار پڑھ رہے تھے مگر ان کی تیز چھوٹی آنکھیں ہوٹل کے اندر داخل ہونے والے ہر شخص کو شک بھرے انداز سے اپنی گرفت میں لے رہی تھیں۔ ہر شخص پر وہ کڑی نگاہ رکھے ہوئے تھے۔

ان دونوں بدمعاشوں میں سے ایک بدمعاش کو وہ بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ اس کا نام انعام الحق تھا۔ وہ الٹے قدموں واپس آ گیا۔ وہ ہوٹل کی عمارت سے چند قدم پر کھڑا سوچتا رہا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ ہوٹل میں اکیلا داخل ہونے اور لفٹ کی طرف بڑھنے سے انعام پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہو سکتا تھا۔ اس کا کسی عورت کے ہمراہ جانا زیادہ مناسب ہوگا؟

اس کے ذہن میں اچانک ایک خیال بجلی کی طرح آیا۔ سپنا نے نوری بیگم اور شکنتلا دیوی کے بارے میں بھی بتایا تھا۔ اس نے ٹیکسی اسٹینڈ پر ایک ٹیکسی ڈرائیور سے پوچھا۔ ''کیا تم اس شکنتلا دیوی کی کوٹھی سے واقف ہو جہاں لڑکیاں دل بستگی کے لئے ملتی ہیں۔''

ٹیکسی ڈرائیور نے اسے تھوڑی دیر میں شکنتلا دیوی کی کوٹھی پر پہنچا دیا۔ جس وقت وہ نشست گاہ میں پردہ ہٹا کر داخل ہو رہا تھا اس نے ایک عورت کو یہ کہتے ہوئے سنا۔ ''نوری! تم نے ان لڑکیوں کے ماں باپ کو قتل کر کے اچھا نہیں کیا۔ تم نے دو سال پیشتر بھی تین لڑکیوں کی ماں اور اس کی بڑی بہنوں کو زہر دے کر......'' اسے دیکھ کر اس عورت نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

نوری بیگم؟ وقار حسین کی نظروں کے سامنے ایک کوندا سا لپکا۔ یہ وہی نوری بیگم ہے جس نے اس کی بیٹی کو اغوا کر کے اسی قحبہ خانے پر پہنچایا تھا۔ اس نے دونوں عورتوں کی طرف دیکھا۔ اس نے شکنتلا دیوی اور نوری بیگم کو بھی پہچان لیا۔ شکنتلا دیوی سفید ساڑھی میں تھی۔ نوری بیگم نے کالی ساڑھی اور اسی رنگ کا بغیر بازوؤں والا بلاؤز پہن رکھا تھا۔ وہ اس قدر بے رحم، سفاک اور درندہ صفت عورت ہو گی کوئی اس کی موہنی صورت دیکھ کر سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

شکنتلا دیوی نے اپنی جگہ کھڑے ہو کر اس کا استقبال کیا۔ ''تشریف لائیے۔ میں آپ کی کیا خدمت کر سکتی ہوں؟''

وقار حسین نے نوری بیگم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ انہیں میرے ہمراہ بھیج دیں۔''

وقار حسین نے اپنے بٹوے سے پانچ ہزار کی رقم نکال کر نوری بیگم کی طرف بڑھائی۔ نوری بیگم نے رقم گن کر اپنے پرس میں رکھ لی اور پوچھا۔ ''کہاں چلنا ہے؟''

''ہوٹل امپیریل!'' اس نے جواب دیا۔

جب وہ نوری بیگم کے ہمراہ ہوٹل میں داخل ہوا تو اس نے ان دونوں بدمعاشوں کو اسی جگہ براجمان دیکھا۔ وہ بے نیازی سے اپنے کندھے جھکائے نوری بیگم کی کمر پر ہاتھ رکھے کاؤنٹر پر پہنچا۔ ''ایک ڈبل بیڈ چاہیے۔ دوسری منزل پر مل جائے تو زیادہ مناسب ہو گا۔''

وقار حسین نے رجسٹر میں خانہ پری کرتے ہوئے ان بدمعاشوں کی طرف کن انکھیوں سے دیکھا۔ وہ اس وقت ایک سفید فام عورت کو دیکھ رہے تھے جو شعلہ مجسم بنی اپنے ساتھی سے باتیں کر رہی تھی۔ کمرے میں پہنچ کر پورٹر کو ٹپ دے کر رخصت کرنے کے بعد وقار حسین نے سکون و اطمینان کا سانس لیا۔ پھر اس سے پوچھا۔ ''آپ کے لئے کیا منگواؤں؟''

''جو آپ کا دل چاہے۔'' نوری بیگم نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''ذرا باتھ روم سے ہو کر آتی ہوں۔''

نوری بیگم باتھ روم چلی گئی۔ وقار حسین نے جلدی سے دو پیگ تیار کئے جیب سے خواب آور گولیاں نکالیں جو دس عدد تھیں۔ اس نے وہ ساری گولیاں نوری بیگم کے گلاس میں گھول دیں۔

تھوڑی دیر کے بعد نوری بیگم مسکراتی ہوئی غسل خانے سے باہر آئی تو وقار حسین نے اپنا گلاس اٹھالیا پھر وہ دونوں باتیں کرنے لگے۔

کوئی پندرہ بیس منٹ کے بعد وقار حسین نے اس سے اچانک اور غیر متوقع طور پر پوچھا۔ ''کیا تمہارا کام بنگلہ دیش سے لڑکیوں کو اغوا کر کے لانا اور انہیں شکنتلا دیوی کے ہاتھ بیچ دینا ہے۔''

''یہ آپ کو کس نے بتایا؟'' نوری بیگم چونک پڑی ایک دم اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔

''اس کے باوجود تم لڑکیوں کو اغوا کر کے لائی ہو تم نے ان کے ماں باپ کو بھی قتل کر دیا تھا؟'' وہ اپنی رو میں کہتا گیا۔ اس نے نوری بیگم کی بات کا جواب نہیں دیا۔

''یہ جھوٹ ہے۔'' نوری بیگم نے کہا۔

''یہ سچ ہے نوری بیگم!'' وقار حسین کا لہجہ ہر قسم کے جذبات سے عاری تھا۔ ''شاید تم سماج' معاشرے اور قانون کی نظروں میں بہت بڑی مجرم ہو۔ قاتلہ بھی ہو۔ تم نے کئی گھر اجاڑے کئی لڑکیوں کو تباہ و برباد کیا۔ مجھے تمہاری تلاش تھی تا کہ تم سے اپنی بیٹی کا حساب چکا سکوں۔ مجھے تم سے اتنی جلدی ملاقات کی امید نہ تھی۔ کیا عجیب اتفاق ہے؟''

''تمہاری بیٹی کون تھی؟'' وہ ہذیانی لہجے میں بولی۔

''میری بیٹی کا نام سپنا تھا۔'' وہ بے حد سرد اور سفاک لہجے میں بولا۔ ''وہ تمہیں اچھی طرح سے یاد ہو گی۔ اس لئے کہ وہ بہت حسین تھی۔ تم نے اسے چاند پور سے اغوا کیا تھا۔ شکنتلا دیوی سے اس کی بھاری قیمت وصول کی تھی۔ خوش قسمتی سے وہ وہاں سے بچ نکلی۔ یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ اس کے سننے سے تمہیں کچھ حاصل نہ ہو گا۔ اس لئے کہ تم اس دنیا میں کچھ دیر کی مہمان ہو۔ تقدیر کے کھیل دیکھ۔ اس کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔ کیا عجیب و غریب اتفاق ہے کہ اس نے معصوم لڑکیوں اور ان کے بے گناہ والدین کی تباہی اور قتل کا بدلہ لینے کے لئے مجھے منتخب کیا۔ کاش! تم نے اچھے کام کئے ہوتے؟''

وہ ایک جھٹکے سے اپنی جگہ سے اٹھی اور سرعت سے میز کے پاس پہنچی۔ اپنا پرس اٹھا کر اسے کھولا۔ اس میں سے پستول نکالا اور اس کا رخ وقار حسین کی طرف کر دیا۔

''تم مجھے قتل کر سکتی ہو۔'' وقار حسین بڑے سکون و اطمینان سے بولا۔ ''مگر ایک بات یاد رکھو۔ گولی چلنے کی آواز سنتے ہی لوگ اپنے اپنے کمروں سے نکل آئیں گے اور تم میرے قتل کے الزام میں دھر لی جاؤ گی۔''

''میرے پاس آواز باہر نہ جانے کی ایک تدبیر ہے۔'' نوری بیگم نے آگے بڑھ کر فوراً ریڈیو آن کر دیا۔ موسیقی کی آواز سے کمرہ گونجنے لگا۔

''ویری گڈ۔'' وقار حسین زیر لب مسکرایا۔ ''تم نے تو بہت اچھی تدبیر سوچی ہے بس پھر جلدی سے گولی چلا دو۔ اس لئے کہ میں نے تمہاری شراب میں دس عدد خواب آور گولیاں گھول دی ہیں۔ اب اس کا اثر تم پر ہونے والا ہی ہے۔ تم تھوڑی دیر کی مہمان ہو۔''

''اوہ نہیں۔'' نوری بیگم کی آنکھیں خوف و دہشت سے پھیلنے لگیں۔ اس نے وقار حسین کے سینے کا نشانہ لے کر دو تین مرتبہ ٹریگر دبایا مگر کلک کی آواز کے سوا کچھ نہ ہوا۔

وقار حسین نے اپنی جیب سے اسے پستول کی گولیاں نکال کر دکھائیں تو اس نے مشتعل ہو کر پستول وقار حسین پر کھینچ مارا۔ وہ ایک طرف جھک گیا۔ پستول اس کے سر پر سے گزرتا ہوا ٹیلی ویژن کی اسکرین پر جا لگا۔ جب نوری بیگم بیڈ لیمپ اٹھا کر وقار حسین کی طرف گھومی تو بیڈ لیمپ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گر پڑا کیونکہ وقار حسین کے ہاتھ میں سائلنسر لگا ریوالور دیکھ کر اس کے اوسان خطا ہو گئے۔ اس کے بدن پر لرزہ طاری ہو گیا۔ پھر اس کا سر تیزی سے چکرانے لگا اور وہ تاریکیوں میں ڈوبتی چلی گئی۔

نوری بیگم خواب آور گولیوں کے باعث موت سے ہمکنار ہو گئی تو وقار حسین نے اس کے مردہ جسم کو اٹھا کر پلنگ پر ڈال دیا اور اس کی لاش کو چادر سے ڈھک دیا۔ نوری بیگم کو ہلاک کر کے اسے بے پناہ مسرت محسوس ہو رہی تھی کہ نجانے کتنی معصوم لڑکیاں نوری بیگم کے ہاتھوں تباہ و برباد ہونے سے بچ گئیں۔

تھوڑی دیر کے بعد وقار حسین نے دروازہ کھول کر راہداری میں جھانکا۔ وہ سنسان پڑی تھی۔ پھر اس نے سامنے والے کمرے کی طرف دیکھا جس میں دونوں شیطان موجود تھے۔ اس کے اندر نفرت و غصے کی لہر نس نس میں زہر کی طرح سرایت کرنے لگی۔ اس نے سوچا کہ ان خبیثوں نے کیسے فرض کر لیا کہ انہیں کوئی اس بھیس میں شناخت نہیں کر سکتا۔ وہ سات [illegible] میں بھی چھپے ہوتے تو وہ انہیں پہچان لیتا۔ اس نے بیس برس کے بعد انہیں اس [illegible]س میں پہچان لیا تھا اور ان کے مظالم نہیں بھولا تھا جو انہوں نے بے گناہ اور معصوم لوگوں پر کئے تھے۔ پچاس برس کے بعد بھی ان کی بربریت اور انسانیت سوز مظالم کو وہ بھول نہیں سکتا تھا جس نے شیطانوں کے جرائم کی فہرست مع ثبوت کے ڈائری میں درج کئے تھے وہ اس کا کزن ہی نہیں بلکہ ایک فرض شناس پولیس انسپکٹر بھی تھا۔ اس کا نام عبدالماجد تھا۔ قانون کی بالادستی کے لئے اس نے اپنی جان عزیز کی پرواہ نہیں کی تھی۔ بہت سے لوگ ایسے بھی

ہوتے ہیں کہ عظیم مقاصد کے لئے اپنی زندگی رہن رکھ دیتے ہیں اسے صرف عبدالماجد کا حساب نہیں چکانا تھا بلکہ پولیس کمشنر وصی الرحمان کا حساب بھی باقی تھا۔ پولیس کمشنر کا جرم ان شیطانوں کی نظر میں یہ تھا کہ اس نے ان کے خلاف بہت سخت اقدامات کئے تھے اور ان کے دو تین کارندوں کو سولی پر چڑھا دیا تھا۔ وقت بھی ان زخموں کو مندمل نہیں کر سکا تھا۔ وہ عبدالماجد اور پولیس کمشنر کے سفاکانہ اور اذیت ناک قتل کو فراموش نہیں کر پایا تھا۔ ان کی لاشیں جو بہیمانہ موت کا نشانہ بنی تھیں وہ تصویریں دل پر نقش تھیں وہ کبھی مٹ نہیں سکتی تھیں اس کے وجود کو بیس برس سے احساس دلاتیں اور انتقام پر اکساتی رہی تھیں۔

وقار حسین اپنے کمرے کا دروازہ بند کر کے سامنے والے کمرے کے دروازے کی طرف بڑھا۔ دروازے پر جو بورڈ لٹکا ہوا تھا اس پر صاف طور پر تحریر تھا کہ مداخلت نہ کیجئے۔ اگر وہ دروازے پر دستک دے کر روم سروس کا بہانہ بناتا ہے تو اس کا راز فاش ہو جائے گا یہ شیطان سمجھ جائیں گے انہیں کوئی شخص قتل کرنے آیا ہے اس کے ذہن میں دروازہ کھلوانے کی کوئی تدبیر نہیں آ رہی تھی پھر ایک خیال اچانک آیا تو اس کا چہرہ دمک اٹھا۔

وقار حسین نے دھڑکتے دل سے دروازے پر دستک دی۔ چند لمحوں کے بعد اندر سے دروازے کے پاس وحید بیگ غرایا۔ ''کون ہے؟''

''سر! میں'' وقار حسین اپنی آواز بدل کر انعام الحق کے لہجے کی نقل اتارتے ہوئے بڑی آہستگی سے بولا۔

''کیا بات ہے؟'' وہ برہمی سے بولا۔ ''میں نے کیا تم سے نہیں کہا تھا کہ تم یہاں نہیں آؤ گے؟''

''سر! ڈاکٹر احمد جعفر نے ایک بہت ہی اہم پیغام بھیجا ہے کہ وقار حسین اس ہوٹل کے ایک کمرے میں ٹھہرا ہوا ہے۔'' وہ سابقہ انداز اور لہجے میں بولا۔

''وقار حسین؟'' چند لمحوں کے بعد دروازہ کھلا۔ وحید بیگ کا اصل چہرہ ابھرا۔ وقار حسین کے ایک ہاتھ میں ریوالور تھا۔ اس نے اپنی پوری قوت سے شانے سے دروازے کو اندر کی طرف دھکیلا۔ وحید بیگ اس غیر متوقع حملے کے لئے تیار نہ تھا۔ وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ فرش پر کٹی پتنگ کی طرح بکھر گیا۔ اس کے اٹھ کر سنبھلنے سے پہلے وقار حسین نے دروازہ بند کر دیا اور اسے نشانے کی زد میں لے لیا۔ انصار احمد بھی اپنی اصل شکل میں تھا۔ وہ کرسی پر بیٹھا ہوا جام بھر رہا تھا۔ اس نے حیرت اور خوف سے وقار حسین کی طرف دیکھا۔ وہ اسے پہچان نہیں سکا تھا۔ اس کے سارے جسم میں ایک سرد لہر خنجر کی نوک کی طرح اتر گئی۔

وحید بیگ نے اسے تحیر زدہ اور پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''کون ہو تم؟''

''وقار حسین۔'' اس نے ریوالور کی نال کا رخ وحید بیگ کی طرف کر کے کہا۔ ''تم اپنے دوست اور ساتھی کے پاس جا بیٹھو۔''

''وقار حسین! تم؟'' انصار احمد نے تھوک نگلا۔ دوسرے لمحے سنبھل کر بولا۔ ''چلو اچھا ہوا تم سے بالمشافہ ملاقات ہو گئی۔ تم سے بہت ضروری باتیں کرنا ہیں۔ تم سے ایک سوال کرنا ہے۔ تم پھر سے ہمارے گروہ میں شامل ہونے کی کیا قیمت چاہتے ہو؟''

''کیا تم نے مجھے بے وقوف سمجھا ہوا ہے کہ میں تمہارے فریب میں آ جاؤں گا۔'' وقار حسین ہنس کر بولا۔ ''تم جتنے چالاک اور شاطر ہو میں اس سے کہیں زیادہ ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ تم نے اپنی حفاظت کے لئے انعام الحق اور ایک دوسرے بدمعاش کو نیچے بٹھا رکھا ہے۔''

''تم جانتے ہو کہ جب ہم کسی کو زبان دیتے ہیں تو اس کی کتنی سختی سے پابندی کرتے ہیں؟'' انصار احمد نے کہا۔

''تم نے جو میری موت کے احکامات صادر کئے ہوئے ہیں اس کے بارے میں کیا کہتے ہو؟'' سابقہ احکامات اب بھی برقرار ہیں نا؟''

''اسے اب تم منسوخ سمجھو۔'' وحید بیگ نے کہا۔ ''ہم تمہیں معاف کر کے پھر اپنے گروہ میں شامل کرنے کے آرزومند ہیں۔ اس لئے کہ ہم تمہاری کمی بڑی شدت سے محسوس کر رہے ہیں۔ ہمیں آج تک تم جیسا اور باصلاحیت قابل شخص نہیں ملا۔''

''پولیس انسپکٹر عبدالماجد اور پولیس کمشنر وصی الرحمان کے خون ناحق کا حساب کون دے گا؟'' وقار حسین نے تیز اور چبھتی ہوئی سوالیہ نظروں سے دونوں کی طرف باری باری دیکھا۔ اس نے کرخت لہجے میں کہا۔ ''میں بیس برس کے طویل اور صبر آزما عرصے کے بعد تم خبیثوں سے مفاہمت کرنے نہیں بلکہ ان کا حساب بے باق کرنے آیا ہوں۔ میں زندگی میں آخری بار فنا و بقاء کی جنگ لڑنے آیا ہوں فنا کا آغاز تم سے ہو گا۔''

''تمہیں ہماری موت سے کچھ حاصل نہیں ہو گا وقار حسین!'' انصار احمد نے مرتعش لہجے میں کہا۔ ''تمہاری بیوی ہمارے آدمیوں کو قتل کر کے فرار ہو گئی۔ شاید تم بھی اس واقعے میں شریک تھے۔ تمہارا کیا خیال ہے۔ تمہاری بیوی ہمارے آدمیوں کے ہاتھ سے بچ جائے گی؟ ہرگز نہیں۔ وہ اس صورت میں بچ سکتی ہے کہ تم ہم سے مفاہمت کر لو۔ ہم تمہاری زندگی کی ضمانت دینے پر بھی تیار ہیں۔''

''مجھے نہ تو اپنی بیوی کی زندگی کی فکر ہے اور نہ اپنی موت کی۔'' وقار حسین نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''میں ٹھیک بارہ بجے تم دونوں کو ختم کر دوں گا۔ میرے ریوالور کی چھ میں سے چار گولیوں پر فرشتہ اجل نے تمہارے نام لکھ دیئے ہیں۔ اب تمہاری زندگی کی مہلت بھی ختم ہو رہی ہے۔''

''کیا تم ہمیں قتل کرنے کے بعد زندہ بچ جاؤ گے؟'' وحید بیگ کی آواز حلق میں اٹک رہی تھی۔

''کیوں نہیں۔'' وقار حسین نے سر ہلایا۔ ''بالکل اس طرح جس طرح تم تمام شیطان سنگین جرائم، قتل و غارت گری، عورتوں کی عزت و ناموس سے کھیل کر ضمیر اور وطن فروشی کر کے اب تک بچے ہوئے ہو۔ میری گرفتاری اس لئے بھی ناممکن ہے کہ میں کل کا سورج نکلنے سے پہلے بنگلہ دیش چلا جاؤں گا تاکہ تمہارے شرکاؤں کو کیفر کردار تک پہنچا سکوں۔ ہندوستانی پولیس کو کتنی حیرت ہو گی جب وہ تمہاری لاشیں دیکھے گی اور تمہیں شناخت کر لے گی۔''

''تم نے ایسا کیا تو قانون کے لمبے ہاتھوں سے بچ نہیں سکو گے؟ قانون اس بات کی کسی کو بھی اجازت نہیں دیتا ہے کہ اسے ہاتھ میں لیا جائے۔'' وحید بیگ بولا۔

''تم مجھے قانون کا سبق پڑھا رہے ہو؟'' وہ طنزیہ لہجے میں کہنے لگا۔ ''تم دونوں نے جواب تک سینکڑوں بے گناہ انسانوں کے خون سے اپنے ہاتھ رنگے ہیں۔ کیا وہ قانونی عمل تھا؟ اب تم قانون کے شکنجے میں آ گئے ہو؟ ایک راز کی بات ہے جسے صرف تم لوگ جانتے ہو کہ میں دراصل ایک سیکرٹ ایجنٹ تھا اور میرا عہدہ پولیس انسپکٹر کا تھا۔ مجھے پولیس کمشنر کی کوششوں سے ایک خصوصی اختیار نامہ دیا گیا جس کی رو سے میں تم جیسے سفاک اور بے رحم قاتلوں کو قتل کر سکتا تھا جو آج بھی میرے پاس موجود ہے۔ وحید بیگ تم کو پولیس کمشنر کی بیٹی روبینہ کے ذریعے اس بات کا پتا چل گیا۔ وحید بیگ تم نے اس غریب سے محبت کی۔ محبت میں فریب دے کر اسے تباہ کیا اور اسے ایک حادثے میں قبر تک پہنچا دیا۔ پولیس کمشنر کو بھی اس خصوصی اختیار نامے کی پاداش میں اپنی زندگی سے ہاتھ دھونا پڑا۔ میں اس وقت تم سب سے اسی لئے انتقام نہیں لے سکا کہ پولیس کے محکمے میں میرا ساتھ دینے والا کوئی نہیں تھا۔ تم لوگوں نے ان کے ضمیر خرید لئے تھے۔ تمہارا گروہ بہت منظم تھا اور وسائل اور اختیارات بھی تھے۔ اب میں اس لئے واپس آیا ہوں کہ دو بدو مقابلہ کر کے تمہارے تمام ساتھیوں کو جہنم رسید کر دوں۔ یہ بات میں نے اپنی بیوی کو حفظ ماتقدم کے طور پر نہیں بتائی

ہے کہ میں خفیہ طور پر پھر سے اس عہدے پر بحال کر دیا گیا ہوں اور ہر قسم کے مجرموں کو قتل کرنے کا اختیار نامہ دے دیا گیا ہے۔ میں قانون کا سپاہی ہوں۔ یہ قانون کی جنگ ہے۔ کیا تم میری باتوں کی تصدیق چاہتے ہو؟''

وقار حسین نے اپنی جیب سے فوٹو اسٹیٹ کاغذات نکال کر وحید بیگ کے منہ پر حقارت سے دے مارے۔ ''یہ لو' قبر میں جانے سے پہلے دیکھ لو..... تمہارے دلوں میں کوئی حسرت باقی نہ رہے۔''

وحید بیگ نے ان کاغذات کو اٹھا لیا۔ اسے دونوں نے باری باری بڑی بے دلی سے دیکھا اور اسے واپس کر دیا۔ موت کے خوف سے ان کے چہرے فق تھے اور ان کی نگاہیں بار بار دستی گھڑی کی طرف اٹھ رہی تھیں۔ بارہ بجنے میں آٹھ منٹ رہ گئے تھے۔ انصار احمد نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے خوف و دہشت سے پھٹی نظروں سے دیکھتے ہوئے ملتجیانہ لہجے میں بولا۔ ''ہمارے پاس اس وقت چھ لاکھ روپے کے زیورات اور پندرہ لاکھ کی رقم ہندوستانی کرنسی کی صورت میں موجود ہے۔ یہ سب بریف کیس میں ہیں۔ اس کے علاوہ تم جو چاہو ہم تمہارے ہر مطالبے کو پورا کرنے کو تیار ہیں۔''

''اس فراخدلانہ پیشکش کا بہت بہت شکریہ۔'' وقار حسین طنزیہ لہجے میں بولا۔ ''تم دونوں کو قتل کرنے کے بعد میں یہ زیورات اور لاکھوں کی رقم ضرور لے جاؤں گا۔ کاش! میں تم دونوں کو اس درندگی سے موت کا نشانہ بنا سکتا جس طرح تم دونوں نے پولیس افسروں کے علاوہ نجانے کتنے آدمیوں کو بنایا تھا۔''

وقار حسین نے توقف کر کے اپنی جیب سے تین انچ چوڑے ٹیپ کا رول نکالا۔ اس نے اپنی جیب سے چاقو نکال کر اس کے چار چار انچ کے دو ٹکڑے کئے ایک ایک ٹکڑا ان کی طرف بڑھایا اور ان سے کہا کہ وہ ایک دوسرے کے منہ پر چپکا دیں۔

انہیں وقار حسین کے حکم کی تعمیل کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ انہوں نے اس کے حکم کی تعمیل کی۔ پھر وقار حسین نے اپنی جیب سے ایک گز لمبی رسی کا ٹکڑا نکالا اسے انصار احمد کی طرف اچھال دیا۔ ''تم وحید بیگ کے دونوں ہاتھ پیچھے مضبوطی سے باندھ دو۔ کسی قسم کی چالاکی اور ہوشیاری کی ضرورت نہیں ہے۔ تم دونوں کو میری صلاحیتوں کا اچھی طرح علم ہے۔''

جب انصار احمد' وحید بیگ کے دونوں ہاتھ باندھ چکا تو وقار حسین نے اسی سائز کا دوسرا ٹکڑا اپنی جیب سے نکالا۔ پھر کمال ہوشیاری' تیزی اور مہارت سے اس کے ہاتھ بھی

باندھ دیئے۔ وہ ریوالور کو جیب میں رکھتے ہوئے بولا۔ ''اب میں نے تم دونوں کو قتل کرنے کے طریقہ کار میں تبدیلی کر دی ہے۔ وحید بیگ! تم نے پولیس کمشنر کو حبیب پلازہ کی دسویں منزل سے نیچے دھکا دیا تھا۔ یہ صرف دوسری منزل ہے۔ تم نے روبینہ سے فائدہ اٹھانے کے بعد اس کے منہ پر ٹیپ چپکا کر اسے قتل کر دیا تھا۔ انصار احمد! تم بھی اپنے دشمن کے منہ پر ٹیپ چپکا کر اسے شعلوں کی نظر کر دیتے تھے۔ یہ کارپٹ بھی بڑی جلدی آگ پکڑ لیتی ہے۔ مگر میں اس ہوٹل کا نقصان کس لئے کروں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم دونوں ایک ساتھ ہی موت کے سفر پر روانہ ہو جاؤ۔''

جب دونوں سوئیاں ٹھیک بارہ کے ہندسے پر پہنچی تو وہ انہیں بالکنی میں لے آیا۔ یہ ہوٹل کا عقبی حصہ تھا۔ مقابل جو عمارت تھی وہ ہوٹل کی نہیں تھی۔ رہائشی بھی نہیں تھی۔ وہ اندھیرے کا لبادہ اوڑھے ہوئے تھی۔ سڑک ویران اور سنسان تھی۔ وقار حسین نے اچھی طرح سے اپنا اطمینان کرنے کے بعد انہیں ایک ساتھ دھکا دے کر گرا دیا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ ان کا بریف کیس لے کر فرنٹ سے نیچے آیا تو ان کے بدمعاش وہاں نہیں تھے۔ بہت سارے لوگ اس سڑک کی طرف لپک رہے تھے جہاں انصار اور وحید گرے تھے اور ایک تیز رفتار گاڑی کے نیچے آ گئے تھے۔ وہاں ایک بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ وہ دونوں بدمعاش شاید ادھر ہی چلے گئے تھے۔ وقار حسین کو اس بات پر شدید حیرت تھی کہ ان دونوں شیطانوں نے اس سے مقابلہ کیوں نہیں کیا۔ شاید شراب اور موت کے خوف نے انہیں بزدل بنا دیا تھا۔ وہ تو صرف حکم چلانا اور ظلم و ستم، تشدد اور بربریت کرنا جانتے تھے۔ ان میں مقابلہ کرنے کی صلاحیت نہیں تھی۔

☆......☆......☆

''کیا کہا؟'' ڈاکٹر احمد جعفر بھونچکا رہ گیا۔ ''وحید بیگ اور انصار کو وقار حسین نے قتل کر دیا؟ واٹ نان سنس!''

''میں سچ کہہ رہا ہوں سر!'' انعام الحق نے کہا۔ ''اس نے کلکتہ سے ٹیلیفون کیا تھا۔ کل صبح کے اخبارات دیکھ لیجئے یا پھر آپ کسی بھی نیوز ایجنسی سے معلوم کر لیجئے۔'' پھر اس نے مختصر طور پر بتایا کہ ان کی لاشیں کس حالت میں سڑک پر پڑی ہوئی پائی گئی تھیں۔

''یہ تم سے کس نے کہا کہ انہیں وقار حسین نے قتل کیا ہے؟''

''یہ میرا اندازہ ہے سر!'' وہ کہنے لگا۔ ''دو دن پہلے ہم نے وقار حسین اور اس کی بیوی رقیہ خانم کو کلکتہ میں دیکھا تھا۔ وہ چکمہ دے کر نکل گئے تھے۔ آج رقیہ خانم نظر آئی تو

طاہر نے بلاقی اور آنند پال کو ہمراہ لیا اور اس کے تعاقب میں ہوٹل جا پہنچا مگر وہ تینوں وقار حسین اور رقیہ خانم کے ہاتھوں قتل ہو گئے۔ وقار حسین وہاں کیسے اور کس طرح سے پہنچا کچھ اندازہ نہ ہو سکا۔ ان تینوں کو جس طرح قتل کیا گیا ایک عورت اس طرح قتل نہیں کر سکتی ہے۔ یقیناً وقار حسین بھی ہمراہ تھا۔ وہ چھت کے راستے قریبی عمارت پر کود کر نکل گئے۔''

''کیا تم مجھے خوشخبری سنا رہے ہو؟'' ڈاکٹر جعفر غصے اور صدمے سے پاگل ہو رہا تھا۔ ''تمہارے ہوتے ہوئے ان دونوں کا قتل ہو گیا۔ مجھے ہر قیمت پر وقار حسین اور اس کی بیوی زندہ سلامت چاہیے۔ میں ان سے بھیانک اور ایسا لرزہ خیز انتقام لوں گا کہ دنیا میں اس کی مثال نہیں ملے گی۔ میں ان کا آپریشن کروں گا' دل و دماغ کا...... تم سب کے سامنے' تم نے کبھی ایسا آپریشن نہیں دیکھا ہو گا۔ انہیں بغیر بے ہوش کئے۔ میری بات سن رہے ہو......'' اسے ایسا لگ رہا تھا کہ اس کی کھوپڑی کسی بھی لمحے پھٹ جائے گی۔

انصار احمد اور وحید بیگ کی دردناک موت کا واقعہ بنگلہ دیش میں پیش آتا تو ملک کی رسوائی کا سبب نہ بنتا۔ مگر ان کا بہیمانہ قتل دونوں ملکوں کی سیاست کے لئے خطرناک تھا۔ مغربی بنگال کی حکومت سرکاری سطح پر یہ پوچھنے کا حق محفوظ رکھتی تھی کہ بنگلہ دیش کا چیف سیکرٹری اور انٹیلی جنس کا ڈائریکٹر غیر قانونی طور پر سرحد عبور کر کے کس لئے آئے تھے۔ انہوں نے اپنے نام اور بھیس بدلے ہوئے تھے۔ ان دونوں ملکوں کے درمیان فرخا بیراج اور سرحدی تنازعات کے سلسلے میں بڑی تلخی پائی جاتی تھی۔ بنگلہ دیش کی حکومت کے لئے یہ سخت آزمائش کی گھڑی تھی۔ مگر اسے اس کی کوئی فکر نہیں تھی۔ وہ تو اس طوفان سے دہشت زدہ ہو رہا تھا جو اس کی زندگی میں آیا تھا اور اس کے وجود کو تہس نہس کر کے رکھ دیا تھا۔

وہ کمرے میں اضطراب سے ٹہلتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ وقار حسین سے کیسے نمٹا جائے۔ اسے ذرہ برابر بھی امید نہیں تھی کہ انعام الحق اس کو اور اس کی بیوی کو زندہ یا مردہ حالت میں لے کر پہنچے گا۔ وقار حسین اس کی توقع سے کہیں چالاک اور شاطر ثابت ہوا تھا۔ وقار حسین کا پہلا ہی وار ایسا بھرپور' خطرناک اور اس قدر کاری تھا کہ اسے دہلا کر رکھ دیا تھا۔ اس کا چین وسکون غارت ہو گیا تھا۔ جو اندیشہ اسے کھائے جا رہا تھا وہ یہ تھا کہ کل اس کی اور اس کے دوسرے ساتھیوں کی باری آئے گی۔ اس کی تنظیم کے دو آدمیوں کو قتل کر کے وقار حسین نے نہ صرف طبل جنگ بجا دیا تھا بلکہ ایک کھلا چیلنج دیا تھا کہ بچ سکتے ہو تو بچ کر دکھاؤ۔

صبح چھ بجے ڈاکٹر احمد جعفر کو اس کے ملازم نے گہری نیند سے جگا دیا۔ ''سر! آپ کے خیراتی ہسپتال کی ایمبولینس کو معلوم نہیں کون کوٹھی کے احاطے میں کھڑا کر گیا ہے۔ اس

ہی انعام الحق کی لاش خون میں لت پت پڑی ہے۔"

"کیا؟" ڈاکٹر احمد جعفر دہل گیا۔ اسے اب ایسا لگا جیسے اس کے ملازم نے اسے بجلی کا شاک لگایا ہو۔ اسے یقین نہیں آیا۔ اس نے ایک لحظہ کے لئے سوچا۔ کہیں یہ اس کی سماعت کا فتور تو نہیں ہے۔ انعام الحق کو قتل کرنا بچوں کا کھیل نہیں تھا۔ اس کی تو طبعی موت بھی مشکل تھی۔ اب اس کی دس بارہ برس کی زندگی تھی۔ اس کی کسی کی زندگی کے بارے میں بھی رائے کبھی غلط ثابت نہیں ہوئی تھی۔ اس کے جسم و ہاتھ پیر بھی نہیں بلکہ دماغ تک سنسنا گیا۔ یہ سنسناہٹ اسے اپنی انگلیوں کے پوروں تک میں محسوس ہو رہی تھی۔ وہ دھاڑا......"تم لوگوں کو خبر ہی نہیں ہو سکی کوئی میرے گھر میں ایمبولینس اور لاش چھوڑ گیا۔ چوکیدار کہاں مر گیا تھا؟ تم کہاں مر گئے تھے؟"

"سر!" ملازم سہم کر بولا تو اس کی آواز گلے میں اٹک رہی تھی۔ "چوکیدار فجر کی نماز پڑھنے کے لئے اپنی کوٹھڑی میں گیا ہوا تھا۔ وہ پندرہ بیس منٹ کے بعد واپس آیا تو ایمبولینس احاطے میں کھڑی تھی۔ گیٹ بھی بند تھا۔ میں بھی اسی وقت لوٹا تھا۔ آپ کی دوست ارجمند بانو کو ان کے گھر چھوڑنے چار بجے نکل گیا تھا۔ انہوں نے اپنی بہن کو لانے گورنر ہاؤس بھیج دیا تھا۔ اسی لئے واپسی میں دیر ہو گئی۔

"شٹ اپ۔" وہ غضب ناک ہو گیا۔ "اس سے کس نے کہا تھا کہ وہ نماز پڑھے۔ کیا میں نے اسے نماز پڑھنے کے لئے رکھا ہے۔"

"سر! انعام الحق کی جیب سے یہ خط نکلا ہے۔" ملازم نے تہہ کیا ہوا کاغذ اس کی طرف بڑھا دیا۔

ڈاکٹر احمد جعفر نے اس کے ہاتھ سے خط لے لیا۔ اسے کھول کر پڑھا۔ ڈیئر ڈاکٹر احمد جعفر! تمہاری خدمت میں ایک بے حد قیمتی تحفہ ارسال ہے جو ایک سفاک قاتل تھا مگر عدم ثبوت کی بناء پر اور تمہاری پشت پناہی کی وجہ سے قانون سے بچا رہا تھا۔ اس کی رسید سے اخبارات کے ذریعے مطلع کر دینا۔

خط لکھنے والے نے اپنا نام نہیں لکھا تھا۔ اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ وہ اس تحریر کو خوب پہچانتا تھا۔ اس نے خط پڑھنے کے بعد مشتعل ہو کر خط کے پرزے پرزے کر کے اپنے ملازم کے منہ پر دے مارے۔ "آئندہ ایسی کوئی غفلت اور بے پروائی ہوئی تو تمہیں زندہ جلا دوں گا۔ دفع ہو جاؤ۔ نرنجن داس کو ٹیلیفون کرو کہ وہ آ کر ایمبولینس اور لاش لے جائے۔ اس بات کی کسی کو خبر نہ ہو۔ وہ اس کی لاش ڈاکٹر کریم کے ہاں پہنچا دے۔"

ڈاکٹر احمد جعفر نے اپنی خوابگاہ میں داخل ہو کر دروازہ بند کر لیا۔ شراب کی بوتل اور دو خالی گلاس تپائی پر رکھے تھے۔ ذہنی سکون کے لئے اس نے ہمیشہ شراب کا سہارا لیا تھا۔ اسے افسوس ہو رہا تھا کہ اس نے ارجمند بانو کو اتنی جلدی جانے کیوں دیا۔ اس نے ایک گلاس میں شراب انڈیلی۔ اس نے ایک بڑا پیگ بنا کر دو تین گھونٹ حلق سے اتارے تو ذہنی تناؤ میں کمی محسوس ہونے لگی۔ اس نے سوچا۔ اسے ضبط و تحمل سے کام لینا ہو گا۔

ٹیلیفون کی گھنٹی نے اسے چونک دیا۔ اس نے ریسیور اٹھایا تو دوسری طرف سے ڈاکٹر کریم بول رہا تھا۔ ''آج کی صبح کس قدر منحوس ہے۔ انعام الحق کی لاش میرے پاس پہنچ گئی۔ میں تھوڑی دیر بعد اس پر تجربہ شروع کر دوں گا۔ اسے کس نے قتل کیا۔''

''وقار حسین نے۔'' ڈاکٹر احمد جعفر نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''میرا خیال تھا کہ وہ ڈائری ملنے کے بعد قانونی راستہ اختیار کرے گا۔'' وہ ہمارے سربستہ رازوں اور ناموں سے واقف ہونے کے بعد کھل کر سامنے آئے گا پھر ہم اس کا کریا کرم کر دیں گے۔ مگر وہ خود جج بن بیٹھا ہے۔ وہ یہ جانتا ہے کہ قانون کے پاس جانے سے کچھ حاصل نہ ہو گا۔ اس لئے وہ ہمارے بازوؤں کو کاٹنے اور ستونوں کو گرانے لگا ہے۔ اصل چہرے اس کے علم میں آ گئے ہیں۔''

''اب وقار حسین کا ایک دن کیا ایک لمحہ زندہ رہنا بھی بے حد خطرناک ہو گا۔ نہ صرف اپنے بلکہ پولیس کے لوگوں کو اس کی تلاش میں لگا دینا چاہیے۔'' ڈاکٹر کریم نے مشورہ دیا۔ ''شہر میں جتنے چھوٹے بڑے پیشہ ور بدمعاش ہیں انہیں ایک لاکھ ٹاکا کے انعام کا لالچ دے کر اس کی تلاش کے کام پر لگا دینا چاہیے۔''

''اب آخری صورت یہی رہ جاتی ہے۔'' ڈاکٹر احمد جعفر نے کہا۔ ''وہ کاٹھ کا الو نہیں ہے۔ تم ہوشیار رہنا' وہ کسی بھی دن تمہارے گھر کی دہلیز پر آ سکتا ہے۔ اس لئے کہ اسے تمہاری لیبارٹری کے بارے میں معلوم ہو چکا ہو گا۔''

☆......☆......☆

جمال نے سپنا کو کوئی دو تین بار قریب سے ڈاکٹر جعفر کو دکھایا تھا۔ وہ اس شیطان کو دیکھ کر ششدر رہ گئی تھی۔ اسے جیسے یقین نہیں آیا۔ یہ درندہ صفت دیکھنے میں کسی فرشتے کی طرح لگتا تھا۔ وہ صرف خوش پوشاک' اسمارٹ' دراز قد ہی نہیں بلکہ بے حد ہنس مکھ' ملنسار اور با اخلاق تھا۔ اسے ایک منصوبے کے تحت اس شیطان کو کیفر کردار تک پہنچانا تھا۔

سپنا نے ہوٹل کے اندر قدم رکھا تو اس وقت صبح کے نو بج رہے تھے وہ ایک پچاس

برس کی بوڑھی مگر صحت مند عورت کے بہروپ میں تھی جس کے تمام بال سفید تھے۔ اس کی بھنویں بھی سفید تھیں۔ چہرے پر چیچک کے داغ تھے اور آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑے ہوئے تھے جیسے وہ نشے کی عادی ہو۔ اس نے جو چشمہ پہنا ہوا تھا اس کے شیشے بھورے رنگ کے تھے جس سے آنکھیں صاف دکھائی نہیں دیتی تھیں۔

''مجھے سولہویں منزل پر ایسا کمرہ چاہیے جس کی کھڑکی جنوب کی سمت کھلتی ہو۔'' وہ بڑی بے پروائی کے انداز سے بولی۔

''سولہویں منزل؟'' بکنگ گرل نے چونک کر اس کی طرف دیکھا مگر اس نے اپنی حیرت اور شک کا اظہار ہونے نہیں دیا۔ وہ پیشہ ورانہ انداز سے مسکراتی ہوئی بولی۔ ''سولہویں منزل پر شاید ہی کوئی کمرہ خالی ہو۔ آپ بارہویں' گیارہویں یا......!''

''نہیں۔'' وہ تیزی سے بولی۔ ''مجھے صرف اور صرف سولہویں منزل پر کمرہ چاہیے۔ میں یہاں جب بھی آتی ہوں سولہویں منزل پر ٹھہرتی ہوں۔''

''سفید جھوٹ میڈم! میں تمہیں پہلی بار دیکھ رہی ہوں۔ میں کوئی دو اڑھائی برس سے یہاں ملازمت کر رہی ہوں۔'' بکنگ گرل نے دل میں کہا اور دلکش انداز سے مسکرائی۔ ''ہر منزل کے کمرے ایک جیسے ہیں۔ آپ کو پندرہویں منزل پر ایسا کوئی کمرہ مل جائے گا جس کی کھڑکی جنوب کی طرف کھلتی ہے۔''

''مجھے آج صبح سات بجے ٹیلیفون پر بتایا گیا تھا کہ سولہویں منزل پر کئی کمرے خالی ہیں۔ اپنی مرضی سے جو کمرہ چاہیں لے سکتی ہیں۔'' سپنا نے کہا۔

ایک اور سفید جھوٹ وہ دل میں ہنس پڑی۔ ''اچھا میں ابھی چیک کئے لیتی ہوں۔'' اس نے کمپیوٹر کا ایک بٹن آن کیا اور اسکرین پر اپنی نگاہیں مرکوز کر دیں پھر اس نے ایک بٹن اور دبایا۔ اسکرین پر جو تفصیلات آئی تھیں وہ گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب ہو گئیں۔ اس نے اپنی دراز سے ایک کارڈ نکالتے ہوئے کہا۔ ''اتفاق سے آپ کے مطلب کا ایک کمرہ خالی ہے۔ اس کا نمبر **1610** ہے۔ اس کمرے کی کھڑکی جنوب کی طرف کھلتی ہے اور آپ اس کھڑکی سے پورے شہر کا نظارہ کر سکتی ہیں۔ پلیز اپنا نام بتائیں۔ آپ کہاں سے تشریف لا رہی ہیں۔ آپ کا پتا کیا ہے؟''

☆......☆......☆

''بیگم جمیلہ جبار خوندکر'' سپنا نے بتایا۔ ''سلہٹ سے ہوائی جہاز سے آ رہی ہوں میرا ایڈریس جبار ٹی گارڈن' ٹی اسٹیٹ سلہٹ ہے۔''

خانہ پری کے بعد سپنا نے اپنے پرس سے پانچ ہزار ٹا کا نکال کر کاؤنٹر پر رکھ دیئے۔ اس نے بڑی تیزی سے رسید کاٹ کر سپنا کو دے دی۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر سپنا نے اپنے پرس سے سو ٹا کا کا ایک نوٹ نکال کر اس پورٹر کو دکھایا جو کمرے تک رہنمائی کرنے اور اس کا بریف کیس پہنچانے آیا تھا۔ ''اگر تم میرے ایک سوال کا صحیح جواب دو گے تو یہ تمہارا انعام ہے۔'' سپنا نے اپنا پرس میز پر رکھ کر نوٹ اس کی نظروں کے سامنے لہرایا۔

نوٹ دیکھ کر اس کا چہرہ دمک اٹھا۔ وہ سرشار لہجے میں بولا۔ ''آپ کیا معلوم کرنا چاہتی ہیں؟''

''سولہویں منزل پر مسافروں کے لئے کمرہ بک کیوں نہیں کیا جاتا؟ کیا چیز مانع ہے؟'' سپنا نے اس کے چہرے پر اپنی نگاہیں مرکوز کر دیں۔

پورٹر کی پیشانی عرق آلود ہو گئی۔ اس نے پلٹ کر دروازہ بند کر دیا وہ سپنا کے قریب پہنچ کر سرگوشی میں بولا۔ ''میڈم سویٹ نمبر سولہ سو بیس میں جو بڑا آدمی برسوں سے رہ رہا ہے یہ اس کا حکم ہے لیکن رش زیادہ ہونے پر کمرہ دے دیا جاتا ہے۔''

''سولہ سو بیس نمبر سویٹ میں جو شخص برسوں سے رہ رہا ہے اس کے بارے میں تم کچھ جانتے ہو اور بتلا سکتے ہو کہ اس کا نام کیا ہے؟''

''نہیں۔'' اس نے اپنا سر نفی میں ہلایا۔ ''میں یہاں ایک برس سے ملازمت کر رہا ہوں مجھے اس کے بارے میں کچھ نہیں معلوم حتیٰ کہ اس کا نام تک نہیں جانتا۔ صرف اتنا جانتا ہوں کہ وہ بدھ اور اتوار کی رات کو آ کر قیام کرتا ہے وہ آج آئے گا اس لئے کہ آج بدھ کا دن ہے۔ میں کیا ہوٹل کے بہت سارے ملازمین اس کے نام اور اس کی شخصیت سے واقف نہیں ہیں یہ بہت پراسرار سا شخص ہے عام خیال یہ ہے کہ یہ شخص حکومت کا کوئی اہم آدمی

ہے سنا ہے انٹیلی جنس کا آدمی ہے۔''

وہ سوٹاکا کے نوٹ لے کر کمرے سے نکل گیا۔ سپنا نے اندر سے کنڈی لگا لی اس نے کمرے پر ایک تنقیدی اور سرسری نگاہ ڈالی۔ پھر اس نے کھڑکی کے پاس جا کر پردہ ہٹا کر باہر جھانکا تو ڈھاکہ شہر کا دلکش نظارہ اس کی آنکھوں میں جذب ہونے لگا۔ تھوڑی دیر تک وہ کھڑی رہی اور سڑکوں پر بہتے ہوئے ٹریفک کے سیلاب کو دیکھتی رہی۔ پھر وہ بستر پر آ کر دراز ہو گئی اور اپنے منصوبے کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لینے لگی۔

☆......☆......☆

بکنگ گرل نے اپنا ہاتھ بڑھا کر سامنے رکھے ہوئے ڈائریکٹ ڈائلنگ والے ٹیلیفون کا ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کرنے سے پہلے کاؤنٹر پر موجود ساتھی لڑکیوں کی طرف دیکھا وہ دس بارہ مسافروں سے باتیں کرنے اور ان کے لئے کمرے بک کرنے میں مصروف تھیں اس نے جلدی سے ایک نمبر ڈائل کیا۔ دوسری طرف سے کسی نے ٹیلیفون ریسیو کرتے ہوئے سپاٹ لہجے میں ہیلو کہا تو اسے یہ آواز بڑی اجنبی سی محسوس ہوئی۔ وہ بڑے پراسرار لہجے میں سرگوشی میں آہستگی سے بولی۔ ''سر! میں سعیدہ خان بول رہی ہوں تھوڑی دیر پہلے ایک پچاس برس کی امیر کبیر عورت نے جو سلہٹ سے آئی ہے خاص طور پر سولہویں منزل پر ایک کمرہ لیا ہے۔''

''اس میں اس قدر پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔'' دوسری طرف سے بھنا کے تیز آواز میں کہا گیا۔ ''وہ عورت ہے اور ڈھاکہ شہر کے نظارے کے لئے اس نے کمرہ لیا ہوگا تم ذرا ذرا سی بات کے لئے مجھے ٹیلیفون مت کیا کرو۔ کیا تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ میں کس قدر مصروف ہوں۔''

''سر! شک و شبے کی بات تھی اس لئے میں نے آپ کو زحمت دی۔'' وہ کہنے لگی۔ ''اس نے مجھ سے کہا کہ وہ ابھی سلہٹ سے بذریعہ ہوائی جہاز ڈھاکہ پہنچی ہے میں نے ایئرپورٹ ٹیلیفون کر کے معلوم کیا۔ سلہٹ میں تیز ہواؤں اور موسلا دھار بارش کی وجہ سے تمام فلائٹس کینسل کر دی گئی ہیں کوئی فلائٹ نہیں آئی۔ اس کے علاوہ اس نے اپنا پتا جو لکھوایا ہے وہ غلط ہے۔ اس نام کا کوئی ٹی گارڈن' ٹی اسٹیٹ میں نہیں ہے وہ صرف سولہویں منزل پر ایسا کمرہ لینے پر بضد تھی جس کی کھڑکی جنوب کی طرف کھلتی ہو۔ ان باتوں نے مجھے تشویش میں مبتلا کر دیا میں نے آپ کو بتانا اپنا فرض سمجھا۔''

''اچھا۔'' لمحاتی توقف کے بعد وہ بولا۔ تو اس کا لہجہ ہر قسم کے جذبات سے عاری

تھا۔ ''اسے تم نے کون سا کمرہ دیا ہے' اس کا نام کیا ہے؟''

''کمرہ نمبر سولہ سو دس۔'' اس نے جواب دیا۔ ''اس عورت کا نام بیگم جمیلہ جبار خوندکر ہے۔''

''تم نے بہت اچھا کیا جو مجھے اطلاع دے دی۔'' وہ بولا۔ ''ویسے خطرے کی کوئی بات نہیں ہے' تمھیں کیا تحفہ چاہیے؟''

''سر! آپ کی نظرِ عنایت ہی میرے لئے سب سے قیمتی تحفہ ہے۔'' وہ شگفتگی سے بولی۔

☆......☆......☆

سپنا نے رات ٹھیک دس بجے اپنے کمرے کے دروازے کے پاس دو زانو ہو کر چابی کے سوراخ سے راہداری میں جھانکا۔ وہ ڈاکٹر احمد جعفری وقت کی پابندی پر حیران رہ گئی۔ وہ اپنی اصلی حالت میں نہیں تھا ایک ایسے بوڑھے سے شخص کے بہروپ میں تھا جس کے سر کے تمام بال سفید تھے اور مصنوعی فرنچ کٹ داڑھی بھی سفید تھی۔ سپنا نے اسے اس کی چال اور اس کے سفید رنگ کے سفاری سوٹ سے پہچان لیا تھا انسپکٹر رشید چودھری نے اسے بتایا تھا کہ وہ سفید رنگ کے سفاری سوٹ کے علاوہ دوسرے رنگ کا کوئی لباس نہیں پہنتا۔ وہ جوانوں کی طرح سیدھا چلتا ہوا اپنے کمرے کے دروازے پر پہنچا اس نے اپنے سویٹ کی چابی نکالی جس پر پہلے ہی سے مداخلت نہ کیجئے کا بورڈ آویزاں تھا۔ وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا پھر اس نے اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ سپنا نے اندر سے کنڈی لگانے کی آواز سنی۔

سپنا نے چند لمحوں تک اپنی نگاہ اس کے سویٹ کے دروازے سے نہیں ہٹائی۔ اس خیال سے کہ کہیں کوئی اور آنے والا نہ ہو جب اس نے دیکھا کہ کسی کی آمد کے آثار نہیں ہیں تو وہ وہاں سے ہٹ کر اپنے بستر پر آ کر بیٹھ گئی پھر اس نے ساڑھی کو پنڈلی تک اٹھا کر چاقو کا جائزہ لیا جو اس نے چرمی بیلٹ میں اڑس رکھا تھا۔ وہ ہولسٹر کی طرح تھا اس نے کوئی تین چار مرتبہ چاقو پھرتی اور بجلی کی سی تیزی سے نکالنے کی مشق کی۔ وہ چار پانچ راتوں سے اس کی مشق کرتی چلی آ رہی تھی پھر اس نے پرس سے اپنا ریوالور نکال کر چیک کیا اور دیکھا کہ سائلنسر ٹھیک سے نصب کیا ہے کہ نہیں۔ پھر اسے پرس میں رکھ لیا۔ اس نے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے بہروپ کا جائزہ لیا کہ کہیں کوئی کسر اور خامی تو نہیں رہ گئی ہے پھر اپنا پرس میز سے اٹھا کر دروازے کی طرف بڑھی باہر نکل کر کمرے کو دانستہ مقفل نہیں کیا تا کہ

واپسی میں اسے کوئی دشواری نہ ہو اور یہ کمرہ اس نے اپنے ابوٗ جمال اور انسپکٹر رشید چودھری کے لئے کھلا چھوڑا تھا راہداری سنسان اور ویران پڑی تھی۔ وہ اپنے دشمن کے سویٹ کی طرف بڑھی۔

☆......☆......☆

ڈاکٹر احمد جعفر نے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر سر سے بالوں کی وگ اور مصنوعی داڑھی اور مونچھیں چہرے سے الگ کیں، رانہیں سنگھار میز پر رکھ دیا۔ غسل خانے میں جا کر کپڑے بدلے وہ باہر آیا تو سلیپنگ سوٹ میں تھا۔ بستر کے پاس پہنچ کر تکیے کے نیچے سے ریوالور نکال کر اسے اچھی طرح سے چیک کیا جیسے دشمن سے مقابلہ کرنے والا ہو۔ پھر اسے واپس رکھ دیا۔ بستر پر دراز ہو کر وہ اس نئی ابھرتی ہوئی ماڈل گرل نینا کے بارے میں سوچنے لگا۔ آج رات ایک بجے شوٹنگ سے فراغت پاتے ہی سیدھے اس کے پاس ایک خاص آدمی کے ہمراہ آنے والی تھی۔ وہ ایک قیامت تھی اس لڑکی کے پہلے ہی کمرشل نے دھوم مچا دی تھی وہ اپنی موہنی صورت اور سنسنی خیز سراپا سے لوگوں کے دلوں پر بجلیاں گرا رہی تھی اس کی عمر سولہ سترہ برس کی تھی۔ اس لڑکی نے اس کے دل پر قیامت ڈھا دی تھی۔ وہ اپنی آنکھیں بند کر کے اس کے تصور میں کھو گیا اور بہت دور چلا گیا۔ وہ سپنوں کی رنگین وادیوں میں کھویا ہوا تھا کہ دفعتاً دروازے پر دستک ہوئی۔ وہ فوراً ہی سپنوں کی دنیا سے چونک کر نکل آیا۔ یہ کس کی موت آئی ہے اس نے حیرت، ناگواری اور غصے سے دروازے کی طرف دیکھا۔ اس نے ہوٹل کی انتظامیہ کو بڑی سختی سے منع کیا ہوا تھا کہ کوئی ملازم رات دس بجے کے بعد اس کے سویٹ کے دروازے کے پاس نہ پھٹکے۔ آنے والا کوئی انتہائی بدتمیز، جاہل، اجڈ شخص تھا اس نے دو تین بار مسلسل دروازے پر دستک دی تھی اس نے دروازے کے پاس پہنچ کر کرخت لہجے میں پوچھا۔ ''کون ہے؟''

''ڈاکٹر پلیز!'' باہر سے ایک عورت کی کراہتی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''میری طبیعت اچانک بگڑ گئی ہے مجھے جلدی سے دیکھ لیں۔''

''ڈاکٹر؟'' ڈاکٹر احمد جعفر بڑے زور سے چونکا۔ یہ کون عورت ہے؟ اس کے علم میں یہ بات کیسے آئی کہ اس کمرے میں ایک ڈاکٹر رہائش پذیر ہے۔ یہ ایک راز تھا۔ اس راز سے ہوٹل کی انتظامیہ کے ایک دو افراد واقف تھے اس کی چھٹی حس فوراً بیدار ہو گئی۔ اس نے سوچا کہ کہیں یہ وقار حسین کا مہرہ تو نہیں ہے؟ آج تک کسی مریض یا ہوٹل کی انتظامیہ نے اس کا دروازہ نہیں کھٹکھٹایا تھا اس روز بھی نہیں جس روز رات کے وقت امریکی سفیر کی طبیعت

اچانک خراب ہوگئی تھی۔ دشمن عقل سے پیدل تھا۔ اس نے چابی کے سوراخ سے جھانک کر دیکھا صرف ایک عورت ہی باہر کھڑی تھی۔

ڈاکٹر احمد جعفر نے ضبط سے کام لیا۔ ''آپ کون ہیں؟ آپ کا نام کیا ہے؟''

''میرا نام بیگم جمیلہ خوندکر ہے اور میں سلہٹ سے آئی ہوں۔'' سپنا بدستور کراہتی ہوئی بولی۔ ''پلیز ڈاکٹر! مجھے دیکھ لیں مجھے کل صبح کی فلائٹ سے لندن پرواز کرنا ہے۔''

اسے یک لخت یاد آیا کہ سعیدہ خان نے صبح اسے ٹیلیفون کر کے اس عورت کے بارے میں بتایا تھا اور سعیدہ خان کا خدشہ بے بنیاد نہیں تھا مگر اس نے سعیدہ خان کی بات کو کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔

''آپ کس نمبر کے کمرے میں ٹھہری ہوئی ہیں؟'' اس نے بڑی نرمی اور شائستگی سے پوچھا۔ ''آپ کو کیا تکلیف ہے؟''

''میں کمرہ نمبر سولہ سو دس میں ٹھہری ہوئی ہوں۔'' سپنا کو سخت غصہ آ رہا تھا کہ اس نے اندر ہی سے سوال و جواب کا سلسلہ شروع کر دیا ہے جیسے اسے اس پر شبہ ہو گیا ہو۔ ''میرے پیٹ میں درد ہے۔''

ڈاکٹر احمد جعفر نے ایک لمحے کے لئے دل میں سوچا۔ شکار خود چل کر آیا ہے تو اسے واپس نہیں جانا چاہیے۔ اس نے نرم لہجے میں کہا۔ ''آپ دو منٹ صبر کریں۔ میں کپڑے بدل لوں۔ پھر دروازہ کھولتا ہوں۔''

سپنا نے اطمینان کا سانس لیا۔ اس نے چابی کے سوراخ میں سے اندر جھانکا۔ ڈاکٹر احمد جعفر نے بستر کے پاس تکیے کے نیچے سے اپنا ریوالور نکال کر جیب میں رکھ لیا پھر ٹیلیفون کے پاس جا کر ریسیور اٹھایا۔ اس نے کوئی نمبر ڈائل کیا جیسے اسے خاص طور پر ڈائریکٹ ڈائلنگ ٹیلیفون کی سہولت دی گئی تھی۔ اس نے بمشکل ایک پل ٹیلیفون پر بات کی ہو گی۔ وہ ریسیور کریڈل پر رکھ کر دروازے کی طرف بڑھا۔ اس نے ٹیلیفون پر کیا کہا وہ ایک لفظ نہیں سن پائی۔

دوسرے ہی لمحے دروازہ کھلا۔ ڈاکٹر احمد جعفر اپنے اصلی روپ میں اپنے چہرے پر نرمی، شائستگی اور شرافت کی نقاب اوڑھے کھڑا تھا۔ اس نے سپنا پر ایک نگاہ ڈالی اور دلکش انداز سے مسکرایا۔ ایک طرف ہٹ کر اسے اندر آنے کا راستہ دیتے ہوئے بڑے مہذب انداز سے بولا۔ ''پلیز! میڈم!''

سپنا اس کے قریب سے ایک ہاتھ سے اپنا پیٹ پکڑے اور دوسرے ہاتھ سے

پرس تھامے گزری۔ اس نے دروازہ بند کر کے کنڈی لگا دی۔ اس نے پلٹ کر تنقیدی نظروں سے سپنا کو دیکھا تو پھر اس کی نظروں سے کچھ بھی پوشیدہ نہیں رہا۔ اس دشمن عورت نے اپنے ناقص بہروپ سے اسے دھوکہ دینے کی کوشش کی تھی اس کے چہرے پر ایک شکن تک نہیں تھی۔ ہاتھ بڑے نرم و نازک' سڈول اور بہت خوبصورت تھے۔ پچاس برس کی عورت کے ہاتھ ایسے نہیں ہو سکتے تھے۔ بالوں کی سفیدی جیسے چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی کہ یہ مصنوعی بال ہیں۔ اسے حیرت تھی کہ دشمن نے اس کے خلاف موت کا منصوبہ بناتے ہوئے اس ناقص بہروپ کی طرف توجہ کیوں نہیں دی۔

سپنا اس کی طرف پشت کئے کھڑی تھی۔ اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر ریوالور نکالا اور سپنا کو نشانے کی زد میں لیتے ہوئے طنزیہ لہجے میں بولا۔ ''ہاں تو بیگم جمیلہ جبار! آپ کو کیا شکایت ہے! پلیز! آپ تشریف رکھئے ناں!''

سپنا نے سنگھار میز کے آئینے میں اسے ریوالور نکالتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ چشم زدن میں جو کچھ ہوا وہ ڈاکٹر احمد جعفر کے لئے بے حد حیران کن تھا۔ سپنا اس کی طرف بڑی آہستگی سے گھومی تھی لیکن اس نے گھومتے ہی بلا تامل ڈاکٹر احمد جعفر کے ریوالور والے ہاتھ کا نشانہ لے کر گولی چلا دی تھی۔ بڑا ٹھیک نشانہ تھا اس کے ہاتھ سے ریوالور چھوٹ کر فرش پر گر پڑا تھا۔ گولی اس کے ہاتھ کو چھوتی ہوئی دیوار میں گھس گئی تھی۔ وہ بھونچکا رہ گیا۔ دشمن اس سے کہیں تیز اور چالاک تھا۔ امریکی فلموں میں دکھائے جانے والے سیکرٹ ایجنٹ کی طرح۔

''ڈاکٹر احمد جعفر شیطان نمبر ایک۔'' سپنا نے بڑے پرسکون لہجے میں حقارت سے کہا۔ ''میں تم سے حساب بے باق کرنے آئی ہوں۔''

اس نے بائیں ہاتھ سے اپنا زخمی ہاتھ پکڑ لیا۔ اس میں سے خون بہنے لگا تھا۔ اس کے چہرے پر شدید تکلیف کے آثار پیدا ہوئے۔ وہ درد سے کراہتے ہوئے بولا۔ ''کیسا حساب؟ کون ہو تم؟ کیا چاہتی ہو؟'' اس نے اپنی جیب سے رومال نکال کر ہاتھ پر لپیٹ لیا۔

''حساب کتاب کرنے بیٹھوں تو مہینوں لگ جائیں گے۔'' وہ کہنے لگی۔ ''تم دس شیطانوں نے نہ صرف اس ملک کو توڑا۔ ایک بازو الگ کر دیا ہزاروں بے گناہوں کے خون سے ہولی کھیلی کہ وہ کوئی اور زبان بولتے تھے۔ تمہیں یہ احساس بھی نہیں ہوا کہ یہ ہم مذہب ہیں پھر تم نے اپنے دیش کے لوگوں کو ظلم و ستم اور بربریت کا نشانہ بنایا۔ محض دولت اور عیاشی کے لئے انسانیت سوز مظالم کئے۔ میں کون ہوں' جاننا چاہتے ہو تو سنو' میں نہ صرف رقیہ خانم اور وقار حسین کی بیٹی سپنا ہوں بلکہ تمہاری موت بھی ہوں۔ کسی کے علم میں یہ بات نہیں تھی کہ

وقار حسین کی ایک بیٹی بھی ہے میں اپنے باپ اور ماں کے مشن میں شریک ہوں۔تم میرا پہلا نشانہ ہو۔ میں تفصیلات میں جانا نہیں چاہتی ہوں میں تمہیں سفاکانہ موت کا نشانہ بنانے آئی ہوں۔‘‘

’’تم سپنا ہو؟‘‘ ڈاکٹر احمد جعفر کی آنکھیں پھیل گئیں۔’’مجھے بھی تم سے حساب بے باق کرنا تھا۔ مجھے اندازہ نہ تھا کہ تم اتنی ذہین ہو تم عقل مندی کا ثبوت دو تو یہ تمہارے حق میں زیادہ بہتر ہوگا۔ اس لئے کہ تم یا تمہارا باپ ڈائری کو حاصل کرنے کے بعد بھی اس تنظیم کا خاتمہ نہیں کر سکتا اور تم یہاں سے زندہ بچ کر نہیں جا سکتی ہو۔ میں نے تم سے بات کرنے اور دروازہ کھولنے سے پیشتر ٹیلیفون پر اپنے نادیدہ دشمن کے بارے میں اپنے آدمیوں کو مطلع کر دیا تھا۔ اب وہ راہداری میں میری ہدایت کے منتظر ہوں گے ایک بات اور میں عرض کرتا چلوں کہ مجھے یا ایک دو ساتھیوں کو قتل کر دینے سے یہ تنظیم ختم نہیں ہوگی۔ بہتر ہے کہ تم مجھ سے ایک سودا کرو۔ اس طرح تمہاری جان بخشی بھی ہو جائے گی۔‘‘ وہ ایک ہی سانس میں بول گیا۔

’’کیسا سودا؟‘‘ سپنا نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔

’’ڈائری میرے حوالے کر دو اور اس کے عوض منہ مانگی رقم لے لو ورنہ موت کے منہ میں جانے کے لئے تیار ہو جاؤ۔ میرے آدمی باہر کھڑے ہیں۔‘‘

’’تم دس کروڑ ٹاکا بھی دو تو میں سودا نہیں کروں گی۔‘‘ اس نے اپنا ہاتھ فضا میں بلند کیا۔’’تم مجھے سبز باغ دکھا کر باتوں میں الجھا رہے ہو تاکہ تمہارے آدمی پہنچ جائیں کیا ہمیں اتنا بے وقوف سمجھتے ہو کہ......‘‘ ڈاکٹر احمد جعفر نے چشم زدن میں اس پر کسی چیتے کی طرح جست لگا دی۔ سپنا کو توقع نہیں تھی۔ اس کی ذرا سی غفلت نے دشمن کو مہلت دے دی تھی سپنا نے فائر کیا مگر وہ خوش قسمتی سے بچ گیا۔ گولی اس کے کان کے پاس سے گزر کر سنگھار میز کے شیشے پر جا لگی۔ وہ دوسرا فائر اس لئے نہ کر سکی کہ ڈاکٹر احمد جعفر نے اسے قابو کر لیا تھا اور اس کے ہاتھ سے ریوالور چھین کر اسے اتنے زور سے دھکا دیا کہ وہ بستر پر جا گری پرس اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گیا اور ڈاکٹر احمد جعفر نے اپنا پستول اٹھا کر جیب میں رکھ لیا۔

وہ بجلی کی سی تیزی سے اٹھی لیکن اسے دیر ہو چکی تھی۔ ڈاکٹر احمد جعفر اپنے ہاتھ میں اس کا ریوالور لئے کھڑا تھا اور اس کی آنکھوں میں سفاک چمک تھی۔ وہ اسے فاتحانہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ ابھر آئی۔’’دیکھا تم نے بساط کیسے الٹ گئی؟‘‘

’’اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔‘‘ سپنا نے لباس درست کرتے ہوئے بے خوفی سے

جواب دیا جنگ میں تو ایسا ہوتا ہے۔''

''امن اور جنگ میں تو ہر چیز جائز ہے۔'' اس کی معنی خیز مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

''اب کیا خیال ہے اپنا اور ڈائری کا سودا کرو گی؟''

''ہرگز نہیں۔'' اس نے حقارت سے دیکھا اور ڈاکٹر احمد جعفر کے منہ پر تھوک دیا۔

مگر وہ ذرا بھی مشتعل نہ ہوا۔ اپنے ہاتھ کو چہرے پر لے جا کر آستین سے تھوک پونچھا۔ ''میرا اور ڈائری کا حصول ناممکن ہے۔ تم یہ کیوں بھول رہے ہو کہ میں یہاں اکیلی آئی ہوں۔ تمہارے گھناؤنے ارادے پورے ہو جائیں گے۔ میری ماں اور میرے ابو اسی ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہیں اس وقت وہ میرے کمرے میں موجود ہیں۔''

''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے۔'' وہ ہنسا۔ ''میرے آدمی انہیں اپنے کمرے سے باہر نکلنے نہیں دیں گے، نکلیں گے تو انہیں موت کے منہ میں جانے سے کوئی نہیں روک سکے گا۔ ان کی لاشیں تمہارے غسل خانے یا پھر بستر پر ٹکڑے ٹکڑے کر کے پھیلا دی جائیں گی۔''

''کیا تم نے میرے باپ کو بچہ سمجھا ہوا ہے؟'' سپنا نے نفرت سے کہا۔ ''یہ تو وقت ہی بتائے گا کہ کون سرخرو ہوتا ہے۔''

ڈاکٹر احمد جعفر نے اسے نشانے کی زد پر رکھتے ہوئے ٹیلیفون کے پاس جا کر ریسیور اٹھا کر کندھے پر رکھا اور ایک نمبر ڈائل کیا۔ چند لمحوں کے بعد دوسری طرف سے کسی نے ٹیلیفون اٹھایا تو اس پر نگاہ رکھتے ہوئے بولا۔ ''سنو! نینا کو آج رات لانے کی ضرورت نہیں ہے میں نے اس سے اچھی لڑکی کا بندوبست کر لیا ہے۔''

سپنا کو چاقو نکالنے اور اس پر حملہ کرنے کی مہلت درکار تھی۔ وہ چاقو بآسانی نکال سکتی تھی مگر وہ اس سے چھ سات قدم پر تھا۔ اس لئے چاقو نکال کر اس پر حملہ کرنا دشوار تھا۔ چاقو نکالتی تو یہ شیطان اسے نشانہ بنا دیتا۔ پھر وہ زخمی ہو جاتی' شاید موت کے منہ میں پہنچ جاتی۔ غیر مسلح ہونے کی صوت میں وہ اپنا بچاؤ نہیں کر سکتی تھی اس وقت وہ پھر سے گرداب میں پھنس گئی۔ اب یہ چاقو ہی اس کا ہمدم اور مددگار تھا۔

ڈاکٹر احمد جعفر نے ٹیلیفون پر گفتگو منقطع کرنے کے بعد ریسیور کریڈل پر پٹخ دیا۔ اس نے اپنا ریوالور بائیں ہاتھ میں پکڑ لیا اس لئے کہ اس کا زخمی ہاتھ درد کر رہا تھا۔ کرسی کی پشت پر کھڑے ہو کر استہزائیہ انداز سے بولا۔ ''تمہاری عقل ٹھکانے آئی کہ نہیں۔''

''نہیں۔'' وہ ہذیانی لہجے میں بولی۔ ''تم نے مجھے سمجھنے میں غلطی کی ہے' میں موت سے خوفزدہ نہیں ہوں۔''

دفعتاً دروازے پر کسی نے مخصوص انداز سے ہلکی دستک دی تو ڈاکٹر احمد جعفر کا زرد اور ستا ہوا چہرہ ایک دم سے دمک اٹھا اور اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ اس لمحے جیسے وہ اپنی تکلیف اور درد بھول بیٹھا۔ پھر اس نے سپنا کو نشانے کی زد میں رکھتے ہوئے محتاط انداز سے دروازے کی طرف قدم بڑھایا اور کنڈی ہٹا کر دروازہ کھول دیا۔ اندر داخل ہونے والے دیو زاد شخص نے بڑے مودبانہ انداز سے ڈاکٹر احمد جعفر کو سلام کیا اور پھر اس نے دروازہ بند کر دیا۔ سپنا نے اس شخص کے چیچک رو مکروہ چہرے، سور جیسی آنکھیں، اس کا دراز قد اور ہاتھی جیسا ڈیل ڈول دیکھا تو سرد لہر اس کی ریڑھ کی ہڈی میں چاقو کی نوک کی طرح اتر گئی۔ ڈاکٹر احمد جعفر نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ ''نجیب اچھا ہوا تم بروقت پہنچ گئے۔''

''سر! یہ آپ کے ہاتھ کو کیا ہوا؟'' وہ ہاتھ پر بندھے رومال میں خون کے دھبے دیکھ کر بولا۔

''اس عورت نے ریوالور کی گولی سے میرا ہاتھ زخمی کر دیا ہے۔'' وہ سپنا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگا۔ ''اسے تم نشانے کی زد پر رکھو اس عورت سے ذرا ہوشیار رہنا۔'' اس نے توقف کر کے ریوالور بدمعاش کی طرف بڑھایا۔

''آپ حکم دیں تو میں اپنے چاقو سے اس بڑھیا کو آپ کے سامنے ذبح کر دوں؟'' نجیب اس کے ہاتھ سے ریوالور لیتے ہوئے بے رحمی سے بولا۔

''یہ بڑھیا نہیں ہے بلکہ بہت حسین اور نوجوان لڑکی ہے۔'' ڈاکٹر احمد جعفر نے سرشاری سے کہا۔ ''تمہیں شاید یقین نہیں آئے گا لیکن یہ حقیقت ہے۔ یہ سپنا بیگم ہے اس وقار حسین کی بیٹی جس کی ہمیں تلاش ہے اور اس کے پاس ڈائری ہے۔''

''سچ باس!'' نجیب حیرت اور خوشی سے سپنا کی طرف دیکھنے لگا۔ ''مجھے یقین نہیں آ رہا ہے کہ شکار خود چل کر ہمارے جال میں کیسے آ گیا؟''

''جب کسی کی موت اور شامت آتی ہے تو وہ آپ ہی آپ جال میں آ پھنستا ہے۔'' وہ کہنے لگا۔ ''میں نے اسے پیشکش کی تھی مگر اس نے صاف انکار کر دیا ہے وہ کسی قیمت پر ڈائری اور اپنے آپ کو میرے حوالے کرنے کو تیار نہیں ہے۔ اب سودے بازی اس کے باپ سے ہو گی۔ تاوان کی صورت میں یہ لڑکی اور ڈائری ملے گی۔ میں نے تمہیں اس لئے بلایا ہے کہ اس کے باپ سے ملو۔ بقول اس کے وقار حسین اسی ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہے اور شاید اس وقت اس کے کمرے سولہ سو دس نمبر میں موجود ہے، تم ایسا کرو......''

یہ دونوں آپس میں باتیں کر رہے تھے، ادھر سپنا کے ذہن کا کمپیوٹر بہت تیزی سے

کام کرنے لگا اس نے سوچا کہ اسے فریب' مکاری سے انہیں اعتماد میں لینا ہوگا۔ ورنہ وہ اس خبیث کا شکار ہو جائے گی۔ اس بدمعاش کو کمرے سے نکلنا نہیں چاہیے۔ ڈاکٹر احمد جعفر ڈائری کے ساتھ ساتھ اس کے حصول کا بھی خواب دیکھنے لگا ہے پھر اس کے ذہن میں ایک تدبیر آ ہی گئی۔

''میں ایک شرط پر ڈائری تمہارے حوالے کر سکتی ہوں۔'' سپنا نے ڈاکٹر احمد جعفر کو مخاطب کر کے کہا۔

ڈاکٹر احمد جعفر نے چونک کر اس کی طرف دیکھا' اس کا چہرہ مسرت سے دمک اٹھا۔ ''کیسی شرط؟''

''تم میری اور میرے والدین کی جان بخشی کرنے کا وعدہ کرو گے اور ہمیں ملک سے باہر جانے دو گے۔'' سپنا پست آواز میں بولی۔

''مجھے منظور ہے۔'' ڈاکٹر احمد جعفر نے اپنا سر ہلایا۔ ''لیکن پہلے تمہیں ڈائری ہمارے حوالے کرنا ہوگی۔''

''اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ تم ڈائری لینے کے بعد اپنے وعدے پر قائم رہو گے؟'' سپنا بے اعتباری سے بولی۔

''میں اپنی زبان سے کوئی قول دینے کے بعد مکرتا نہیں ہوں' تمہیں میرے وعدے پر اعتبار کرنا ہوگا۔'' وہ زور دے کر بولا۔

''تم مجھے ایک کاغذ پر ایک تحریر دو کہ تمہاری تنظیم کا کوئی آدمی ہم تینوں سے کوئی تعرض نہیں کرے گا۔''

ڈاکٹر احمد جعفر نے ایک کاغذ پر لکھ دیا کہ مس سپنا بیگم' رقیہ بیگم اور وقار حسین کو تنظیم کا کوئی فرد تنگ اور پریشان نہیں کرے گا اور نہ ہی انہیں کسی قسم کا نقصان پہنچانے اور قتل کرنے کی کوشش کرے گا نہ انہیں ملک سے باہر جانے سے روکے گا۔ اس نے یہ تحریر لکھنے کے بعد اپنے دستخط کر کے سپنا کے حوالے کر دیا۔ سپنا نے اس تحریر پر ایک نظر ڈالی پھر مطمئن ہو کر اپنے پرس میں رکھ لی۔ اس نے ان دونوں کی طرف دیکھا۔ ڈاکٹر احمد جعفر ریوالور جیب میں رکھ چکا تھا۔ اسے ایک طرح سے اطمینان اس لئے تھا کہ کمرے میں نجیب موجود تھا سپنا کا ریوالور نجیب کے پاس تھا اس نے بھی ریوالور اپنی جیب میں رکھ لیا۔ اس کمرے میں دو مرد تھے جو مسلح تھے' ایک عورت تھی وہ غیر مسلح تھی۔

''کیا وہ ڈائری تمہارے کمرے میں موجود ہے؟'' ڈاکٹر احمد جعفر نے سپنا کی

طرف دیکھا۔

''کمرے میں نہیں ہے بلکہ میرے پاس موجود ہے'' سپنا نے جواب دیا۔ ''میں اسے ہر وقت اپنے پاس رکھتی ہوں کہ کہیں گم نہ ہو جائے۔''

ڈاکٹر احمد جعفر نے اتفاق سے سپنا کا پرس چیک نہیں کیا تھا۔ سپنا نے اس کی تحریر رکھنے کے لئے اپنا پرس مانگا تو اس نے اس خیال سے دے دیا تھا کہ پرس میں کچھ نہیں ہو گا۔ وہ سپنا کا ریوالور اپنے قبضے میں کر چکا تھا اس نے سپنا کی طرف اپنا ہاتھ بڑھایا۔ ''اپنا پرس مجھے دے دو تاکہ میں خود ہی اس میں سے ڈائری نکال لوں۔''

''نہیں' ابھی نہیں۔'' سپنا تیزی سے ایک قدم پیچھے ہٹی۔ وہ اپنا پرس والا ہاتھ پیچھے لے گئی۔ ''میں ڈائری کمرے سے نکلنے کے بعد دوں گی۔''

''مگر تم صبح سے پہلے اس کمرے سے نہیں نکل سکتی ہو۔'' ڈاکٹر احمد جعفر اپنے ہونٹوں پر ایک مغرور مسکراہٹ لئے اس کی طرف بڑھا۔ اس کی آنکھوں میں شیطانیت ناچ رہی تھی۔ ''تمہارے لئے بہتری اسی میں ہے کہ اپنا پرس اور اپنے آپ کو میرے حوالے کر دو اور میرے معزز مہمان کی طرح رہو۔''

''تم وعدے کی خلاف ورزی کر رہے ہو۔'' سپنا تنک کر بولی اور پیچھے ہٹتی ہوئی دیوار سے جا لگی۔

''میں نے تمہیں یہاں سے جانے دینے کا وعدہ نہیں کیا۔'' وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے ریاکاری سے بولا۔ ''وہ وعدہ ہی کیا جو وفا ہو جائے۔''

''میں اس وقت تک اپنا پرس نہیں دوں گی جب تک تم مجھے کمرے سے باہر نہیں جانے دو گے۔'' سپنا اپنی بات پر اڑی رہی۔

''تمہاری ضد اور ہٹ دھرمی کسی کام کی نہیں۔'' ڈاکٹر احمد جعفر نے اپنا ہاتھ بڑھا کر اس کے ہاتھ سے پرس چھین لیا۔ ''اب تم نہ تو میری تحریر لے جا سکو گی اور نہ یہاں سے نکل سکو گی۔ نہ تمہارے باپ اور ماں کی جان بخشی ہو گی۔ تم اس وقت تک زندہ رہو گی جب تک تم سے میرا دل نہیں بھر جاتا' پھر میں یہ دیکھوں گا کہ نرم و نازک اور شاداب جسم تیزاب میں کیسے جلتا ہے۔ یہ سزا میں نے تمہارے لئے اس لئے تجویز کی ہے کہ تم نے میری جان لینے کی کوشش کی تھی۔''

''زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں ہے۔'' وہ بستر پر جا بیٹھی۔ ''جب تک اس کا حکم نہیں ہو گا اس وقت تک مجھ پر آنچ نہیں آئے گی۔''

ڈاکٹر احمد جعفر نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔ نجیب اور وہ ایک دوسرے کی صورت دیکھ کر معنی خیز انداز سے مسکرانے لگے۔ ڈاکٹر احمد جعفر نے میز کے پاس جا کر پرس کو اس پر الٹ دیا جب اس میں سے کوئی ڈائری برآمد نہ ہوئی تو اس نے اندر جھانک کر اور ہاتھ ڈال کر بھی دیکھ لیا تھا۔ کسی ڈائری کا کوئی وجود نہ تھا۔ نجیب بھی میز کے پاس کھڑے ہو کر دیکھ رہا تھا۔ وہ دونوں ایک لمحے کے لئے سپنا سے غافل ہو گئے تھے سپنا ایسے ہی لمحے کی منتظر تھی یہ سنہری موقع اسے پھر کبھی نہیں مل سکتا تھا وہ اسے کسی قیمت پر کھونا نہیں چاہتی تھی آنے والا لمحہ فیصلہ کن تھا' زندگی یا موت۔

ڈاکٹر احمد جعفر اور نجیب نے ایک دوسرے کی شکلیں دیکھیں وہ مشتعل ہو گیا کہ سپنا نے اسے بڑی چالاکی سے بے وقوف بنایا ہے۔ وہ دونوں تیزی سے سپنا کی طرف گھومے۔ وہ بستر پر نہیں بیٹھی تھی۔ وہ کسی زخمی شیرنی کی طرح غضبناک کھڑی تھی اور اس کے خوبصورت ہاتھ میں ایک کھلا ہوا چاقو تڑپ رہا تھا۔ چاقو کی دھار سے کہیں خوفناک اس کی حسین آنکھیں تھیں جو انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔ وہ دونوں سپنا کے ہاتھ میں زہر میں بجھا ہوا چاقو دیکھ کر ششدر رہ گئے کہ یہ اس کے پاس کہاں سے اور کیسے ایا۔ اسے اس نے کہاں چھپا رکھا تھا۔

''میں نے سنا ہے کہ اس چاقو کی ہلکی سی خراش آدمی کو موت کے منہ میں پہنچا دیتی ہے۔'' سپنا نے ڈاکٹر احمد جعفر کے پیٹ میں بلا تامل چاقو گھسیڑ دیا۔ ''میں آج اس کا تجربہ کر کے دیکھ رہی ہوں۔''

ڈاکٹر احمد جعفر کی آنکھیں حیرت' خوف اور دہشت سے پھٹ گئیں۔ اسے ایسا لگا جیسے کسی نے اس کے پیٹ میں انگارے بھر دیئے ہوں۔ سپنا نے ایک پل کے ہزارویں حصے میں چاقو اس کے پیٹ سے نکال لیا اور وہ نجیب پر جھپٹی جو اپنی جیب سے سراسیمگی سے ریوالور نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسی لمحے ڈاکٹر جعفر کی دلدوز چیخ فضا میں گونجی۔ نجیب پیچھے ہٹتے ہوئے کرسی سے ٹکرا کر گر پڑا۔ وہ بجلی کی سی تیزی سے اٹھ کھڑا ہوا سنبھلنے بھی نہیں پایا تھا کہ سپنا نے اس کے سینے میں چھرا گھونپ دیا۔ جس تیزی سے چھرا گھونپا تھا اسی تیزی سے نکال بھی لیا۔ نجیب نے بھی ایک دل خراش چیخ ماری۔ کمرہ دہل گیا سپنا کو ان چیخوں کی فکر اور خوف نہ تھا۔ انہیں سن کر کوئی آنے والا نہیں تھا۔ اس لئے کہ اس منزل کے کسی کمرے میں کوئی مسافر ٹھہرا ہوا نہیں تھا۔

ان دونوں کے زخموں سے خون ابل کر فرش پر بچھے ہوئے قالین پر پھیل کر اس میں جذب ہو رہا تھا۔ وہ دونوں زخمی پرندے کی طرح درد کی شدت اور اذیت سے

پھڑ پھڑاتے، لوٹتے رہے۔ یہ کیفیت ان پر صرف دو تین منٹ جاری رہی پھر انہیں اذیت ناک موت سے نجات مل گئی۔ ان کی بے جان آنکھیں جن میں حیرت کا عنصر تھا وہ چھت پر مرتکز ہو گئیں۔ انہیں دم توڑتے ہوئے جیسے اس بات کا یقین نہیں آیا تھا کہ ایک نرم و نازک اور نوجوان لڑکی کسی درندے کی طرح خونخوار اور خطرناک ہو سکتی ہے۔ اس نے آن کی آن میں انہیں موت کے منہ میں دھکیل دیا۔ اس نے آہٹ سی سنی تو چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔ اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا کوئی دروازہ کھول رہا تھا۔

سپنا کی رگوں میں لہو منجمد ہونے لگا۔ خوف و دہشت نے اسے بے جان سا کر دیا تھا اس میں جیسے اتنی سکت ہی نہیں رہی تھی کہ وہ اپنی جگہ سے حرکت کر سکے پھر اس نے فوراً ہی اپنے حواس مجتمع کئے اور نجیب کی لاش کی طرف لپکی تاکہ اس کی جیب سے اپنا ریوالور نکال سکے مگر اسے دیر ہو چکی تھی۔ اندر داخل ہونے والا ایک ہی شخص تھا اس نے اندر داخل ہوتے ہی سرعت سے دروازہ بند کر دیا اس کے ہاتھ میں ایک خوفناک قسم کا ریوالور تھا اور اس کی آنکھوں میں سفاک چمک تھی۔ وہ ٹھٹھک کے رک گئی پھر اس نے دیوار کا سہارا لے کر اطمینان سے ایک گہرا سانس لیا۔ یہ وقار حسین تھا۔

وقار حسین نے خون میں لت پت لاشوں کو فرش پر بکھرے ہوئے حیرت سے دیکھا، اسے اپنی بیٹی کے کارنامے کا یقین نہیں آیا۔ یہ وقت اور موقع تفصیل میں جانے کا نہیں تھا۔ اس نے پوچھا۔ ''سپنا بیٹی! تم خیریت سے ہو ناں؟''

''جی ابو!'' سپنا نے جواب دیا۔ ''اللہ نے بڑا کرم کیا، ورنہ آپ ان کی جگہ میری لاش دیکھتے۔''

''میں بروقت کیوں نہیں پہنچ سکا۔ جمال اور انسپکٹر رشید چودھری کیوں نہیں آ سکے یہ تمہیں بعد میں بتاؤں گا تم فوراً نکل چلو۔ خطرہ ابھی بھی موجود ہے۔''

سپنا نے اپنا ریوالور نجیب کی جیب سے نکال کر اپنے پرس میں رکھ لیا۔ وقار حسین نے اپنی جیب سے رومال نکال کر ان چیزوں اور جگہوں کو صاف کر دیا جن پر اس کے اور سپنا کے ہاتھ لگے تھے۔ وہ شیطان کے کمرے سے نکل کر اپنے کمرے میں آ گئے۔ وقار حسین نے اس سے کہا کہ وہ لفٹ سے نیچے پہنچے وہ دوسری لفٹ سے آ رہا ہے۔ وہ لفٹ سے نکل کر پارکنگ لاٹ پر پہنچ جائے۔ وہاں گاڑی کھڑی ہے اس میں جمال اور انسپکٹر رشید چودھری موجود ہیں۔

وقار حسین نے گھر جاتے ہوئے اسے راستے میں بتایا کہ وہ لفٹ میں پھنس گیا تھا

لفٹ ساتویں اور آٹھویں منزل کے درمیان کسی خرابی کے سبب بند ہو گئی تھی۔ اس کے ٹھیک ہونے میں اتنی دیر ہو گئی تھی اس شیطان کے چار آدمی کافی ہاؤس میں تھے جن میں سے ایک آدمی اوپر گیا تھا۔ ان تینوں بدمعاشوں کی نگرانی کے لئے وہ نیچے رہ گئے تھے اس لئے اوپر نہ آ سکے۔

کیا یہ سب کچھ محض اتفاق تھا یا قدرت کو اس کے ہاتھوں ان دونوں بدمعاشوں کو کیفر کردار تک پہنچانا مقصود تھا۔ سپنا نے سوچا۔ سپنا گھر پہنچنے تک یہ سوچ کر لرز جاتی تھی کہ وہ شیطان اس پر قابو پالیتا تو پھر وہ اس کا شکار ہو جاتی پھر کیا وہ زندہ رہنے کے قابل ہوتی؟ وہ صرف اپنے اس کارنامے پر دل میں حیران نہیں تھی بلکہ جمال اور انسپکٹر رشید چودھری بھی ششدر تھے کہ اس نے کس طرح ان پر قابو پالیا۔

دوسرے دن کے تمام اخبارات میں ڈاکٹر احمد جعفر کے قتل کی خبر نہیں تھی بلکہ اس واردات کو حادثے کا رنگ دے دیا گیا تھا احمد جعفر کی گاڑی رات ایک بجے ایک گاڑی کو بچانے کی کوشش میں کھمبے سے ٹکرا گئی وہ اور ان کا ملازم نجیب موقع پر ہی دم توڑ گئے۔ یہ حادثہ ریس کورس کے پاس پیش آیا تھا۔

''اب کس کا نمبر ہے ابو!'' سپنا نے پوچھا۔ ''تین شیطان تو کیفر کردار تک پہنچ چکے ہیں۔''

''پروفیسر کریم کا جو ڈاکٹر کریم کے نام سے شہرت رکھتا ہے۔'' وقار حسین نے جواب دیا۔ ''جو اس ملک کا نامور سائنس دان ہے۔ اس کی اپنی ذاتی اتنی بڑی لیبارٹری ہے کہ حکومت کے پاس بھی نہیں ہے وہ وہاں نت نئے تجربے کرتا رہتا ہے۔''

☆......☆......☆

ریس کورس گراؤنڈ میں قاضی نذر الاسلام کے یوم پیدائش کے موقع پر ہر سال کی طرح اس سال بھی انتہائی اعلیٰ پیمانے پر شام موسیقی کا انعقاد کیا گیا تھا اس تقریب کا مہمان خصوصی ڈاکٹر کریم تھا اور صدارت کی کرسی پر ہوم سیکرٹری براجمان تھا۔ ہر سال کی طرح اس سال بھی ان دونوں شیطانوں کو صدر اور مہمان خصوصی بنانے کا اعزاز بخشا گیا تھا۔ ہر سمت تاحد نگاہ سر ہی سر دکھائی دے رہے تھے۔ مردوں کے مقابلے میں نوجوان لڑکیوں اور عورتوں کی اکثریت تھی۔

☆......☆......☆

سپنا نے اس تقریب کا حال اخباروں میں پڑھا تھا کو میلا سے اس کی سہیلیاں اکثر اس تقریب میں شرکت کے لئے جایا کرتی تھیں۔ اس کی بڑی حسرت تھی کہ وہ اس تقریب میں شرکت کرے۔ آج وہ اس تقریب میں شرکت کرنے ہی نہیں بلکہ ڈاکٹر کریم کو بھی دیکھنے آئی تھی۔ ڈاکٹر کریم جس وقت اسٹیج پر اپنے خیالات کا اظہار کرنے آیا لاکھوں کے مجمع نے تالیوں سے اس کا پرزور استقبال کیا کوئی دس منٹ تک لوگ بڑے جذبے اور گرم جوشی سے تالیاں بجاتے رہے تھے۔ جب تالیوں کا شور دم توڑ گیا اور ایک دم سناٹا طاری ہو گیا تو اس نے کہنا شروع کیا۔ ''میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گا' میں صرف اتنا کہوں گا کہ موسیقی سے وہی شغف رکھتے ہیں جن کے دلوں میں لطیف انداز کے احساسات ہوتے ہیں۔ موسیقی انسانی روح کی غذا ہی نہیں بلکہ......

سپنا کو ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کوئی سپنا دیکھ رہی ہو اسے اپنی سماعت اور آنکھوں پر یقین نہیں آیا کہ ایک درندہ صفت شخص موسیقی کا شیدائی ہو سکتا ہے۔ ڈاکٹر کریم کے نزدیک انسان کی کوئی حقیقت نہ تھی۔ اس کے سینے میں دل نہیں پتھر تھا۔ اپنی خون آشامی سے درندوں کو شرمندہ کر دینے والے شیطان صفت ڈاکٹر کریم کی فطرت کا یہ تضاد بڑا عجیب تھا۔ انسانی قتل عام کی روایات کے امین' سفاکی اور بربریت کے علمبردار ایذا رسانی کے ماہر کا وجود اس ماحول اور تقریب میں غیر فطری سا لگ رہا تھا۔

جب فردوسی رحمان نے ایک مشہور و مقبول گیت سے جو نذر الاسلام کا لکھا ہوا تھا شام موسیقی کا آغاز کیا تو چند لمحوں میں لاکھوں کے مجمع پر ایک گہرا سکوت چھا گیا ایسا لگ رہا تھا کہ میلوں لمبے چوڑے اس گراؤنڈ میں ایک شخص بھی موجود نہیں ہے فردوسی رحمان فضا میں نغمہ بکھیر رہی تھی۔ ہر شخص سات سروں کی دنیا میں پرواز کرنے لگا۔ اس کی مدھر آواز جادو جگا رہی تھی۔ فردوسی رحمان گزشتہ چالیس برسوں سے گا رہی تھی۔ اس نے بڑھاپے کی حدود میں

قدم رکھ دیا تھا مگر اس کی آواز میں آج بھی جادو تھا۔ سپنا نے اپنی دوربین سے اس شیطان کو دیکھا جو آواز کے سحر میں کھو گیا تھا اور اس کے بشرے سے ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کی روح اور قلب کو ایک عجیب سی مسرت اور طمانیت مل رہی ہو۔ وہ کسی معصوم فرشتے کی طرح لگ رہا تھا۔

سپنا نے گھر پہنچ کر ڈائری نکالی اور وہ صفحہ دیکھنے لگی جس میں ڈاکٹر کریم کے بارے میں لکھا تھا۔ اس شخص کے بارے میں جس قدر تفصیل سے لکھا ہوا تھا کسی اور شیطان کے بارے میں تحریر نہیں تھا۔ ڈاکٹر احمد جعفر کے بارے میں تو یہ لکھا تھا کہ وہ زندہ اور مردہ آدمیوں کو آگ میں جھونک دیتا ہے اور ان کا وحشیانہ انداز سے آپریشن کر کے تجربے کرتا ہے۔ انسانوں کی راکھ کے تجربے بھی کرتا ہے مگر اس کے بارے میں جو لکھا ہوا تھا وہ اس سے کہیں لرزہ خیز تھا۔ شاید کسی کو میری اس بات کا یقین نہیں آئے گا لیکن یہ حقیقت ہے کہ میں نے اپنی زندگی میں ڈاکٹر کریم جیسا شقی القلب انسان نہیں دیکھا۔ اسے انسان کہنا انسان کی توہین ہے بلکہ مجھے یہ کہنا چاہیے کہ میں نے ایسا درندہ صفت نہیں دیکھا۔ یہ شیطان اس ملک کے نامور سائنس دانوں میں شمار ہونے لگا ہے جو ایک المیہ ہے اگر یہ شخص زندہ رہا اسے قانون کے حوالے نہیں کیا گیا تو یہ اس سے بھی بڑا المیہ ہوگا۔ انسانیت پر وہ ایک بدنما داغ ہے۔ اس نے جو اپنی ذاتی جدید ترین اور عظیم الشان لیبارٹری بنا رکھی ہے اس کے اندر کسی شخص کو داخل ہونے کی اجازت نہیں ہے ماسوائے اس کے ایک دو مخصوص آدمیوں کے۔ وہ اغوا کیے گئے معصوم انسانوں پر اسی طرح سے تجربے کرتا ہے جس طرح جانوروں پر کیا جاتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ ایک تو مطلب کے جانوروں کا دستیاب ہونا مشکل ہے اور پھر ان پر خرچ بھی زیادہ آتا ہے۔ اس دیش میں طوفان، بارش اور سیلاب کی تباہ کاریوں سے ہزاروں اور لاکھوں افراد اذیت ناک موت مرتے ہیں اگر وہ اس کے تجربے کی نذر ہو جائیں تو اس میں کیا برائی ہے۔ اب تک سینکڑوں افراد اس کی تجربہ گاہ میں تجربے کی بھینٹ چڑھ چکے ہیں اور چالیس پچاس افراد اس کی قید میں ہیں۔ کوئی ایک ماہ پیشتر اس کا ایک قیدی جس نے اس کی تجربہ گاہ میں سخت ترین جسمانی عذاب جھیلا تھا اور انسانیت سوز مظالم کا تختہ مشق بنا تھا کسی طرح وہاں سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا اور اس نے مجھ سے رابطہ قائم کیا۔ اس نے مجھے اس لیبارٹری میں ہونے والے تجربوں کے بارے میں بتایا تو میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے اس کے لرزہ خیز مظالم کا تصور کوئی بھی شخص نہیں کر سکتا۔ یہ شخص اپنا بیان قلمبند کرانے کے

بعد مر گیا بلکہ اسے مار دیا گیا۔ میری یہ غلطی تھی کہ میں نے اسے ڈاکٹر احمد جعفر کے خیراتی ہسپتال میں علاج کی غرض سے داخل کیا تھا۔ میں نے اس شیطان مردود کے خلاف کوئی اقدام اور گرفتار کرنے کی اجازت چاہی تو مل نہ سکی۔ الٹا مجھے دھمکیاں دی جانے لگیں۔ اب چونکہ اس کا راز مجھ پر افشا ہو چکا تھا لہٰذا اس کی پوری تنظیم جو دس شیطانوں پر مشتمل ہے میری جان لینے پر کمربستہ ہو گئے ہیں' مگر مجھے اپنی زندگی سے اتنا پیار نہیں ہے جتنا قانون کی بالادستی سے' انسانیت سے' میں ایک روز کسی نہ کسی طرح اس کی عظیم الشان لیبارٹری میں جائزہ لینے کے لئے اندر داخل ہو گیا۔ میں یہ تو دیکھ نہیں سکا کہ وہ مرد اور عورتوں پر کس قسم کے تجربات کر رہا ہے مگر میں ایک طرف کھڑا ان کی دل خراش چیخیں سنتا رہا جو میرے کانوں میں گرم گرم سیسے کی طرح پڑی تھیں۔ کوئی ایک گھنٹے تک میں یہ چیخیں سنتا رہا پھر وہ ایک ایک کر کے دم توڑتی چلی گئیں۔ ایک دم سے سناٹا چھا گیا۔ مجھے ایسا لگا کہ وہ انسانیت سوز تجربات سے گزرنے کے بعد اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ میں وہاں سے چلا آیا۔ میں نے اس لیبارٹری کو ڈائنامائیٹ نے اڑانے کا فیصلہ کیا ہے اگر زندگی نے مہلت دی تو میں اسے ضرور تباہ کر کے رہوں گا۔

سپنا نے ڈائری بند کر کے رکھ دی اور سوچنے لگی۔

وقار حسین نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''تم اس قدر سنجیدگی سے کیا سوچ رہی ہو کیا ڈاکٹر کریم کے بارے میں؟''

''میں یہ سوچ رہی ہوں کہ کیا اس شیطان کو بھی ختم کرنے کا اعزاز مجھے حاصل ہو سکتا ہے۔'' سپنا نے جواب دیا۔ ''اس شیطان کو ختم کرنا سب سے زیادہ مشکل ہے۔'' وقار حسین نے جواب دیا۔ ''اس لئے کہ وہ اپنے ساتھیوں کے قتل کے بعد لیبارٹری کے احاطے میں بنے ہوئے بنگلے میں منتقل ہو گیا ہے وہاں اتنا زبردست پہرہ ہے کہ چڑیا بھی پر نہیں مار سکتی ہے۔''

''اس شیطان کو کسی بھی قیمت پر ختم کرنا ضرور ہے۔'' انسپکٹر رشید چودھری نے کہا۔

''تمہارے ذہن میں اس شیطان اور اس کی لیبارٹری کو اڑانے کا کوئی منصوبہ ہے؟' جمال نے پوچھا۔

''پہلے تو میں نے سوچا تھا کہ میں اپنے ایک دوست کی مدد سے جو فوج میں کمانڈر

ہے اس کی مدد سے اس شیطان کی لیبارٹری پر شب خون مار کر اسے تباہ و برباد کر دوں پھر میں نے یہ ارادہ ملتوی کر دیا اس لئے کہ ان شیطانوں میں فوج کا ایک اعلیٰ عہدیدار بھی شامل ہے اور یہ کمانڈر اس کے ماتحت ہے۔ اس کالی بھیڑ کی وجہ سے یہ آپریشن مشکل ہے۔ میں نے وزیراعظم سے بات کی جو میرے کزن ہیں وہ بھی اس شیطان کے خلاف ایک بڑے آپریشن کی اجازت دینے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ اس لئے کہ اس شیطان کے خلاف ایک تو ٹھوس ثبوت موجود نہیں ہے دوسرا اس آپریشن کی اس شیطان کو پہلے خبر ہو جائے گی کیونکہ اس کا پولیس میں بھی اثر و رسوخ ہے اب کوئی خفیہ آپریشن کرنا ہوگا۔ انسپکٹر رشید چودھری نے کہا۔

''ایسی بات ہے تو پھر ہم کیوں نہ پیشہ ور قاتلوں کی خدمات حاصل کریں۔'' جمال نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

''اس پہلو پر سوچا تو جا سکتا ہے۔'' انسپکٹر رشید چودھری نے کہا ''کیونکہ ہم ایک ناسور کا علاج کرنا چاہتے ہیں مگر ہم کسی وجہ سے اپنے مقصد میں ناکام ہو گئے تو اس کے نتائج ہماری توقعات سے کہیں خطرناک ثابت ہو سکتے ہیں۔ ہمیں ناکامی کے پہلو کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے۔''

''اصل بات صرف کامیابی کی ہے۔'' وقار حسین کہنے لگا۔ ''ان شیطانوں کا صفایا کرنے کے لئے ہمیں پیشہ ور قاتلوں سے مدد لینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ یہ پیشہ ور قاتل صرف پیسے کے بھوکے ہوتے ہیں ان پر ہم بھروسہ نہیں کر سکتے ہیں۔ ہمیں اللہ اور اپنے بازوؤں پر بھروسہ کرنا ہوگا۔ ہماری یہ چھوٹی سی تنظیم کافی ہے۔ ضرورت بے عیب منصوبہ بنانے کی ہے۔ ہمارے پاس نہ تو وسائل کی کمی ہے نہ ہی دولت کی۔ اس کے علاوہ جدید ترین اسلحہ اور ایسا ساز و سامان بھی ہے کہ ہم اس شیطان کے ٹھکانے کو جس نے خونریزی اور دہشت گردی کی انتہا کر دی ہے جہنم رسید کر دیں گے۔''

''ہم اس شیطان تک کیسے رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔'' جمال نے کہا۔ ''سنا ہے کہ اب وہ ہر کسی سے ملنا پسند نہیں کرتا ہے۔ زیادہ تر وقت وہ اپنی لیب میں گزارتا ہے۔''

''اس کی کوئی نہ کوئی صورت نکل آئے گی۔'' وقار حسین نے کہا۔ ''تم تینوں جا کر اس جگہ کا جائزہ لے آؤ اور میں اپنے کیمرے سے اس کی لیبارٹری کے اندر اور باہر کی تصویریں اتار کے لے آؤں گا تا کہ ہم اندر داخل ہونے کے لئے ایک نقشہ بنا سکیں۔ میرے پاس جو کیمرہ ہے اس کے زوم لینز سے دور کی تصویریں نہایت صاف اور واضح اتاری جا سکتی

ہیں۔"

"آج کے اخبارات میں ڈاکٹر کریم کی طرف سے بڑے چوہوں اور شکاری کتوں کی ضرورت کا اشتہار چھپا ہے۔" انسپکٹر رشید چودھری نے کہا۔ "میں چوہوں اور کتوں کو فروخت کرنے کے بہانے اس جگہ کا ایک جائزہ لیتا آؤں گا۔ اس جگہ کے قریب ایک پکنک اسپاٹ بھی ہے جہاں سے اس کا جائزہ لیا جا سکتا ہے۔"

دوسرے ہی دن سپنا اور جمال اس جگہ کا جائزہ لینے پکنک اسپاٹ پر پہنچ گئے جو ڈاکٹر کریم کی لیبارٹری سے ڈیڑھ دو فرلانگ کے فاصلے پر تھا۔ لیبارٹری کی دیواریں دس بارہ فٹ اونچی تھیں اور اس کی منڈیر پر خاردار تاروں کی باڑھ لگی ہوئی تھی۔ لیبارٹری کی عمارت درختوں سے گھری ہوئی تھی۔ سرچ لائٹیں بھی لگی ہوئی تھیں۔ یہ جگہ بے حد پر اسرار سی لگ رہی تھی۔

وہ اس اسپاٹ پر سہ پہر تک موجود رہے تھے اور دوربین سے قدرتی نظاروں سے لطف اندوز ہونے کے بجائے اس کے گیٹ کی طرف دیکھتے بھی رہے تھے کہ وہاں کی آمدورفت کو نوٹ کیا جا سکے۔ انہیں کوئی اندر جاتا اور باہر نکلتا ہوا دکھائی نہیں دیا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اس میں کوئی رہتا ہی نہ ہو۔ دوپہر کے کھانے سے فراغت پانے کے بعد انہوں نے ایک بار گاڑی میں کسی قدر فاصلے اور قریب سے اس لیبارٹری کے چاروں طرف چکر لگا کر اس کے محل وقوع کا جائزہ لیا۔ جمال نے دو تین مختلف سمتوں سے اونچے اور گھنے درختوں پر چڑھ کر جو اس لیبارٹری سے فرلانگ کے فاصلے پر تھے اس کے اندر کا جائزہ لیا۔ اسے کوٹھی اور لیبارٹری کی وسیع و عریض عمارت بھی صاف دکھائی تھی۔ اس نے دو تین مسلح پہرہ داروں کو بھی کوٹھی اور لیبارٹری کی عمارت میں آتے جاتے ہوئے دیکھا تھا مگر اسے ڈاکٹر کریم کی ایک جھلک بھی دکھائی نہیں دی۔ اس نے سوچا کہ ان درختوں سے اس جگہ کی عکاسی کی جا سکتی ہے۔ وہ وقار حسین کو مشورہ دے گا وہ ان درختوں پر چڑھ کر تصویریں اتارے۔

جمال نے واپسی پر سپنا سے کہا۔ "ڈاکٹر کریم نہ صرف موسیقی کا شیدائی ہے بلکہ باغبانی کا بھی بہت اچھا ذوق رکھتا ہے۔ میں تو یہ دیکھ کر ششدر رہ گیا ہوں کہ اس نے اس جگہ کیسا خوبصورت گلستان بنا رکھا ہے۔ میں نے اپنی زندگی میں شاید ہی کبھی کہیں ایسا خوبصورت گلستان دیکھا ہو۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ اس کی فطرت کا تضاد اس قدر عجیب وغریب کس لئے ہے۔"

''واقعی یہ بات حیران کن ہے۔'' سپنا حیرت سے بولی۔ ''ایک اور بات میری سمجھ سے بالاتر ہے کہ وہ مہلک ہتھیاروں پر تجربے کر رہا ہے اور اس نے ایسے مہلک ہتھیار بنا کر دیئے ہیں جس سے دشمن کو شدید نقصان پہنچایا جا سکتا ہے مگر اس کا انسانوں کو قید کر کے رکھنا' ان پر بہیمانہ ظلم وستم کرنا اور پھر خرگوشوں' خونخوار چوہوں اور شکاری کتوں کی ضرورت کا اخبارات میں اشتہار شائع کرانا سمجھ میں نہیں آتا ہے۔''

''وہ شاید کیمیائی ہتھیار بنا رہا ہے اور اس کا تجربہ وہ انسانوں اور جانوروں پر بھی کرتا ہے۔'' جمال نے جواب دیا۔ ''یہ جگہ اس کی شخصیت اور لیبارٹری بے حد خطرناک اور پراسراری ہے۔ اس کی لیب کو اور اسے اس دنیا سے دفع کرنے کے لئے ایک بڑے آپریشن کی ضرورت ہے یا پھر کسی جیمز بانڈ کی ضرورت ہے اور ایسے جدید ترین اسلحے کی بھی جو امریکی ایکشن اور جاسوسی فلموں میں دکھایا جاتا ہے۔ جدید ترین اور مہلک قسم کے ہتھیار تو پیسہ خرچ کرنے پر مل جاتے ہیں مگر یہ جیمز بانڈ کہاں سے آئے گا؟ کون بنے گا؟''

''میں۔'' سپنا نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا۔ ''اللہ نے چاہا تو میں جیمز بانڈ سے کہیں زیادہ اہل ثابت ہوسکتی ہوں۔''

''تم۔'' جمال نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ''حقیقی دنیا میں جیمز بانڈ بننا بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ دشمن کس قدر ظالم اور سفاک ہے اس کا تمہیں اندازہ ہے۔ مافیا سے ٹکر لینا اتنا آسان نہیں ہے جیسا تم سوچ رہی ہو۔''

''فتح وشکست کے لئے تقدیر کے ساتھ ساتھ تدبیر بھی لازمی ہے۔ کیا تدبیر سے اسے کیفر کردار تک نہیں پہنچایا جا سکتا ہے۔''

''خدانخواستہ تمہیں کچھ ہو گیا تو میں کیا کروں گا؟ کہاں جاؤں گا؟'' وہ فکرمندی سے بولا۔ ''تمہیں اپنی جان جوکھوں میں ڈالنے کی حماقت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ کام انسپکٹر رشید چودھری کے سپرد کر دیں گے۔ یہ شخص جیمز بانڈ سے کسی طرح کم نہیں ہے۔''

''مجھے کچھ ہو گیا تو تم دوسری شادی کر لینا۔'' سپنا کھلکھلا کر ہنس پڑی اور اسے شوخ نظروں سے دیکھنے لگی۔ ''میری طرف سے اجازت ہے۔''

جمال نے نیو اسکاٹن کی جس عمارت کی پہلی منزل پر فلیٹ کرائے پر لیا تھا اس کی دوسری منزل پر وقار حسین نے بھی فلیٹ لے رکھا تھا۔ جمال اور سپنا کے بارے میں کسی کو یہ نہیں معلوم تھا کہ یہ وقار حسین اور رقیہ خانم کی بیٹی اور داماد ہیں۔ اسی لئے وہ آزادانہ گھوم پھر

رہے تھے مگر وقار حسین اور رقیہ خانم بہروپ بھر کے رہ رہے تھے۔ ان پر یونیورسٹی کے پروفیسر کا دھوکہ ہوتا تھا۔ وہ اس بہروپ میں اس وقت تک رہنا چاہتے تھے تاوقتیکہ یہ باقی سات شیطان اپنے عبرتناک انجام کو پہنچ نہیں جاتے۔ وقار حسین اور رقیہ خانم بے حد محتاط تھے۔ انہوں نے پڑوسیوں سے ربط ضبط نہیں رکھا تھا۔ اس لئے کہ تینوں شیطانوں کے صفحہ ہستی سے مٹ جانے کے بعد باقی تمام شیطان بہت ہوشیار اور چوکنا ہو گئے تھے۔ وہ اس کی تلاش میں شکاری کتوں کی طرح بو سونگھتے پھر رہے تھے۔ ان شیطانوں نے بھی اپنی مصروفیتیں اور سرگرمیاں بہت محدود کر دی تھیں۔ اسے اس گروہ کو ختم کرنے کے لئے بہت جلدی تھی۔ اس لئے کہ اس گروہ کا سب سے خطرناک ترین بدمعاش جسے کوبرا کہتے تھے وہ اس کی تلاش میں خاک چھانتا پھر رہا تھا۔ اس سے زیادہ سفاک‘ بے رحم اور درندہ صفت شخص دنیا میں کوئی اور نہیں ہو سکتا تھا۔ یوں تو ہر بدمعاش اور مجرم شقی القلب ہوتا تھا مگر کوبرا جیسا درندہ کہیں نہیں دیکھا تھا‘ سنا نہیں تھا۔ بیس بائیس برس پہلے اس نے ایک موقع پر جو خونریزی اور دہشت گردی کی تھی وہ اسے آج تک نہیں بھولا تھا۔ اس نے نجانے کتنے آدمیوں کو جانوروں کی طرح ذبح کر دیا تھا۔ وہ آج بھی اس بہیمانہ اور لرزہ خیز قتل و غارت گری کے واقعات کو یاد کرتا تو اس کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ اس کا خیال تھا کہ کوبرا زندہ نہیں ہے۔ اس لئے کہ جب وہ بیس برس کے بعد وطن واپس آیا تو اسے کوبرا کی صورت کہیں دکھائی نہیں دی تھی۔ اس نے وہ جگہیں بھی چھان ماری تھیں جہاں وہ شباب اور شراب سے دل بہلاتا تھا۔ اس کی بیوی اور بچی کا بھی پتا نہیں چل سکا تھا۔ دو باتیں ہو سکتی تھیں۔ اسے کسی حریف تنظیم نے قتل کر دیا ہو گا یا وہ کسی وجہ سے ملک چھوڑ کر چلا گیا ہو گا۔ اپنی بیوی اور بچی کو بھی لے گیا ہو گا۔ انعام الحق کے قتل کے بعد اس نے سکون کا سانس لیا تھا کہ اب اس کے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ دور ہو گئی ہے مگر جب اس نے کوبرا کو ایک ہوٹل سے نکلتے ہوئے دیکھا تو اس نے اپنے رگ و پے میں سردی کی لہر اترتی ہوئی محسوس کی تھی۔ یہ ہوٹل گورنر کی ملکیت تھا۔ وہ شاید اس ہوٹل میں اپنا دل بہلانے آیا تھا۔ مشن کی کامیابی کے لئے ضروری تھا کہ اسے راستے سے ہٹا دیا جائے۔

وہ جس روز درختوں پر چڑھ کر اس لیبارٹری کے محل وقوع اور اس کے احاطے کے اندر کی تصویریں اتار رہا تھا اس نے کوبرا کو بنگلے کے برآمدے میں بیٹھے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ ڈاکٹر کریم سے باتیں کر رہا اور چائے پی رہا تھا۔ وہ چار روز تک دور تک مار کرنے والی جدید

ترین رائفل لے کر ایک درخت پر صبح سے شام تک بیٹھا رہا کہ وہ دونوں ایک ساتھ یا اکیلے دکھائی دیں تو شوٹ کر دے مگر ایک بھی اسے دکھائی نہیں دیا۔ جیسے انہیں ان کی چھٹی حس نے خطرے سے آگاہ کر دیا تھا اور انہوں نے باہر بیٹھنا اس لئے بند کر دیا ہو۔

وقار حسین کو آج ایک موہوم سی امید تھی کہ کوبرا سے آج اس کی مڈبھیڑ ہو جائے گی۔ وہ اس ہوٹل کے باہر سرِشام پہنچ گیا جہاں اس نے کوبرا کو دیکھا تھا۔ اسے کوبرا کا رات دس بجے تک انتظار کرنا پڑا تھا۔ وہ مرسڈیز میں آیا تھا۔ گاڑی کو پارکنگ لاٹ پر کھڑی کر کے اترا تو اس نے دیکھا وہ عمدہ تراش کے نفیس سوٹ میں ملبوس تھا۔ کوبرا اندر داخل ہو کر سیدھے لفٹ کی طرف بڑھ گیا۔ جب وہ لفٹ سے اوپر چلا گیا تو اس نے ایک پورٹر کی مٹھی گرم کر کے معلوم کر لیا کہ کوبرا کس کمرے میں ٹھہرا ہوا ہے۔

کوبرا کو قتل کرنا اتنا آسان نہیں تھا۔ اس نے سوچا کہ اسے کوبرا سے دو ایک باتیں کر لینا چاہیے۔ اسے سمجھانے کی ایک کوشش کرنا چاہیے کہ وہ زندگی کے آخری حصے میں ہے۔ اب اسے اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کر لینا چاہیے۔ یہ کفارہ اسی صورت میں ادا ہو سکتا ہے کہ وہ سات شیطانوں کو موت کی نیند سلا دے۔ شاید کہ اس کے دل میں اتر جائے میری بات۔ یہ سوچ کر اس نے ہوٹل کے ایک پبلک ٹیلیفون بوتھ سے ہوٹل کو ٹیلیفون کر کے کوبرا سے رابطہ قائم کیا۔ کوبرا نے جیسے ہی ریسیور اٹھا کر بڑی ناگواری سے ''ہیلو'' کہا تو وہ بولا...... ''کوبرا! میں وقار حسین بول رہا ہوں۔ تم مجھے بھولے تو نہیں ہو گے؟''

''وقار حسین!'' وہ چونک کر بولا۔ ''مجھے امید تھی کہ تم ایک روز ضرور میرے مقابلے پر آؤ گے مگر یہ تم ٹیلیفون کس لئے کر رہے ہو؟ تم میرے کمرے میں کیوں نہیں آ گئے؟ مجھے تمہاری تلاش ہے۔ میں صرف تمہیں ٹھکانے لگانے کے لئے خاص طور پر بنکاک سے آیا ہوں۔''

''کبھی تم اور ہم دوست تھے تمہیں شاید یاد ہو کہ نہ یاد ہو۔'' وقار حسین نے جواب دیا۔ ''میں چاہتا تو تمہیں پارکنگ لاٹ پر شوٹ کر سکتا تھا مگر میں دشمن کو چھپ کر ختم کرنے کا قائل نہیں ہوں۔ میں نے سوچا کہ تمہیں ختم کرنے کی بجائے ایک مخلصانہ مشورہ دوں کہ تم اب اپنے گناہوں' بربریت اور درندگی کا کفارہ سات شیطانوں کو ختم کر کے ادا کرو۔ اس لئے کہ آج نہیں تو کل تمہیں قبر کی گہرائی میں لیٹنا ہے۔ اوپر والے کو حساب دینا ہے۔''

''کیا تم نے بھی تبلیغ کا کام شروع کر دیا ہے۔'' کوبرا طنزیہ لہجے میں بولا۔ ''یہ

بات تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں اوپر والے پر یقین نہیں رکھتا ہوں۔ میرے نزدیک مذہب ایک فراڈ ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو میں سینکڑوں انسانوں کو ذبح یوں کرتا جو میرے ہم مذہب تھے۔''

''کوبرا! شاید تم اس وقت نشے میں ہو۔'' وقار حسین نے کہا۔ ''میرے لئے یہ بات بڑی حیران کن ہے کہ تم نے انسانیت سوز مظالم کئے۔ حالانکہ ایک معصوم بچی کے باپ تھے۔ مجھے تمہاری دو سالہ بیٹی گلنار آج بھی یاد ہے جسے تم دنیا میں سب سے زیادہ چاہتے تھے۔ میں تمہاری اس معصوم بچی کا حوالہ دیتا ہوں کہ اب تو ہوش میں آؤ۔ ڈاکٹر کریم کو نیست و نابود کر دو جس نے بربریت کی انتہا کر دی ہے۔''

''تم مجھے ورغلانے کی کوشش کر رہے ہو وقار حسین!'' وہ ہنسا۔ اس کی ہنسی بڑی عجیب' کھوکھلی اور ویران سی تھی۔ ''میں تمہاری ان باتوں میں نہیں آنے کا۔ تم نے مجھے کیا سمجھ رکھا ہے۔ میں اس تنظیم اور ڈاکٹر کریم سے کیسے نمک حرامی کر سکتا ہوں۔ میں تئیس برس سے ان کا نمک کھا رہا ہوں۔ مجھے تمہارے قتل کا معاوضہ دس لاکھ ٹاکا دیا گیا ہے۔ میں بغیر معاوضے کے قتل نہیں کرتا ہوں۔ اس لئے کہ اس سے ثواب نہیں ملتا ہے۔ میں نے تمہارے قتل کے لئے پانچ پیشہ ور قاتلوں کی خدمات حاصل کی ہیں۔ تم میرے پھیلائے ہوئے جال سے بچ کر نکل نہیں سکتے ہو۔''

''تم مجھے یہ سب کچھ کس لئے بتا رہے ہو؟'' وقار حسین نے متاثر ہوئے بغیر کہا۔ ''کہیں اس لئے تو نہیں کہ تمہارے دل میں کسی کونے میں میری دوستی کی رمق موجود ہے یا پھر تم مجھے خوفزدہ کر رہے ہو کہ میں یہ ملک چھوڑ کر فرار ہو جاؤں۔''

''تم اتنے بھولے تو نہیں ہو وقار حسین!'' وہ بولا...... ''میں خود بھی یہی چاہتا ہوں کہ تم بزدلوں کی طرح اس ملک کو خیر باد کہہ دو۔ جہاں سے آئے ہو وہاں واپس چلے جاؤ۔ ویسے بھی مجھے اس کی امید نہیں ہے کہ تم اب واپس جا سکو۔ تم جس بہروپ میں ہو وہ میرے آدمی کو دھوکہ نہیں دے سکتا ہے۔ وہ تمہارے لئے چشم براہ ہیں۔ صرف تین دن میں تمہیں موت کے گھاٹ اتر دیا جائے گا۔''

''میں موت سے نہیں ڈرتا ہوں اور نہ ہی میں تم سے زندگی کی بھیک مانگوں گا۔'' وقار حسین نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''فقط میری آرزو یہ ہے کہ میں ان سات شیطانوں کو ختم کر دوں جنہوں نے درندوں کو بھی شرمندہ کر دیا ہے۔ ڈاکٹر کریم کا نام سرفہرست تھا لیکن

جب سے تمہیں دیکھا ہے تب سے تم سرفہرست ہو۔ اس کے باوجود میں نے تمہیں سمجھانے اور راہ راست پر لانے کی ایک کوشش کی مگر تم اس کے لئے تیار نہیں ہو۔ تمہارا جو انجام بھی ہو گا وہ میرے ہاتھوں ہو گا۔ ہم پھر سے ایک دوسرے کی جان کے دشمن ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ پہلے کون ایک دوسرے کا خون پیتا ہے۔"

"اگر میں تمہارے ہاتھوں مارا گیا تو مجھے خوشی ہو گی کہ میں نہ صرف ایک بہادر شخص بلکہ اپنے محسن کے ہاتھوں مارا گیا۔" کوبرا بولا۔ "میں تمہارا وہ احسان آج تک نہیں بھولا ہوں جو تم نے میری بیوی کو اپنا خون دے کر اسے اور میری بچی کو بچایا تھا ورنہ یہ زچگی ماں اور بیٹی کے لئے موت کا باعث بن جاتی۔ اس کے باوجود میں تمہارے خون کا پیاسا ہوں۔ میں اس احسان کا کوئی بدلہ نہیں دے سکتا ہوں۔"

وقار حسین نے اس کی بات کا جواب دیئے بغیر ریسیور رکھ دیا۔ کوبرا کو مزید گفتگو اور سمجھانے سے کچھ حاصل نہیں تھا۔ اس پر تو قتل کا جنون سوار تھا۔ دس لاکھ ٹاکا کے بھاری معاوضے کے لالچ نے اسے اور بے رحم اور سفاک بنا دیا تھا۔ اس کے نزدیک پیسہ ہی تو سب کچھ تھا۔

O.....O.....O

آج ہائی کورٹ میں نسیمہ نسرین کے قتل کے کیس کے مقدمے کا فیصلہ سنایا جانے والا تھا جو گزشتہ دو برسوں سے چل رہا تھا۔ نسیمہ نسرین ڈھاکہ یونیورسٹی کی نہ صرف بے حد ذہین طالبہ تھی بلکہ بے حد حسین و جمیل بھی تھی۔ اس کا تعلق ایک سیاسی پارٹی سے بھی تھا۔ وہ جس پارٹی میں تھی وہ برسر اقتدار پارٹی کی سب سے بڑی حریف پارٹی تھی۔ نسیمہ نسرین ایک نوجوان لیڈر کی حیثیت سے بہت تیزی سے ابھر رہی تھی۔ اس نے جو مقبولیت حاصل کی تھی وہ بڑی حیران کن تھی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اسے فن تقریر پر بڑا عبور حاصل تھا اور اس کا شمار بہترین مقررہ میں ہوتا تھا۔ بحث و مباحثے میں اول آتی تھی۔ اسے اس میدان میں کوئی شکست دے نہیں سکا تھا۔ اس کی کامیابی میں اس بات کا بھی بڑا دخل تھا کہ وہ نفسیات کے مضمون کی طالبہ تھی۔ وہ عوام کی نفسیات اور ان کے مسائل سے پوری طرح واقف تھی۔ وہ جب بھی اسٹیج پر آتی تھی تو صرف اس کی تقریر ہی نہیں بلکہ اس کا حسن بھی سامعین کو پاگل بنا دیا تھا۔ لوگ اسے سننے سے زیادہ دیکھنے کے لئے آتے تھے۔

گورنر کا بیٹا ظہیر الدین جو ایک نمبر کا بدمعاش اور آوارہ تھا جس کے نزدیک کسی

ی عزت و آبرو کوئی وقعت نہیں رکھتی تھی جس نے کئی زندگیوں کو تباہ و برباد کیا تھا اس نے نسیمہ نسرین کو اپنا رشتہ بھیجا تو نسیمہ نسرین نے صاف انکار کر دیا جس پر اس نے طیش میں آ کر نسیمہ نسرین کو اپنے دو ساتھیوں کی مدد سے اغوا کر کے نرائن گنج کے ایک بنگلے میں دس بارہ دن تک رکھا۔ وہ وہاں سے کسی نہ کسی طرح فرار ہو کر گھر پہنچی۔ نسیمہ نسرین کے باپ نے ظہیر الدین کے خلاف رپورٹ درج کرانا چاہی تو اسے دھکے دے کر نکال دیا گیا۔ دوسرے دن رات کے وقت ظہیر الدین اور اس کے دو ساتھیوں نے نسیمہ نسرین کے گھر میں گھس کر اسے قتل کر دیا اور اس کے گھر والوں کو زخمی کر دیا۔ پریس اور عوام کے شور مچانے پر پولیس نے ظہیر الدین اور اس کے دونوں ساتھیوں کو اس کے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا پھر وہ تیسرے دن رہا ہو گئے۔ لوئر کورٹ میں مقدمہ ایک برس تک چلتا رہا۔ ظہیر الدین اور اس کے ساتھیوں کو عدالت نے عدم ثبوت کی بناء پر رہا کر دیا۔ پھر یہ مقدمہ ہائیکورٹ میں گیا۔ ایک سال تک یہاں بھی چلتا رہا تھا۔

وقار حسین کو اندازہ تھا کہ اس مقدمے کا فیصلہ کیا ہو گا۔ اس لئے کہ جج بابر علی کا تعلق بھی دس شیطانوں سے تھا اور خود گورنر بھی اسی تنظیم سے تھا۔ وہ اس کے بیٹے کے خلاف کسی قیمت پر فیصلہ نہیں دے سکتا تھا۔ پوری قوم کی نظریں اس مقدمے پر لگی ہوئی تھیں۔ عوام کا مطالبہ تھا کہ ظہیر الدین اور اس کے دونوں ساتھیوں کو سرعام پھانسی پر لٹکا دیا جائے تاکہ عبرت حاصل ہو۔ وہ اس مقدمے کا فیصلہ سننے ہائیکورٹ پہنچا تھا۔ اسے توقع تھی کہ کوبرا بھی اس فیصلے کو سننے کے لئے آئے گا۔

عدالت کا کمرہ صبح ہی سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ وقار حسین ایک کونے میں دبکا بیٹھا تھا۔ عدالت کے کمرے میں مقتولہ کے والدین اور رشتہ دار بھی موجود تھے۔ ملزمان بھی بڑے کروفر سے اپنے وکیل کے ہمراہ داخل ہو کر کرسیوں پر براجمان ہو گئے تھے۔ وہ بڑی بے فکری، سکون اور اطمینان سے بیٹھے تھے جیسے عدالت نہیں ان کے گھر کا ڈرائنگ روم ہو۔ ان کے علاوہ یونیورسٹی کی لڑکیاں، لڑکے، سیاسی پارٹیوں کے لیڈر اور پریس کے نمائندے بھی موجود تھے۔

عدالت کی کارروائی شروع ہونے سے تھوڑی دیر پہلے کوبرا اسے نظر آیا۔ کوبرا کی نگاہ اس پر پڑی تھی مگر وہ اسے بہروپ میں ہونے کی وجہ سے پہچان نہیں سکا تھا۔ وہ اسے پہچان لیتا تو چونکتا ضرور۔ وہ جگہ نہ ملنے کے سبب دروازے کے پاس کھڑا تھا۔

عدالت کی کارروائی تھوڑی دیر کے بعد شروع ہوئی۔ عدالت نے اپنا فیصلہ پڑھ کر سنایا۔ اس نے لوئر کورٹ کا فیصلہ برقرار رکھتے ہوئے ملزمان کو شک کا فائدہ دیتے ہوئے باعزت طور پر رہا کر دیا۔ فیصلہ سنتے ہی ایک لمحے کے لئے سناٹا سا طاری ہو گیا۔ دوسرے لمحے عدالت کے کمرے میں اضطراب کی لہر دوڑ گئی پھر ایک جھنجھناہٹ سی پھیل گئی۔ مقتولہ کے والدین رونے لگے۔ عدالت میں موجود لوگوں کے چہروں سے ناپسندیدگی اور غم و غصے کا اظہار ہونے لگا۔ عدالت اپنا فیصلہ سنا ہی رہی تھی کہ مقتولہ کا بھائی اپنی جگہ سے نکلا اور اس نے اچانک اپنی جیب سے پستول نکال کر بجلی کی سی سرعت سے ملزمان کو گولیوں کا نشانہ بنایا۔ اس نے پے در پے پانچ فائر کئے۔ آخری گولی اس نے جج پر چلائی۔ اس کا نشانہ چوک گیا۔ جج بال بال بچ گیا۔ پولیس نے اسے فوراً ہی دبوچ لیا۔ عدالت کے کمرے میں ایک بھگدڑ سی مچ گئی۔ عورتوں کی چیخیں نکل گئیں۔ ملزمان شدید زخمی ہو گئے تھے ان کے زخموں سے خون بہہ رہا تھا۔ لوگ عدالت کے کمرے سے نکل کر راہداری میں لپک رہے تھے۔ دہشت اور خوف و ہراس پھیل گیا تھا۔ گولیاں چلنے کی آواز سن کر دوسرے کمروں سے لوگ نکل نکل کر اس کمرے کی طرف آ رہے تھے۔ وہ بھی عدالت کے کمرے سے نکل آیا۔

وقار حسین نے باہر نکل کر کوبرا کو دیکھا تو وہ کہیں دکھائی نہیں دیا تھا۔ گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب ہو گیا تھا۔ جس وقت وہ اپنی گاڑی پارکنگ لاٹ سے نکال کر سڑک پر لایا ایک عورت نے ہاتھ کے اشارے سے لفٹ مانگی۔ اس نے عورت کے بشرے سے محسوس کیا کہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ وہ نڈھال سی ہو رہی تھی۔ وہ تیس بتیس برس کی عمر کی عورت تھی۔ اس نے میک اپ کیا ہوا تھا۔ اس کے بال گردن تک نفاست سے ترشے ہوئے تھے۔ وقار حسین نے گاڑی روکی تو وہ پچھلا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گئی اور دروازہ بند کرتی ہوئی بغیر کسی تمہید کے کہنے لگی۔ ''میری ذہنی حالت بہت خراب ہو رہی ہے ایسا لگ رہا ہے کہ کہیں میرا نروس بریک ڈاؤن نہ ہو جائے۔ پلیز! آپ مجھے میرے گھر چھوڑ دیں۔''

وقار حسین نے گاڑی سڑک پر لاتے ہوئے پوچھا۔ ''آپ کہاں رہتی ہیں؟''

''دھان منڈی۔'' اس نے اپنا سر سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔ ''اسٹریٹ نمبر 7۔''

''کیا آپ یہاں کسی کیس کے سلسلے میں آئی تھیں؟'' وقار حسین نے دریافت

کیا۔

''جی ہاں، میں نسیمہ نسرین کے کیس کا فیصلہ سننے کے لئے آئی تھی۔'' اس نے اپنی آنکھیں کھول کر جواب دیا۔ ''وہ میری چھوٹی بہن کی سہیلی تھی۔ میری بہن لندن میں ہے۔ عدالت کے فیصلے نے میرے دل کو شدید صدمہ پہنچایا ہے۔ کتنا اچھا ہوتا ملزمان سمیت جج بھی زخمی ہو جاتا۔ خدا کرے ملزمان میں سے ایک بھی زندہ نہ بچے۔''

''مجھے بھی آپ کے خیالات سے اتفاق ہے اور میں آپ کا ہمنوا بھی ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''یہ سامراجی قانون ہے۔ یہ کیس سیدھا سادا اور صاف اور واضح تھا لیکن عدالت نے انصاف نہیں کیا۔''

ایسی باتوں میں راستہ کٹ گیا۔ وقار حسین نے جب اس کے گھر کے سامنے گاڑی روکی اور اتر کے پچھلے دروازہ کھولا تو وہ عورت اس کی طرف ملتجیانہ نظروں سے دیکھتی ہوئی بولی۔ ''میری حالت ایسی نہیں ہے کہ میں چل کر اندر جا سکوں۔ آپ برا نہ مانیں تو مجھے سہارا دے کر اندر پہنچا دیں پلیز۔''

اس کا گھر چار سو گز کا بنگلہ تھا۔ وقار حسین اسے سہارا دے کر اندر تک لے آیا۔ اسے یہ بنگلہ پراسرار سا لگا۔ اندر کوئی نہ تھا۔ وہ نشست گاہ میں پہنچ کر بولی۔ ''گھر میں ملازم اور میری ماں بھی نہیں ہے۔ یہ دونوں گھر کھلا چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔ آپ مجھے بیڈ روم میں پہنچا کر چلے جائیں۔''

جس وقت وہ عورت کو سہارا دیتے ہوئے بیڈ روم میں لے کر پہنچا تو اس کی چھٹی حس بیدار ہو گئی۔ اس نے محسوس کر لیا تھا کہ عورت اداکاری سے کام لے رہی ہے پھر اسے یک لخت احساس ہوا کہ یہ عورت کوبرا کی ساتھی معلوم ہوتی ہے۔ ماضی میں کوبرا اپنے دشمن کو عورت کے ذریعے پھانس کر موت کے منہ میں اتارتا تھا۔ عورت پلنگ پر بیٹھ گئی۔ وہ جانے کے لئے مڑا تو عورت دیوار گیر گھڑی کی طرف دیکھتی ہوئی بولی۔ ''پلیز! آپ بیس منٹ اور رک جائیں۔ میری ممی آتی ہوں گی۔''

''ممی یا کوبرا؟'' وقار حسین کے منہ سے بلا ارادہ نکل گیا۔

عورت بری طرح چونک پڑی۔ اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ 'تم نے کیسے پہچان لیا کہ مجھے کوبرا نے......''

''میرے لئے ایسی باتوں کا جاننا کچھ مشکل نہیں ہے۔'' وہ بولا۔ ''کوبرا آئے تو

کہہ دینا کہ وہ مردوں کی طرح سامنے آ کر لڑے۔''

عورت نے اپنی گود میں رکھے ہوئے پرس سے سرعت سے پستول نکالا جس میں سائلنسر لگا ہوا تھا اور اس نے وقار حسین کا نشانہ لے کر فوراً ہی گولی چلا دی۔

چونکہ اس گولی پر وقار حسین کا نام لکھا ہوا نہیں تھا اور اس عورت نے بیٹھے بیٹھے اس پر عجلت سے گولی داغ دی تھی اس لئے اس کا نشانہ چوک گیا تھا۔ اب وہ بیمار نہیں بلکہ ایک صحت مند اور چاق و چوبند عورت لگ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر کمزوری اور بیماری کا دور دور تک نام و نشان نہ تھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات یک لخت بدل گئے تھے اس کے چہرے پر ایک پیشہ ور قاتل کی سی درندگی تھی اور آنکھوں میں وحشیانہ چمک تھی۔ وقار حسین نے ایک پل کے ہزارہویں حصے میں ادھر ادھر دیکھا کہ اسے کوئی چیز مل جائے جسے وہ ڈھال بنا سکے۔ جیب سے ریوالور نکالنے کے لئے ایک پل کی مہلت چاہیے تھی۔ اس کی مہلت مل نہیں سکتی تھی اور مہلت کی کوئی صورت بھی نہ تھی۔ ایک پل بھی اس کے لئے موت کا باعث بن جاتا جتنی دیر میں عورت ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی اس سے کم وقت میں وقار حسین نے تپائی کو الٹ کر اسے ہاتھوں میں اٹھا لیا۔ اس پر رکھی ہوئی چیزیں فرش پر گر کر بکھر گئیں۔ عورت نے بغیر کسی تاخیر کے پے در پے فائر کئے۔ ایک گولی وقار حسین کے بازو کے پاس سے سنسناتی ہوئی گزر گئی۔ دوسری گولی تپائی کے کنارے کو چھوتی ہوئی سنگھار میز کے بڑے آئینے پر جا لگی۔ کرچیاں فرش پر بکھر گئیں۔

وقار حسین کو اب اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ کوئی عام عورت نہیں ہے جس کے ہاتھ میں پستول دے کر کہہ دیا گیا ہو کہ یہ کھلونا ہے اس سے تم کھیلو۔ یہ عورت تربیت یافتہ لگ رہی تھی۔ اسے پستول چلانا آتا تھا۔ اس کا نشانہ بھی اچھا تھا۔ عجلت کی وجہ سے اس کے نشانے چوک گئے تھے۔ عورت کا ایک اچھا نشانہ باز ہونا تعجب کی بات نہ تھی۔ آج عورت نے زندگی کے ہر شعبے میں قدم رکھ کر مردوں کے شانہ بشانہ چلتے ہوئے صرف گاڑی چلانا ہی نہیں سیکھا تھا بلکہ اسلحہ چلانے میں بھی مہارت حاصل کر رہی تھی۔ منشیات اور پیشہ ور مجرموں کی تنظیموں میں ایسی تربیت یافتہ عورتوں کی کوئی کمی نہ تھی۔ انہیں سب سے پہلے اسلحہ کے استعمال کی تربیت دی جاتی تھی تاکہ وہ راستے کی رکاوٹوں کو آسانی سے دور کر سکیں۔ یہ عورت کسی پیشہ ور قاتل کی طرح سفاک اور بے رحم تھی۔ اسے ایسی عورتوں اور واقعات سے واسطہ پڑ چکا تھا۔ اس نے اس پر تپائی کھینچ ماری جو عورت کے منہ پر جا لگی۔ تپائی کو روکنے کی کوشش میں عورت

کے ہاتھ سے پستول چھوٹ کر فرش پر گر پڑا۔ وہ کوندا بن کر اس کے سر پر جا پہنچا۔ عورت سنبھلنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وقار حسین نے اس کے عین سامنے کھڑے ہو کر اس کے منہ پر پوری قوت سے ایک زوردار تھپڑ رسید کیا تو ایسا لگا جیسے شب برات کا پٹاخہ چھوٹ گیا ہو۔ عورت کا پورا بدن جھنجھنا اٹھا۔ وہ الٹ کر بستر پر بکھر گئی۔ وہ اس انتظار میں کھڑا رہا کہ عورت نے اٹھنے کی کوشش کی تو اسے بالوں سمیت پکڑ کے اس کے منہ پر دو تین زوردار تھپڑ رسید کر دے گا۔ اس کے لئے تھپڑ ہی کافی ہوں گے۔ عورت نے اٹھنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ بستر پر اوندھے منہ پڑی تھی اور سسکنے لگی تھی پھر اس نے اپنے جسم کو گھسیٹ کر اپنا چہرہ تکئے میں چھپا لیا اور دونوں ہاتھ تکئے کے نیچے دے دیئے۔ وقار حسین نے جھک کر فرش پر سے عورت کا پستول اٹھا لیا۔ ابھی اس میں دو تین گولیاں بچی ہوئی تھیں۔

وقار حسین دو تین قدم پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا تا کہ وہ باہر نکل کر دروازہ بند کر کے جتنا جلد ہو سکے یہاں سے نکل جائے۔ کوبرا یا اس کا کوئی بھی آدمی دس منٹ کے اندر پہنچنے والا تھا۔ ظاہر تھا جو بھی آنے والا تھا وہ غیر مسلح آنے سے رہا تھا۔ وہ عورت پر نگاہ رکھے ہوئے آہستہ آہستہ پیچھے ہٹتا ہوا دروازے پر پہنچا تھا کہ ٹھٹھک کے رک گیا۔ اس نے عورت کو تکئے کے نیچے سے کوئی چیز غیر محسوس انداز سے نکالتے دیکھ لیا تھا۔ عورت نے بجلی کی سی سرعت سے اٹھ کر اس کا نشانہ لیا اور اسی سرعت سے اس پر دو دھاری چھ انچ لمبا چاقو پوری قوت سے کھینچ مارا۔ وہ فوراً اپنی جگہ سے ہٹ نہ جاتا تو یہ چاقو اس کے سینے میں پیوست ہو جاتا۔ یہ چاقو زہر میں بجھا ہوا تھا۔ وہ ایسے مہلک ہتھیاروں کو خوب پہچانتا تھا۔ قاتلوں اور مجرموں کے پاس ایسے ہی چاقو اور خنجر ہوتے تھے۔ اس چاقو پر تو فرشتہ اجل نے کسی اور کا نام لکھا ہوا تھا۔ اس کے عقب میں ایک بدمعاش جو اپنے ہاتھ میں زہر آلود خنجر لئے غیر محسوس انداز سے دبے پاؤں اس پر حملہ کرنے کے لئے بڑھ رہا تھا اس کے سینے میں یہ چاقو تیر کی مانند پیوست ہو گیا۔ اس بدمعاش کے حلق سے ایک کراہ نکلی۔ اس کے ہاتھ سے خنجر چھوٹ کر گر پڑا۔ دوسرے لمحے وہ بھی فرش پر آ رہا۔ اس نے چاقو اپنے سینے سے نکال کر پھینک دیا لیکن وہ سنبھل نہ سکا۔ خون کا فوارہ ابل پڑا۔ وہ اپنا سینہ دبائے فرش پر زخمی پرندے کی طرح چند سیکنڈ تک لوٹتا رہا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کا جسم مفلوج ہوتا گیا اور چند سیکنڈ ہی میں موت کی آغوش میں چلا گیا۔

عورت دہشت سے پھٹی پھٹی نظروں سے یہ منظر دیکھ رہی تھی۔ اس کا چہرہ سفید پڑ

گیا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا اس کے بدن میں ایک قطرہ خون بھی نہیں رہا ہے۔ اس پر سکتے کی سی کیفیت طاری تھی اور اپنی جگہ بے حس و حرکت بیٹھی عورت لگ رہی تھی۔

''تمنے کیا دیکھا' کیا محسوس کیا اور کیا سوچ رہی ہو؟'' وقار حسین نے اسے پستول کے نشانے کی زد میں لیتے ہوئے پوچھا۔

''بازی الٹ گئی۔'' عورت کے گلے میں گولا سا اٹک رہا تھا۔ ''تم مجھے زندہ نہیں چھوڑو گے۔''

''تم نے یہ نہیں دیکھا اور محسوس کیا کہ مارنے والے سے بچانے والا بڑا ہوتا ہے؟'' وقار حسین نے کہا۔ ''زندگی اور موت اوپر والے کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔''

عورت سر ہلا کر رہ گئی۔

''تم کوبرا سے کہہ دینا کہ جب خدا کسی کی زندگی کا ضامن ہوتا ہے تو اسے دس آدمی مل کر بھی ختم نہیں کر سکتے ہیں۔'' وقار حسین سرد اور سفاک لہجے میں بولا۔ ''میں تمہاری اس صورت میں جان بخشی کر سکتا ہوں کہ تم مجھے صرف اتنا بتا دو کہ تم نے مجھے شناخت کیسے کیا؟''

''کوبرا نے عدالت سے باہر بتایا تھا کہ تم وقار حسین ہو اور اسے تم کسی طرح بنگلے پر لے کر پہنچو۔ تمہاری مدد کو نذر حسین پہنچ جائے گا۔'' عورت نے بتایا۔

''میں جا رہا ہوں۔'' وقار حسین نے کہا۔ ''اگر تم نے شور مچایا تو پھر میں بے دریغ تمہاری خوبصورت کھوپڑی میں سوراخ کر دوں گا۔''

وقار حسین نے کمرے سے نکل کر دروازہ بند کیا اور باہر سے کنڈی لگا دی۔ اس نے لاش کی طرف دیکھا جو زہر سے نیلی پڑ چکی تھی پھر وہ تیزی سے باہر لپکا۔ باہر نکل کر اس نے گلی کا جائزہ لیا۔ گلی سنسان اور ویران پڑی تھی۔ گاڑی میں بیٹھ کر اسٹارٹ کیا۔ گلی سے نکل کر مین روڈ پر آ کر اس نے دل میں اپنے رب کا شکریہ ادا کیا جس نے اسے ایک نئی زندگی عطا کی تھی۔

☆......☆......☆

انسپکٹر رشید چودھری نے میک اپ کر کے بھیس بدلا۔ یہ پہلی بار تو اس نے بہروپ نہیں بھرا تھا۔ اسے کئی بار مجرموں کو پکڑنے کے لئے نجانے کس کس کا بہروپ بھرنا پڑتا تھا۔ وقار حسین نے اسے بتایا تھا کہ جب بھی کسی پولیس افسر کا کسی دوسرے شہر سے یہاں تبادلہ ہوتا ہے تو اس کی تصویر اور کوائف شیطانوں کے پاس پہنچ جاتے ہیں۔ وہ تین خوفناک شکاری کتوں اور دس بارہ بلی کے جسامت جیسے خونخوار چوہوں کو لے کر ڈاکٹر کریم کی لیبارٹری پر پہنچا تو وقار حسین کا خیال درست نکلا۔ ڈاکٹر کریم نہ تو اس کے سامنے آیا تھا اور نہ ہی ان جانوروں کا سودا طے کیا بلکہ کوبرا نے گیٹ سے باہر خریداری کی تھی۔ اس کے علاوہ جو لوگ بھی جانور لے کر پہنچے تھے ان کے ساتھ ایسا ہی ہوا تھا۔ اسے اندر کی ایک جھلک بھی نظر نہ آ سکی تھی۔ تاہم وہ کسی نہ کسی طرح اس جگہ کے محل وقوع کا اچھی طرح سے جائزہ لے کر آ گیا۔

جمال، سپنا اور انسپکٹر رشید چودھری نے جو ڈاکٹر کریم کی لیبارٹری کے محل وقوع کا جائزہ لیا تھا اور وقار حسین نے اپنے کیمرے سے جو تصویریں کھینچی تھیں ان کی مدد سے ایک نقشہ اور آپریشن کلین اپ کا نادر منصوبہ بنا لیا تھا۔ اس لیبارٹری کو ڈائنامائیٹ، دستی بموں اور راکٹوں کی مدد سے منٹوں میں ملبے کا ڈھیر بنایا جا سکتا تھا مگر اصل مسئلہ وہاں سے ان قیدیوں کو نکال کر لانا تھا جو ڈاکٹر کریم کے عقوبت خانے میں قید تھے۔ وقار حسین نے وہاں دو تین بڑی ویگنیں بھی دیکھی تھیں جن میں وہاں سے قیدیوں کو بھی لایا جا سکتا تھا۔ ان کے درمیان یہ طے پایا کہ قیدیوں کو وہاں سے نکالنے کے بعد اس جگہ کو بغیر کسی تاخیر کے ڈائنامائیٹ اور راکٹوں سے تباہ و برباد کر دیا جائے۔ دنیا والوں کو اس کارنامے کے بارے میں بتانے کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ آپریشن کلین اپ اسی طرح اور اسی انداز سے کرنا تھا جس طرح خفیہ ایجنسیاں کرتی ہیں۔ اس بابت عوام کو بتانے کی اس لئے بھی ضرورت نہ تھی عوام سربستہ

رازوں سے واقف نہیں تھے اور وہ ان چہروں کو پہچانتے نہیں تھے جو اپنے چہروں پر نقاب ڈالے ہوئے تھے اور وہ درندہ صفت اور انسانیت کے چہرے پر بدنما داغ تھے۔ عوام کو ان کے اصل چہرے دکھائے جاتے تو وہ یقین نہیں کرتے۔ بہتری اسی میں تھی کہ انہیں اس طرح ختم کر دیا جائے ان کی لاشیں بھی نہ ملیں۔

منصوبے کی کامیابی کا انحصار تقدیر کے ساتھ دینے پر بھی تھا۔ وقار حسین نے دو تین ایسے با اعتماد سابق سپاہیوں کی بھاری معاوضے پر خدمات حاصل کر لیں جو ڈائنامائیٹ اور راکٹوں سے اس جگہ پر حملہ کر کے اس کی اینٹ سے اینٹ بجا سکتے تھے۔ راکٹ اور ڈائنامائیٹ کلکتہ سے منگوا لئے گئے تھے۔ ٹرانسمیٹروں کی بھی سخت ضرورت تھی تاکہ ایک دوسرے سے رابطہ قائم رہے۔ جمال ہانگ کانگ سے دس بارہ ٹرانسمیٹرز خرید لایا تھا۔ ہر طرح سے اس آپریشن کلین اپ کی تیاری ہو چکی تھی۔ وقار حسین کو خوف اور دھڑکا کوبرا سے تھا۔ وہ جب تک زندہ تھا کامیابی کی ضمانت نہیں دی جا سکتی تھی۔ اس لئے کہ وہ ایک تربیت یافتہ کمانڈو تھا۔ اپنی تنظیم کے بدمعاشوں کو وہی تربیت بھی دیتا تھا۔ اس نے کوبرا کو ختم کرنے کے لئے چار پانچ دن تک اس کی بڑی تلاش کی اور صبح سے شام تک لیبارٹری کے باہر انتظار کیا۔ جب وہ باہر نہیں آیا تو یہ فیصلہ کیا گیا کہ اس سے خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ اللہ ہمارا مددگار ہے۔

☆......☆......☆

ڈاکٹر کریم سے سپنا نے ٹیلیفون کر کے ملنے کا وقت مقرر کر لیا۔ اس نے بحیثیت نمائندہ روزنامہ آفاق کے ٹیلیفون کیا تھا کہ اس کا اخبار ڈاکٹر کریم کی عظیم خدمات کو خراج تحسین پیش کرنے کے لئے ایک ضمیمہ شائع کرنا چاہتا ہے اس کے لئے اس کے انٹرویو اور اس کی اور اس کی لیبارٹری کی تصویروں کی ضرورت ہے۔ وہ روزنامہ آفاق کے نمائندے کی درخواست کو اس لئے بھی رد نہیں کر سکتا تھا کہ وہ ملک کا سب سے بڑا اخبار تھا۔ اس شیطان نے اسے رات کے کھانے پر مدعو کر لیا تھا۔ سپنا نے وقار حسین کے کہنے پر اندھیرے میں ایک تیر چلایا جو ٹھیک نشانے پر جا لگا تھا۔ اس ادارے کو اس کی ہوا بھی نہیں تھی۔ یہ پہلے صحافی تھے جنہیں یہ اعزاز بخشا گیا تھا۔

سپنا نے اپنی ایک پنڈلی پر چاقو بیلٹ سے باندھ لیا تھا اور دوسری پنڈلی پر ٹرانسمیٹر جمال نے چاقو کے بجائے پستول اور ٹرانسمیٹر پیروں سے باندھ لئے تھے تاکہ اس شیطان

سے ہونے والی گفتگو اور پیش آنے والے واقعات سے وقار حسین اور انسپکٹر رشید چودھری بھی واقف رہیں۔ جمال بحیثیت فوٹو گرافر سپنا کے ہمراہ جا رہا تھا۔

دن ڈوبنے کے بعد جب اندھیرا گہرا ہونے لگا تب رقیہ خانم اور وقار حسین نے راجرا باغ سے ان سپاہیوں کو لے لیا جنہیں ڈائنامائیٹ اور راکٹ اس منحوس لیبارٹری کے اندر اور باہر نصب کرنا تھا۔ جیداد پور پہنچے تو اندھیرا گہرا ہو گیا تھا۔ انسپکٹر رشید چودھری مقرر کردہ جگہ ان کا انتظار کر رہا تھا۔ انہوں نے اپنی اپنی گاڑیاں درختوں کے جھنڈ میں کھڑی کر دیں۔ تینوں سپاہیوں نے پہلے تو تین مختلف سمتوں میں راکٹ نصب کر دیئے پھر انہوں نے ڈائنامائیٹ کو تاروں سے جوڑنا شروع کیا۔ پھر وہ سیڑھی اور ایک موٹا سا رسہ لے کر لیبارٹری کی طرف بڑھے۔ وقار حسین اور انسپکٹر رشید چودھری بھی ان کے ہمراہ تھا وہ تینوں سپاہی یکے بعد دیگرے اندر اتر گئے۔ کوئی ایک گھنٹے کے بعد تینوں سپاہی لیبارٹری اور بنگلے کے گرد ڈائنامائیٹ رکھ کر آ گئے۔ اس وقت چونکہ پہرہ دار رات کا کھانا کھا رہے تھے اس لئے ان کا کام آسان ہو گیا تھا۔ پھر وہ لوگ اپنی جگہ واپس آ گئے۔ سپنا اور جمال کا انتظار کرنے لگے۔

سپنا اور جمال رات ٹھیک آٹھ بجے ڈاکٹر کریم کی لیبارٹری اپنی گاڑی میں پہنچے جس کے ونڈ اسکرین پر ''پریس'' کی ایک بڑی سی سلپ چسپاں تھی۔ انہیں پھاٹک پر دستک دینے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ گاڑی کے رکتے ہی اس کے انجن کی آواز سن کر اندر سے مسلح دو پہرہ دار نکل آئے اور انہوں نے سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ سپنا نے ان کے ہر سوال کا جواب دیا اور سخت لہجے میں بات کی تو پھر انہوں نے پھاٹک کے پاس اندر بنی ہوئی کوٹھڑی سے انٹر کام پر ڈاکٹر کریم سے رابطہ کیا۔ سپنا اور جمال کے دل بہت تیزی سے دھڑک رہے تھے۔ انہوں نے خود کو بمشکل تمام قابو میں کیا ہوا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد ایک شخص انہیں اپنے ہمراہ اندر لے جانے کے لئے آیا تو اسے دیکھ کر انہیں اپنے رگ و پے میں سردی کی لہر اترتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس کے چہرے پر درندگی تھی اور اس کی بڑی بڑی لال آنکھیں دیکھ کر یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ابھی ان سے خون ٹپک پڑے گا۔ ان میں تیز سفاک چمک تھی۔ وہ اپنے چہرے سے خونی اور بے حد خطرناک شخص لگ رہا تھا۔ انہوں نے اسے پہلی ہی نظر میں پہچان لیا تھا۔ یہ کوبرا تھا۔ وقار حسین نے اس کا جو حلیہ بتایا تھا اس سے وہ اسے پہچان سکے تھے۔ وقار حسین نے ان سے کہا تھا کہ اگر اسے قتل کرنے کا موقع ملا تو اسے کسی قیمت پر چھوڑنا نہیں۔ یہ وہ شخص ہے جو

انسانوں کو ذبح کرنے میں ایک بڑی عزت اور فرحت محسوس کرتا ہے۔

کوبرا' سپنا کو دیکھ کر بڑے زور سے چونکا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک ایسی عجیب سی چمک پیدا ہوئی جسے سپنا سمجھنے سے قاصر تھی۔ وہ اسے گہری اور چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگا۔ ''تمہارا نام کیا ہے؟''

''سپنا!'' سپنا کو اپنے گلے میں کوئی چیز اٹکتی ہوئی سی محسوس ہوئی۔

''سپنا!' کوبرا اس طرح سے اچھلا جیسے اسے بجلی کا شدید جھٹکا لگا ہوا۔ اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ ایک کرب سا چھا گیا۔ ''یہ کیسے ہوسکتا ہے؟''

''کیوں نہیں ہوسکتا ہے؟'' سپنا نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ ''ہزاروں لڑکیوں کے نام سپنا ہیں۔''

اس کے خوفناک چہرے پر تحیر سا غالب آ گیا۔ وہ سپنا کو پرخیال نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''اچھا تم دونوں میرے ساتھ آؤ۔''

وہ انہیں لے کر بنگلے کی سمت بڑھا۔ وہ آگے آگے چل رہا تھا۔ سپنا اور جمال چاروں اطراف کا جائزہ لینے لگے۔ سپنا نے اس احاطے کے اندر بنے ہوئے خوشنما اور سرسبز و شاداب گلستان کو دیکھا تو وہ مسحور ہوگئی۔ اس گلستان کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا تھا کہ ڈاکٹر کریم نے نہ صرف اس پر بڑی محنت کی ہے بلکہ اس کے بنانے پر پیسہ پانی کی طرح خرچ کیا ہے۔ اسے باغبانی کا جنون کی حد تک شوق تھا۔ اس نے دنیا کے کونے کونے سے پھول منگوا کر لگائے تھے۔ اس نے ایسے ایسے خوب صورت پھول اور کلیاں دیکھیں کہ اس کا جی چاہا کہ انہیں دیکھتی رہے۔ ان پھولوں کی خوشبو سے فضا مہک رہی تھی۔ مختلف رنگوں کی روشنیوں سے ان کا حسن نکھر گیا تھا۔ وہ ایک گلاب کے پودے کے پاس رک گئی تو کوبرا نے مڑ کر اسے دیکھا۔ پھر وہ سپنا کے پاس آ کر بولا۔ ''کیا تمہیں گلاب بہت پسند ہے؟''

''ہاں!'' سپنا نے جواب دیا۔ ''پھول تو عورت کا حسن ہوتا ہے۔''

''اچھا۔'' کوبرا کے چہرے پر اذیت ناک کرب چھا گیا۔ اس نے بہت سارے پھول توڑ کر سپنا کی طرف بڑھائے تو سپنا نے اپنی جھولی پھیلا دی۔

کوبرا نے انہیں بنگلے کے اندر نہایت نفاست سے آراستہ و پیراستہ نشست گاہ میں لا کر بٹھایا۔ پھر وہ اندر چلا گیا۔ سپنا نے تمام پھول تپائی پر ڈال دیئے۔ جمال نے سرگوشی میں بڑی آہستگی سے کہا۔ ''وہ تمہیں دیکھ کر بڑے زور سے چونکا تھا۔ تمہارا نام سن کر بھی۔ تم نے

نوٹ کیا؟‘‘

’’ہاں۔‘‘ سپنا خوف زدہ لہجے میں بولی۔ ’’کہیں اس نے مجھے پہچان تو نہیں لیا؟‘‘

’’شاید وہ تمہیں پہچاننے کی کوشش کر رہا ہے۔‘‘ جمال نے کہا۔ ’’تم اس کے سوالات کا بہت سوچ سمجھ کر جواب دینا۔‘‘

’’مجھے بھی ایسا ہی محسوس ہو رہا ہے۔‘‘ سپنا بولی۔ ’’اللہ مالک ہے‘ جو ہوگا دیکھا جائے گا۔‘‘

تھوڑی دیر کے بعد کوبرا ایک ٹرے اٹھائے ہوئے اندر داخل ہوا۔ اس میں ایک جگ اور دو گلاس تھے۔ جگ شربت سے بھرا ہوا تھا۔ اس نے ان دونوں گلاسوں کو باری باری شربت سے بھرا۔ سب سے پہلے سپنا کی طرف گلاس بڑھایا۔ پھر جمال کی طرف‘ پھر اس نے کہا۔ ’’آج دراصل باس نے اپنے دوستوں کو رات کے کھانے پر بلایا ہے۔ وہ اس وقت نیچے ہیں اس لئے وہ ان سے گفتگو کرنے میں مصروف ہیں۔ تھوڑی دیر میں فرصت پاتے ہی وہ انٹرویو دینے کے لئے حاضر ہو جائیں گے۔‘‘

’’کوئی بات نہیں۔‘‘ سپنا نے جواب دیا۔ ’’ہم انتظار کر لیں گے۔‘‘

’’ایک بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی ہے کہ کیا ایسا ممکن ہے کہ ایک بے حد عجیب وغریب اتفاق پیش آئے۔‘‘ کوبرا سپاٹ لہجے میں بولا۔

’’کیسا اتفاق؟‘‘ سپنا کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اس کے ہاتھ سے شربت کا گلاس چھوٹتے چھوٹتے بچا۔

’’میری ایک بیٹی تھی۔‘‘ کوبرا کہنے لگا تو اس کے چہرے پر کرب سا چھا گیا۔ اس کی آنکھوں میں سارے جہاں کا درد سمٹ آیا تھا جو ان کے لئے بڑا تعجب خیز تھا۔ ’’اس کا نام بھی سپنا تھا۔ اس کا نام میں نے نہیں میرے ایک دشمن نے رکھا تھا جب وہ میرا ساتھی اور دوست تھا۔ اس نے اپنا خون نہ دیا ہوتا تو میری بیوی اور بچی بچ نہ پاتی۔ آج میں اور وہ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہیں۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ اس کا نام سپنا ہی نہیں تھا بلکہ وہ تم سے حیرت انگیز طور پر مشابہت رکھتی تھی جیسے وہ جڑواں بہن ہو۔ تم میں اور اس میں کوئی فرق تھا تو قد وقامت کا تھا۔ وہ درمیانہ قد کی تھی۔ اگر تم اس کے قد وقامت کی ہوتیں تو میں یہ سمجھتا کہ اس نے دوسرا جنم لیا ہے۔ کیا یہ عجیب وغریب اتفاق نہیں ہے؟‘‘

’’ہاں ہے تو۔‘‘ سپنا بھونچکی سی ہوگئی۔ ’’مگر یہ کیسے ممکن ہے؟ نجانے کیوں مجھے

یقین نہیں آ رہا ہے۔'' اس کی زبان سے آخری جملہ بلا ارادہ نکل گیا۔

''اب تو تمہیں میری بات کا یقین آ جائے گا۔'' کوبرا نے توقف کر کے اپنی جیب سے بٹوا نکالا۔ اس میں سے ایک پاسپورٹ سائز کی تصویر نکال کر سپنا کی طرف بڑھائی۔ ''یہ تصویر میری سچائی کا ثبوت ہے۔ یہ دیکھو۔''

سپنا نے اس کے ہاتھ سے تصویر لے کر دیکھی وہ ششدر سی رہ گئی۔ وہ ہو بہو اس کا عکس تو نہ تھی لیکن اس سے کافی مشابہت تھی۔ کوئی بھی اسے دیکھ کر پہلی نظر میں دھوکہ کھا سکتا تھا۔ جمال نے سپنا کے ہاتھ سے تصویر لے کر دیکھی۔ ''یہ سو فیصد جڑواں بہن نہ سہی لیکن سگی چھوٹی بہن ضرور لگ رہی ہے۔''

''آپ کی بیٹی اب ہے کہاں؟'' سپنا نے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

کوبرا سوچوں کی دنیا میں بہت دور نکل گیا تھا۔ اس کے ذہن میں یادداشت کے بند دریچے ایک ایک کر کے کھلتے گئے۔ اس کا چہرہ زرد اور ستا ہوا سا لگ رہا تھا۔ وہ سپنا کی آواز سن کر چونکا۔ ''چار برس پہلے وہ بنکاک میں گاڑی کے ایک حادثے کی نذر ہو گئی۔ اس کی زندگی بچانے کے لئے ایسے گروپ کے خون کی ضرورت تھی جو نایاب تھا۔ خون وقت پر دستیاب نہ ہو سکا۔ جس وقت وہ مجھ سے روٹھی اس کی عمر سولہ برس تھی۔ اس کی جوان موت نے میری بیوی کو پاگل کر دیا۔ اس نے تیسویں منزل کی بالکنی سے چھلانگ لگا کر خودکشی کر لی۔ مگر میں زندہ رہا۔ نجانے اب تک کیوں زندہ ہوں۔''

''کیا آپ کو اپنی بیوی بیٹی سے بہت زیادہ پیار تھا؟'' جمال نے پوچھا۔ دوسرے لمحے اسے محسوس ہوا کہ اس کا سوال بڑا بچگانہ سا ہے۔

''میں نے اس دنیا میں اپنی بیوی اور بیٹی کے علاوہ کسی اور سے محبت نہیں کی۔'' ایک شقی القلب انسان کی آواز بھرا گئی۔ اس لمحے وہ سپنا کو صرف ایک باپ لگا۔ ''میں اسے یہاں سے اس لئے لے گیا تھا کہ اس پر میری گھناؤنی زندگی کا سایہ نہ پڑے۔ میں بہت برا آدمی ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ میری پیاری بیٹی کے علم میں یہ بات آئے کہ اس کا باپ اچھا آدمی نہیں ہے۔ میں نے اپنی بیٹی کی وجہ سے اپنے آپ کو یکسر بدل بھی لیا تھا۔''

سپنا اس سے کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ اس لئے کہ ڈاکٹر کریم اندر داخل ہو رہا تھا۔

کوبرا نے اسے دیکھا تو وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر وہ خاموشی سے کمرے سے نکل گیا۔ وہ اس کے استقبال کے لئے کھڑے ہو گئے۔ ڈاکٹر کریم نے نہ صرف بڑی گرمجوشی سے ان

کے سلام کا جواب دیا بلکہ مصافحہ بھی کیا۔ سپنا کو اس سے مصافحہ کرتے وقت اس کے ہاتھوں میں انسانی خون کی بو محسوس ہوئی۔ یہ قاتل کا ہاتھ تھا۔

ڈاکٹر کریم نے انتظار کی زحمت پر معذرت چاہی۔ چند لمحوں کے بعد انٹرویو کا سلسلہ شروع ہوا۔ وہ بڑی خندہ پیشانی سے ہر سوال کا جواب بڑی تفصیل سے دیتا رہا۔ انٹرویو کے دوران جمال نے اس کی مختلف زاویوں سے تصویریں اتاریں۔ سپنا نے اس کے ساتھ اپنی تصویریں بھی بنائیں۔

انٹرویو کے اختتام پر سپنا نے اپنا خوشنما سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میں نے اپنی زندگی میں ایسا خوب صورت اور مہکتا ہوا گلستان کہیں نہیں دیکھا۔ کیا آپ نے اس پر کوئی تجربہ کیا جس سے اس سے جنت کے باغ کا دھوکہ ہوتا ہے۔''

''تجربہ؟ جی ہاں۔'' ڈاکٹر کریم نے چونک کر اپنا سر ہلایا۔ پھر معنی خیز انداز سے مسکرایا۔ ''بغیر تجربے کے کچھ بھی حاصل نہیں کیا جا سکتا ہے۔ یہ تجربے کی وجہ سے ممکن ہوا ہے۔ میں نے برسوں کی تحقیق کے بعد ایک تجربہ کیا اور ایسی کھاد تیار کی جس سے یہ گلستان مہک رہا ہے۔ اس کھاد کی بدولت پھول ہر موسم میں کھلتے ہیں۔ جیسا کہ آپ نے دیکھا ہوگا کہ یہ گلاب کے پھولوں کا موسم نہیں ہے۔ مگر میرے ہاں گلاب کے پھول کھلے ہوئے ہیں اور ان کی مہک بھی قائم ہے۔ میں نے جس چیز کی کھاد تیار کی ہے اگر اسے زراعت کے لئے استعمال کیا جائے تو اس سے پیداوار میں ناقابل یقین اضافہ ہو سکتا ہے۔ سال میں چھ سات شاندار فصلیں اگا سکتے ہیں۔''

''یہ کس چیز کی کھاد ہے جس سے آپ نے باغبانی میں ایک حیرت انگیز انقلاب برپا کیا ہے؟'' سپنا نے دریافت کیا۔

''آپ میرے ساتھ تشریف لائیں میں آپ کو بتاتا ہوں۔'' ڈاکٹر کریم یک لخت اٹھ کھڑا ہوا۔

ڈاکٹر کریم انہیں اپنے ہمراہ لے کر بنگلے سے باہر آیا۔ باہر دو مسلح پہرہ دار کھڑے تھے۔ پھر وہ انہیں لیبارٹری کی طرف لے کر بڑھا تو سپنا نے دیکھا کہ اس کے احاطے میں چھ بے حد شاندار نئے ماڈل کی گاڑیاں کھڑی ہیں۔ جب وہ اندر داخل ہوئی تھی اس نے یہ گاڑیاں نہیں دیکھی تھیں۔ سپنا کو خیال آیا کہ یہ گاڑیاں ڈاکٹر کریم کے ان دوستوں کی ہیں جنہیں اس نے ڈنر پر مدعو کیا ہے۔ یہ لوگ ان کے بعد یہاں پہنچے تھے۔ ڈاکٹر کریم ان کے

ساتھ مصروف گفتگو تھا۔ اس لئے وہ نصف گھنٹہ کی تاخیر سے انٹرویو دینے آیا تھا۔

لیبارٹری کی عمارت تین منزلہ تھی۔ برآمدے کے باہر بھی دو مسلح پہرہ دار چوکنا' مستعد اور ہوشیار کھڑے تھے جیسے انہیں کسی خطرے کا اندیشہ ہو۔ وہ انہیں عمارت کے انڈر گراؤنڈ لے گیا۔ نیچے ایک بہت بڑا ہال تھا جو تیز روشنیوں سے اس وقت جگمگا اٹھا جب باہر لگے سوئچ بورڈ کے دو تین سوئچ کو ڈاکٹر کریم نے آن کیا تھا۔ اس کا ایک ہی داخلی دروازہ تھا۔ انہوں نے اس ہال میں جو منظر دیکھا اس نے ان کے جسموں پر سنسنی دوڑا دی۔ اس ہال کے اختتام تک لوہے کے دو رویہ مضبوط پنجرے بنے ہوئے تھے۔ یہ کل آٹھ پنجرے تھے۔ ہر پنجرا اتنا بڑا تھا کہ پچاس ساٹھ آدمی بآسانی اس میں آ سکتے تھے ہال میں تعفن پھیلی ہوئی تھی اس وقت صرف ایک پنجرے میں دس بارہ مرد قید تھے۔ ان کے جسموں پر چیتھڑے لٹک رہے تھے۔ ان پر گندگی اور غلاظت کے ڈھیر کا گمان ہو رہا تھا۔ ان کی وضع قطع غاروں میں زندگی گزارنے والے انسانوں جیسی تھی۔ بال بہت بڑھے ہوئے تھے۔ گھنی اور لمبی داڑھیاں تھیں۔ ان کے بالوں میں جوئیں صاف نظر آ رہی تھیں۔ وہ بھوک' تھکن اور غم سے نیم جان لگ رہے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ موت ان سے زیادہ دور نہیں ہے۔ ان کے جسموں پر کوڑوں اور ظلم و تشدد کے نشانات آبلوں کی شکل میں دکھائی دے رہے تھے۔

''ڈاکٹر کریم!'' سپنا نے انجان بن کر اس سے خوفزدہ لہجے میں پوچھا۔ ''یہ کون لوگ ہیں؟ انہیں یہاں کس لئے قید کیا گیا ہے؟''

''یہ وہ لوگ ہیں جنہیں میں نے رحم کھا کر طوفان اور سیلاب سے مرنے سے بچایا۔'' ڈاکٹر کریم نے سرد اور سفاک لہجے میں جواب دیا۔

''مگر ان کی حالت تو جانوروں سے بھی بدتر ہے۔'' سپنا کی زبان سے غیر اختیاری طور پر نکل گیا۔ ''انہیں انسانیت سوز حالت میں کس لئے رکھا گیا ہے؟''

''میں نے انہیں اس لئے اس طرح رکھا ہے کہ ان پر تجربے کر سکوں۔'' وہ کندھے اچکا کر بولا۔

''مگر آپ نے ہمیشہ تجربہ خرگوشوں اور چوہوں پر کیا ہے۔'' سپنا لرز کر بولی۔ ''انسانوں پر کس قسم کے تجربے کرتے ہیں۔''

''میں انسانوں اور جانوروں پر بیک وقت تجربے کرتا ہوں۔'' اس کا لہجہ سپاٹ اور ہر قسم کے جذبات سے عاری تھا۔ ''میرا خیال ہی نہیں بلکہ یقین ہے کہ انسان سے بہتر

چیز اس دنیا میں تجربے کے لئے کوئی نہیں ہے۔ ہمارے دیش میں مطلوبہ جانوروں کا حصول بڑا مشکل ہے اور وہ بہت مہنگے پڑتے ہیں جبکہ انسان بہت ارزاں ہے اور اس کا حصول بھی آسان ہے۔ اسی لئے میں انسانوں کو زیادہ ترجیح دینے لگا۔ میں نے ماضی میں جو مہلک اور کیمیائی ہتھیار بنائے ان کا تجربہ بھی انسانوں پر کیا جو بہت کامیاب رہا اور میں نے توقع سے کہیں مفید نتائج حاصل کئے۔ پھر میں نے زراعت کے بارے میں سوچنا شروع کیا۔ میں نے انسان کی ہڈیوں کی کھاد بنانے کا سوچا میں نے تیس آدمیوں کی ہڈیوں کی کھاد بنا کر ایک قطعہ زمین میں استعمال کیا۔ اس کے حیرت انگیز نتائج برآمد ہوئے۔ آپ نے جو میرا مہکتا ہوا گلستان دیکھا ہے اس میں انسانی ہڈیوں کی کھاد ہے۔''

ان کے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ جمال نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔ ''سر! آپ مذاق تو نہیں کر رہے ہیں؟''

''نہ میں کسی سے مذاق کرتا ہوں' جھوٹ بولتا ہوں اور نہ کوئی بات چھپاتا ہوں۔'' اس کے لہجے میں ناگواری سی آ گئی۔ جیسے اسے جمال کی بات تلخ لگی ہو۔ ''میں ایک سائنس دان ہوں۔ بہت جلد مجھے نوبل پرائز بھی ملنے والا ہے۔''

''انسان پر اس قسم کے تجربات کرنا کیا اخلاقی جرم نہیں ہے؟'' سپنا نے پوچھا۔

''بنی نوع انسان کے لئے جو کچھ بھی کیا جائے وہ کم ہے۔'' اس نے تیکھے لہجے میں جواب دیا۔ ''آیئے' میں آپ کو دکھاؤں کہ انسانی گوشت کا کیا کرتا ہوں۔''

سپنا اور جمال مضبوط اعصاب کے مالک نہ ہوتے اور یہ باتیں پہلے سے ان کے علم میں نہ ہوتیں تو وہ غش کھا جاتے۔ البتہ یہ انکشاف ان کے لئے نیا تھا کہ اس خبیث نے انسانی ہڈیوں کی کھاد بنا کر تجربہ کیا ہے اور اس کھاد کی بدولت یہ گلستان اس قدر سرسبز و شاداب اور مہکتا ہوا ہے۔ وہ اس لئے حیران اور پریشان تھے کہ ڈاکٹر کریم اپنی بربریت کے بارے میں انہیں کس لئے اس قدر تفصیل سے بتا رہا ہے۔ وہ ایک نامعلوم سا خوف محسوس کر رہے تھے۔ انہیں ایسا لگ رہا تھا کہ وہ ان کے گرد اپنا حصار قائم کر رہا ہے تاکہ وہ یہاں سے نکل کر جانے نہ پائیں۔

ڈاکٹر کریم انہیں اوپر والے ہال میں لے آیا جو نیچے والے ہال کے مقابلے میں بہت بڑا اور بے حد کشادہ بھی تھا۔ اس میں ایک طرف آٹھ دس میزیں تھیں۔ ہر میز کے گرد دو دو کرسیاں تھیں۔ ان میزوں اور کرسیوں کے دائیں جانب دو بہت بڑی بڑی کڑاہیاں تھیں

جو بڑے بڑے لوہے کے اسٹینڈ پر رکھی ہوئی تھیں ایک کڑاہی میں شورے کا تیزاب تھا اور دوسرے میں گندھک کا' بائیں جانب ایک قطار میں چار لوہے کے مضبوط پنجرے تھے۔ ان میں دو پنجرے ایسے تھے جن میں لوہے کی بہت ہی مضبوط جالیاں لگی ہوئی تھیں۔ ان کے درمیان اتنا فاصلہ تھا کہ ایک انگلی بھی اندر نہیں جا سکتی تھی۔ اس ایک پنجرے میں کوئی تیس بتیس بلی کی جسامت کے چوہے بند تھے۔ وہ بڑے خوفناک اور خونخوار لگ رہے تھے۔ بھوک سے بے تاب ہو کر بلبلا رہے تھے۔ دوسرے پنجرے میں تین چار بڑے بڑے اژدہے تھے۔ تیسرے پنجرے میں کوئی تیس کے قریب شکاری کتے تھے جو انہیں دیکھتے ہی غرانے اور بھونکنے لگے تھے۔ چوتھا پنجرا خرگوشوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس ہال میں بڑی صفائی تھی اور چاروں طرف جیسے اسپرے کیا ہوا تھا۔ اس لئے ہال خوشبو سے مہک رہا تھا۔

''کیا یہ چوہے اور کتے بھی تجربے کے لئے ہیں؟'' سپنا ان کتوں اور چوہوں کو دیکھ کر سہمی سی جا رہی تھی۔

''جی ہاں!'' ڈاکٹر کریم نے عجیب سے لہجے میں جواب دیا۔ ''یہ چوہے اور کتے آدم خور ہو چکے ہیں بلکہ میں نے اپنے تجربے سے آدم خور بنا دیا ہے۔ انہیں انسانی گوشت بہت مرغوب ہے۔ یہ انسانوں کے مقابلے میں جانوروں کا گوشت اب رغبت سے نہیں کھاتے ہیں۔''

''کیا مطلب؟'' جمال دہشت زدہ سا ہو گیا۔ ''آپ ان جانوروں کو انسانوں کا گوشت کھلاتے ہیں؟''

''اس کے سوا چارہ بھی تو نہیں ہے۔'' وہ معنی خیز انداز سے زیر لب مسکرایا۔ ''میں کیا کروں مسٹر جمال! بازار میں جانوروں کا گوشت کس قدر مہنگا ہے اس کا آپ کو اندازہ ہو گا۔ ویسے دنیا میں انسان سے زیادہ لذیذ گوشت کسی کا نہیں ہوتا ہے۔ میں سب سے پہلے تو یہ کرتا ہوں کہ اپنے دشمنوں کو ان کے آگے ڈال دیتا ہوں۔ دشمن نہیں ملا تو پھر قیدیوں کی باری آتی ہے مجھے ہڈیوں کی ضرورت پڑتی رہتی ہے کھاد بنانے کے لئے' ان جانوروں کو گوشت کی ضرورت بھی ہوتی ہے۔ بعض اوقات میں چوہوں کو کتوں کے پنجرے میں پھر ایک کتے کو چوہوں کے پنجرے میں چھوڑ دیتا ہوں۔ ان کے پنجروں میں جانور ہو یا انسان' بڑا دلچسپ اور سنسنی خیز کھیل دیکھنے کو ملتا ہے۔ ایک ایک لمحہ پر کیف بن جاتا ہے۔ جب چوہے اور کتے انسانوں کو چیر پھاڑ کے کھاتے ہیں جب ان آدمیوں کو اژدہے ڈستے ہیں تب

انسانی چیخ و پکار سے فضا میں ایسا سنگیت گونجتا ہے کہ اسے الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا ہے اور پھر یہ نظارہ بھی بڑا دل فریب ہوتا ہے جب آدمیوں کو گندھک اور شورے کے تیزاب کی کڑاہیوں میں ڈال دیا جاتا ہے۔ ان کے جسم اتنی تیزی اور اتنی آسانی سے حل ہو جاتے ہیں کہ آدمی بس دیکھتا رہ جاتا ہے۔ کیا آپ یہ کھیل تماشہ اور نظارے دیکھنا پسند فرمائیں گے؟"

سپنا کے جسم پر لرزہ طاری ہو گیا اور جمال کی رگوں میں لہو منجمد ہونے لگا۔ اس نے بمشکل تمام کہا۔ "اب ہمیں اجازت دیں۔"

"میں نے آپ کو ڈنر پر بھی مدعو کیا ہوا ہے۔" ڈاکٹر کریم بولا۔ "میں اس کے بغیر آپ کو جانے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ پلیز!"

"ہمیں بہت دیر ہو رہی ہے۔" سپنا بولی۔

"میں نے آج ہی اپنے بہت ہی قریب اور عزیز دوستوں کو کھانے پر مدعو کیا ہوا ہے۔" ڈاکٹر کریم نے ہنس کر کہا۔ "وہ سال میں دو مرتبہ دلچسپ کھیل دیکھنے حاضر ہو جاتے ہیں۔ اتفاق سے آج آپ بھی آ گئے ہیں۔ آپ یہ کھیل دیکھ کر اور کھانا کھا کر ہی جائیں گے۔"

"ہم میں اتنی ہمت اور قوت برداشت نہیں ہے کہ وحشیانہ اور انسانیت سوز کھیل دیکھ سکیں۔" سپنا حوصلہ کر کے بولی۔

"اگر ایسی بات تھی تو آپ نے یہاں آنے کی جرأت کس لئے کی؟" ڈاکٹر کریم کا لہجہ ایک دم بدل گیا۔ "مجھے یہ بھی پوچھنا ہے کہ آپ کو یہاں کس نے اور کس مقصد کے تحت بھیجا ہے؟ آپ اصل میں ہیں کون؟"

"ہم روزنامہ آفاق کی جانب سے آپ کا انٹرویو کرنے آئے ہیں۔" جمال نے جواب دیا۔ "آپ کو یقین نہ ہو تو آپ دفتر ٹیلیفون کر کے دریافت کر لیں۔"

"یہ جھوٹ ہے۔" ڈاکٹر کریم بگڑ گیا۔ "جس وقت آپ دونوں آئے تھے میں نے معلوم کر لیا تھا۔ انہوں نے اپنا کوئی نمائندہ نہیں بھیجا ہے۔ کوئی سازش اور چال ہے۔ آپ لوگ نہ بتائیں، نہ سہی۔ ابھی آپ ہی آپ معلوم ہوا جاتا ہے۔"

سپنا نے کچھ کہنا چاہا لیکن اس کی آواز سینے میں گھٹ کر رہ گئی۔ اس کی زبان سے ایک لفظ بھی نہیں نکل سکا۔ اپنا راز دشمن پر آشکارا ہونے پر اس پر سکتہ سا چھا گیا تھا۔ اس کی جو کیفیت تھی وہی جمال کی بھی تھی۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کریں۔ اب یہاں سے

نکلنے کی کوئی راہ اور بہانہ بھی نہیں سوجھ رہا تھا۔ جمال کے ذہن میں ایک خیال بجلی کی سی تیزی سے آیا کہ کیوں نہ وہ اس خبیث کو پستول کی زد میں لے کر یہاں سے نکلنے کی کوشش کریں۔ س شیطان کو قابو میں کرنے سے سب کچھ قابو میں آ سکتا تھا۔ یہی ایک تدبیر جس سے وہ س جہنم سے نجات پا سکتے تھے۔ مگر اسے اپنی تدبیر پر عمل کرنے میں تاخیر ہو چکی تھی۔ اس ہال یں دائیں جانب جو سات داخلی دروازے تھے ان میں سے ایک دروازہ کھلا اس دروازے سے چھ افراد داخل ہوئے جو اپنی وضع قطع اور چہرے مہرے سے امیر کبیر پر وقار اور وجیہہ لگ رہے تھے۔ سپنا اور جمال نے انہیں دیکھتے ہی پہچان لیا تھا۔ یہ چھ شیطان تھے۔ وقار حسین نے ان کی تصویریں دکھا کر ان کی شناخت کرا دی تھی۔ ان کے پیچھے کوئی نہ تھا۔ ڈاکٹر کریم ن کی طرف متوجہ ہوا تو سپنا نے جمال سے سرگوشی کی۔ ''تم اپنے پستول سے انہیں شوٹ کر دو...... میں اپنے چاقو سے ایک دو شیطانوں سے نمٹ لیتی ہوں۔''

''پہرہ داروں سے کون نمٹے گا۔'' جمال نے بڑی آہستگی سے کہا۔ ''وہ ہمیں گولیوں سے بھون کر رکھ دیں گے۔''

''ایک صورت اور ہے۔'' سپنا بولی۔ ''میں ڈاکٹر کریم کے پاس جا کر اسے چاقو کے زور پر قابو میں کرتی ہوں تم......'' سپنا کا جملہ ادھورا رہ گیا۔

ہال کا صدر دروازہ کھلا' چار پانچ پہرہ دار نمودار ہوئے۔ وہ چھ سات قیدیوں کو بالوں سے پکڑ کے گھسیٹتے' لاتوں اور جوتوں سے بے رحمی سے مارتے ہوئے اندر داخل ہو رہے تھے۔ قیدی درد اور تکلیف سے بلبلا کر چیخ رہے تھے۔ نیم جان ہو رہے تھے۔ اب وہ کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ اس لئے کہ ڈاکٹر کریم ان کی طرف تیزی سے بڑھ گیا تھا۔ اس کے ساتھی شیطان اپنی اپنی نشستیں سنبھال چکے تھے اور ان قیدیوں کی طرف دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔

باہر سے ایک مسلح پہرہ دار تیزی سے دوڑتا ہوا اندر داخل ہوا۔ وہ ڈاکٹر کریم کے پاس پہنچ کر رکا۔ پھر اس نے سرگوشی کے انداز میں اس شیطان سے کہا تو اس کے چہرے پر گہرا استعجاب چھا گیا۔ پھر اس کا چہرہ خوشی سے دمک اٹھا۔ اس کی آنکھوں میں جیسے ہزاروں طاقتور برقی قمقمے جل اٹھے۔ وہ اپنے ساتھیوں کی طرف گھوم کر بولا۔ ''آج آپ لوگوں کے لئے میری طرف سے ایک بہت بڑا سرپرائز ہے۔''

''کیسا سرپرائز؟'' گورنر نے چونک کر حیرت سے پوچھا۔

''چند منٹ صبر کریں میرے عزیز ساتھیو!'' اس نے سرشاری کے لہجے میں جواب

دیا۔ ''یہ ایسا سرپرائز ہے جس سے آپ تمام کوایک بڑے کرب اور عذاب سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نجات مل جائے گی۔ آپ اس کے بارے میں تصور تک نہیں کر سکتے ہیں۔''

چند لمحوں کے بعد ہال کے صدر دروازے پر وقار حسین اور رقیہ خانم اس طرح سے نمودار ہوئے کہ ان کے دونوں ہاتھ پیچھے بندھے ہوئے تھے۔ ان کے پیچھے کوبرا تھا۔ اس کے ہاتھ میں امریکی ساخت کی جدید ترین اسٹین گن تھی جس میں گولیوں کا میگزین لگا ہوا تھا۔ سپنا کو غش آ گیا جمال اسے نہیں سنبھالتا تو وہ تیورا کر فرش پر گر پڑتی۔ جمال بھونچکا سا ہو گیا تھا۔ یہ دونوں اس کے ہاتھ کیسے لگ گئے؟ انسپکٹر رشید چودھری کہاں ہے؟

''یہ رہا سرپرائز دوستو!'' ڈاکٹر کریم خوشی سے پھولا نہیں سما رہا تھا۔

''یہ مرد ہے کون؟ یہ عورت کون ہے؟'' بابر علی نے دریافت کیا۔

''پرانا نمک حرام اور ہمارے تین ساتھیوں اور کئی کارکنوں کا قاتل وقار حسین ہے۔ یہ اس کی بیوی رقیہ خانم ہے۔ اس وقت دونوں بہروپ میں ہیں کوبرا! ذرا ان کے اصلی چہرے تو دکھاؤ تاکہ ہمارے ساتھیوں کو یقین آ جائے۔''

کوبرا نے سامنے آ کر منٹوں میں باری باری دونوں کے سروں سے بالوں کی وگ نکال کر پھینک دی اور سارا میک اپ اتار دیا۔ اب وہ دونوں اصلی چہروں کے سامنے تھے۔ وقار حسین کو دیکھ کر ان سب نے حیرت اور خوشی کا اظہار کیا وہ خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے۔ گورنر نے تھوڑی دیر کے بعد ڈاکٹر کریم سے پوچھا۔ ''یہ لڑکا اور لڑکی کون ہیں؟ لڑکا تو کیمرہ مین لگ رہا ہے۔''

''یہ شاید وقار حسین کے مہرے ہیں جو اس نے مجھے شکار کرنے کے لئے بھیجے تھے۔'' ڈاکٹر کریم بولا۔ ''یہ ابھی اگل دیں گے کہ یہ کس کے مہرے ہیں۔''

''یہ جو بھی ہیں انہیں معاف کرنا بے وقوفی ہو گی۔'' گورنر سفاک لہجے میں بولا۔ ''میرا خیال ہے کہ جلد سے جلد اس دلچسپ اور سنسنی خیز کھیل کا آغاز ہونا چاہیے۔ پہلے کس پنجرے میں کسے ڈالنا چاہیے یہ فیصلہ بابر علی کریں گے۔''

''وقار حسین کو چوہوں کے پنجرے میں ڈال دیا جائے۔'' بابر علی نے بڑی بے رحمی سے کہا۔ ''اس نے جس بیدردی سے ہمارے ساتھیوں کو قتل کیا ہے اس کی سزا یہی ہے۔ رقیہ بیگم اور اس لڑکی کو اژدہے کے پنجرے میں، اس لڑکے کو کتوں کے پنجرے میں۔''

''خبیث، سور، کمینے، ذلیل انسان۔'' وقار حسین ہذیانی لہجے میں چیخ کر بولا۔

''تمہارا مجرم میں ہوں۔ تم ان معصوموں کو سزا کیوں دے رہے ہو؟''
''اپنی زبان بند کرو۔'' بابر علی برہمی سے بولا۔ ''یہ سب تمہارے ساتھی ہیں انہیں سزا ضرور ملے گی۔''
''کوبرا!'' ڈاکٹر کریم نے تحکم آمیز لہجے میں کہا۔ ''نیک کام میں دیر نہیں ہونا چاہیے۔ جلدی سے ان پنجروں کے تالے کھول دو۔''
کوبرا اپنی جیب سے چابیوں کا گچھا نکال کر پنجروں کی طرف بڑھا۔ اس نے تینوں پنجروں کے تالے کھول کر نکالے اور فرش پر پھینک دیئے۔ چابیوں کا گچھا جیب میں رکھ کر وہ وقار حسین کی طرف بڑھا تو سپنا نے سوچا۔ انسپکٹر رشید چودھری اور وہ تینوں سپاہی کہاں رہ گئے۔ وہ اور جمال اس پوزیشن میں نہیں تھے کہ کوئی کارروائی کر سکیں۔ تمام پہرہ دار اس وقت ہال میں موجود تھے۔ وہ سوچ رہی تھی کہ انسپکٹر رشید چودھری جیمز بانڈ کی طرح آخری لمحے آن ٹپکے گا۔
کوبرا' وقار حسین کے سامنے جا کھڑا ہوا اور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سفاک لہجے میں بولا۔ ''اب کیا کہتے ہو وقار حسین؟''
''میں تم سے اپنی زندگی اور اپنی بیوی کی زندگی کی بھیک نہیں مانگوں گا۔'' وقار حسین نے جواب دیا۔ ''لیکن ایک باپ کی حیثیت سے اپنی بیٹی کی زندگی کی بھیک ضرور مانگوں گا۔ آخر تم بھی کبھی ایک باپ تھے۔''
''تمہاری بیٹی؟'' کوبرا حیرت سے بولا۔ ''تم جھوٹ بول رہے ہو۔ تمہاری کوئی بیٹی نہیں تھی۔''
''یہ لڑکی میری بیٹی سپنا ہے اور یہ لڑکا اس کا شوہر جمال ہے۔'' وقار حسین نے ان کی طرف اشارہ کیا۔ ''یہ ایک راز ہے کوبرا! مجھے بیس برس کے بعد پتا چلا کہ میری ایک بیٹی ہے۔ اسے میں نے جی بھر کے دیکھا اور پیار بھی نہیں کیا۔ تم بس اسے زندہ رہنے دو۔''
''یہ تمہاری بیٹی ہے؟'' کوبرا بھونچکا رہ گیا۔ اس نے پلٹ کر سپنا کی طرف دیکھا۔ اس کی حسین آنکھوں میں موتی بھرے تھے۔ اس لمحے اسے ایسا لگا جیسے یہ اس کی بیٹی سپنا ہے۔ جس وقت اس کی بیٹی نے اس کے بازوؤں میں دم توڑا تھا تب اس کی آنکھوں میں بھی تو ایسے موتی بھرے تھے۔
''کیا یہ تمہاری بیٹی سپنا کی طرح نہیں ہے کوبرا؟ کیا میں نے تمہاری بیٹی کو اپنی گود

میں نہیں کھلایا تھا؟ اور تم میری بیٹی کو موت کی گود میں ڈال رہے ہو؟''

''تم دونوں آپس میں کیا بکواس کر رہے ہو؟'' ڈاکٹر کریم کرخت لہجے میں بولا۔

''کوبرا جلدی کرو۔ دیر کس لئے کر رہے ہو؟''

کوبرا بڑی آہستگی، سکون و اطمینان سے گھوما۔ اس نے ان تمام پہرہ داروں کو ایک جگہ کھڑے دیکھا تو اس نے ان سب کو اپنی اسٹین گن کی زد میں لے لیا۔ پھر وہ تحکم آمیز لہجے میں گرجا۔ ''تم سب اپنی اپنی بندوقیں پھینک دو۔ ورنہ ایک ایک کو بھون دوں گا۔''

ان سب نے اپنی بندوقیں پھینک دیں تو وہ دھاڑا۔ ''دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو جاؤ۔''

وہ دیوار کی طرف منہ کرنے لگے تو گورنر نے مشتعل ہو کر کہا۔ ''کوبرا! یہ کیا حماقت ہے؟ تم کیا کر رہے ہو؟''

''میں ان میں سے کسی ایک کو پنجرے میں نہیں ڈالوں گا۔'' اس نے تیز لہجے میں کہا۔ ''وقار حسین نے مجھ پر اور میری بیوی بچی پر اکیس برس پہلے ایک احسان کیا تھا۔ میں آج اس کا بدلہ چکا رہا ہوں۔''

بابر علی دھاڑا۔ ''احمق! یہ یہاں سے زندہ بچ کر نکل گیا تو ہم میں سے کسی کو بخشے گا نہیں۔ تم اپنے پیروں پر کلہاڑی مار رہے ہو۔ ایک ناگ پر بھروسہ کر رہے ہو۔''

آجمال تیزی سے لپک گیا۔ کوبرا نے اشارے سے سپنا کو بلایا۔ جب وہ اس کے پاس آئی تو اس نے اپنی جیب سے ایک چاقو نکال کر بڑھایا۔ ''اس سے تم اپنے ماں باپ کے ہاتھوں کی رسیاں کاٹ دو۔''

جمال دروازے مقفل کر کے آیا اور چابیاں اسے واپس کر دیں۔ وقار حسین نے اس کے پاس آ کر ممنونیت سے کہا۔ ''تمہارا بہت بہت شکریہ دوست!''

''یہ شکریئے اور ان باتوں کا وقت نہیں ہے وقار حسین!'' وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔ ''تمہاری بیٹی نہ ہوتی تو میں تمہیں معاف نہ کرتا نہ تمہارے احسان کا بدلہ چکاتا۔ اب تم سب جلدی سے یہاں سے نکل جاؤ۔ ان قیدیوں کو اور نیچے جو قیدی ہیں انہیں لے جاؤ۔'' اس نے چابیوں میں سے ہال کے صدر دروازے کی چابی نکال کر جیب میں رکھ لی۔ چابیوں کا گچھا اس کی طرف بڑھا دیا۔

''تم بھی ہمارے ساتھ چلو کوبرا!'' وقار حسین بولا۔ ''تمہاری گواہی سے یہ سارے

شیطان پھانسی پر چڑھ جائیں گے۔‘‘

’’نہ میری اور ان کی سزا پھانسی ہے۔‘‘ کوبرا بولا۔ ’’ہماری سزا بھی اسی طرح وحشیانہ اور انسانیت سوز ہونا چاہیے۔ جس طرح ہم نے معصوم اور بے گناہوں کو دی ہے۔ ایسی درندگی، خون ریزی، دہشت گردی اور بربریت کی مثال تاریخ میں نہیں ملے گی۔ میری گواہی سے کچھ نہیں ہوگا۔ وقار حسین! ان کے لئے کوئی قانون نہیں ہے۔ یہ قانون کو اپنی جیب میں لئے پھرتے ہیں۔ انہیں جو عبرت ناک سزا ملنا چاہیے وہ قانون کبھی نہیں دے سکتا ہے۔ صرف قدرت ہی دے سکتی ہے۔ میں خود بھی ان سے بڑا مجرم ہوں میں اپنے آپ کو اور انہیں ایسی سزا دوں گا کوئی تصور نہیں کر سکتا ہے۔ بس اب تم سب یہاں سے جلدی سے نس جاؤ۔ ان قیدیوں اور بندوقوں کو لے جاؤ۔ میں ان شیطانوں کو اس لئے بھی معاف نہیں کر سکتا ہوں کہ یہ مجھے ہرگز معاف نہیں کریں گے۔‘‘

جب سپنا اس کے پاس سے گزرنے لگی تو کوبرا نے اس کے سر پر محبت اور شفقت سے ہاتھ پھیرا۔ اسے گلے سے لگایا۔ اس کا ماتھا چوما، کوبرا کی آنکھوں میں آنسو تھے جیسے وہ اپنی بیٹی کو باپ بن کر رخصت کر رہا ہو۔ اس وقت وہ درندہ صفت بالکل دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ جب وقار حسین سب کو ہال سے لے کر نکل گیا تو کوبرا نے اندر سے دروازہ مقفل کر کے چابی اپنی جیب میں رکھ لی۔

وقار حسین چابی کے سوراخ میں سے ہال کے اندر جھانک کر دیکھنے لگا۔ تمام شیطانوں کے چہرے فق تھے اور وہ اپنی جگہ بے حس و حرکت بیٹھے کوبرا کو دیکھ رہے تھے پہرہ دار ابھی تک دیوار کی طرف منہ کئے کھڑے تھے۔ وقار حسین اور ان شیطانوں کا خیال تھا کہ کوبرا اسٹین گن سے ان تمام کو بھون کر رکھ دے گا۔ وہ ان کے سامنے پہنچ کر رکا تو اس کا چہرہ ہر قسم کے جذبات سے عاری تھا۔ شیطان اس کی منت سماجت کرنے لگے۔ تھوڑی دیر کے بعد کوبرا نے انہیں اسٹین گن سے گولیوں کا میگزین نکال کر ہال کے ایک کمرے میں پھینک دیا اور اپنی اسٹین گن دوسری سمت تمام شیطانوں کے چہرے دمک اٹھے اور انہوں نے سکون و اطمینان کا لمبا سا سانس لیا۔ دوسرے لمحے وہ گھوما، چشم زدن میں اس نے تینوں پنجروں کے دروازے ایک ایک کر کے کھول دیئے۔ اژدہوں، چوہوں اور شکاری کتوں نے پنجروں سے تیزی سے نکلنا شروع کر دیا۔ اس لئے کہ وہ کئی دنوں کے بھوکے تھے۔ پورے ہال میں ایک قیامت اور بھگدڑ سی مچ گئی۔ یہ جانور انہیں اس طرح شکار کرنے لگے جس طرح انہوں نے

انسانوں کو بیس بائیس برس تک کیا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد ہال دل خراش چیخوں سے لرز نے لگا۔ وقار حسین بھونچکا رہ گیا۔ اس نے اپنی زندگی میں کبھی ایسا روح فرسا' ہولناک اور رونگٹے کھڑے کر دینے والا منظر نہیں دیکھا تھا۔ وہ وہاں سے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ یہ منظر دیکھنے کی اس میں تاب نہیں رہی تھی۔

Pakistanipoint
Waqar
Azeem

تھوڑی دیر کے بعد انسپکٹر رشید چودھری اور تینوں سپاہی قید خانے سے آزاد ہو کر دوڑتے ہوئے اوپر آئے۔ کوبرا نے ان تمام کو گرفتار کر کے قید خانے میں ڈال دیا تھا۔ کوبرا نے ان تمام کو کیسے گرفتار کیا یہ ایک معمہ تھا جو حل نہ ہو سکا تھا۔ ان چاروں نے باری باری ہال کے اندر کا منظر دیکھا تو دم بخود رہ گئے۔ انہیں اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ انہیں یقین کرنا پڑا کہ اس کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔ یہ مکافات عمل ہے۔ کتے اور چوہے انسانی گوشت سے اپنا پیٹ بھر رہے تھے۔

وقار حسین نے ڈائنامائٹ مشین کا ہینڈل دبا کر اس جگہ اور آدم خور جانوروں کو ملبے کا ڈھیر بنا دیا۔

(ختم شد)